یادِ شاہد

مرتبہ : مقبول جہانگیر

مکتبۂ اردو ڈائجسٹ — سمن آباد — لاہور

شاہد احمد دہلوی کی شخصیت پر ۳۲ معروف اہلِ قلم کے یادگار مضامین کا مجموعہ

یادِ شاہد

مُرتّبہ

مقبول جہانگیر

مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ۔ سمن آباد۔ لاہور

سرورق ـــــــــ مصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی

ناشر ـــــــــ الطاف حسن قُریشی

طابع ـــــــــ اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز۔ لاہور

باراوّل ـــــــــ اگست ۱۹۶۸ء

تعداد اشاعت ـــــــــ ۲۱۵۰

کتابت ـــــــــ محمد یعقوب ۔ اقبال اختر

قیمت ـــــــــ [redacted] 60/-

ترتیب

درعشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صُبح
درکارِ زندگی صفتِ سنگِ خارا ایم

غالبؔ

"یادِ شاہد"

مقبول جہانگیر

غالباً مئی ۱۹۶۷ء کے دُوسرے ہفتے کا ذکر ہے۔

شاہد صاحب کا ایک مختصر سا مکتوب آیا۔ کارڈ کے بجائے لفافہ ——— تعجب ہُوا کہ اُنھوں نے پُرانی وضع کیوں چھوڑی۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔

مکرمی، سلام مسنُون

عرصہ ہوا ایک مضمُون آپ کے جریدے کے لیے ارسال کیا تھا۔ اس کا عنوان ہے 'نیل کی ملکہ۔ قلوپطرہ'۔ ابھی تک یہ مضمون شائع نہیں ہوا۔ مجھے مضمون چھپوانے کا اتنا شوق نہیں، صِرف فرمائش کی تعمیل کردی تھی۔ اگر چھاپنے کا ارادہ نہ ہو، تو ازراہ کرم واپس کر دیجیے۔ مجھے پیسوں کی آجکل سخت ضرورت ہے۔ اسے کہیں اور بھجوا دوں گا۔

خاکسار

شاہد احمد دہلوی

شاہد صاحب سے اس عالمِ رنگ و بُو میں میری مُلاقات کبھی نہ ہُوئی؛ البتّہ مراسلت کا موقع بارہا مِلا، لیکن وہ بھی مختصر انداز میں ـــــــ گزشتہ تین چار برسوں میں وہ کئی مرتبہ لاہور آئے، لیکن میرا اُن کا آمنا سامنا نہیں ہُوا۔ اب یاد نہیں کہ اُسی روز یا اُس سے اگلے روز دوپہر کو میں نے کراچی فون کیا۔ کوئی خاتون فون پر تھیں۔ میں نے اپنا نام بتایا اور عرض کیا کہ شاہد صاحب کی خدمت میں میرا اسلام پہنچا دیجیے اور یہ بتائیے کہ اُن کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اُنہوں نے مجھے جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ چند لمحے بعد ایک دل موہ لینے والی آواز کان میں آئی:

"السلام علیکم۔ کہیئے مقبول صاحب کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ شاہد صاحب، میں تو آپ کے مزاج پُوچھنے" والا ہوں۔"

ہنس کر بولے: "بھائی، بسترِ مرگ پر پڑا ہوں۔ دُعا کیجیے کہ اللہ مشکل آسان کرے۔"

"شاہد صاحب، ایسی باتیں نہ کیجیے، ابھی ہمیں آپ کی بے حد ضرورت ہے۔"

ذرا رُک کر کہنے لگے: "بھائی، آپ لوگوں کی دعاؤں کے سہارے ہی اب تک جی رہا ہوں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اب جی بھر گیا ہے۔ زیادہ جینے کی ہمّت نہیں رہی۔"

میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ شاہد صاحب اور ایسی مایوسی۔ خدا خیر کرے۔ میں نے گھبرا کر موضوع بدلا۔

"شاہد صاحب، آپ سے کسی طرح مُلاقات ہی نہیں ہوتی۔ وہی غالب والا معاملہ ہے۔ ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو

زور سے ہنسے۔ فرمایا: "ہاں صاحب، معاملہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ کراچی

نہیں آتے ؟"

"قطعی ارادہ ہے انشاء اللہ جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

"ضرور آیئے۔ میرے گھر کا پتہ آپ اشرف صبوحی صاحب سے معلوم کر لیجیے گا۔"

قصّہ یہ تھا کہ ۶۴ء کے وسط میں شاہد صاحب لاہور آئے تھے۔ ایک روز انہوں نے دفتر فون کیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ اِس وقت کہاں ہیں۔ کہنے لگے: "اللہ میاں کے پچھواڑے۔ ماڈل ٹاؤن میں ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ "پتہ بتایئے میں حاضر ہوتا ہوں"۔ فرمایا: "میاں، آپ کو زحمت ہو گی۔ میں خود آتا ہوں آپ کی طرف۔"

میں شام تک انتظار کرتا رہا۔ شاہد صاحب نہ آئے۔ اللہ جانے کیا وجہ ہوئی۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ کراچی جا چکے ہیں۔ اس کے بعد ۶۶ء کے آخر میں آئے۔ مولانا اشرف صبوحی کے ہاں قیام کیا۔ خود مولانا صبوحی نے کہ مجھ پر از حد شفقت اور کرم فرماتے ہیں، ایک روز ذکر کیا کہ شاہد صاحب آئے ہُوئے ہیں۔ شاید ہفتے کا دن تھا۔ میں اتوار کو مولانا اشرف صبوحی کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ معلوم ہوا کہ مولانا اور شاہد صاحب میری تلاش میں سمن آباد گئے ہیں۔ وہاں سے سمن آباد بھاگا، دفتر پہنچا۔ الطاف صاحب دفتر میں تشریف رکھتے تھے۔ کہنے لگے: "شاہد صاحب آئے تھے، خاصی دیر بیٹھ کر ابھی ابھی گئے ہیں۔" میں کفِ افسوس ملتا رہ گیا۔ ایک دو روز بعد شام کو دوبارہ مولانا صبوحی کے ہاں حاضر ہُوا۔ پتہ چلا کہ شاہد صاحب تو کراچی چل دیے۔

ٹیلی فون پر اُن سے اس گفتگو کے چند دن بعد ہی ان کی سناؤنی آگئی۔ یقین نہ آیا کہ شاہد صاحب اتنی جلد اور یوں اچانک چلے جائیں گے۔ پھر خیال آیا وہ پہلے بھی تو اسی طرح کیا کرتے تھے۔ چُپکے سے آتے اور چُپکے سے چلے جاتے۔ نہ آنے کی اطلاع دیتے نہ جانے کی۔

میں نے شاہد صاحب کی شخصیّت پر اُن کی زندگی ہی میں کتاب مُرتّب کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کراچی جا کر سارا منصوبہ اُن کے سامنے رکھوں گا۔ اجازت آسانی سے نہ دیں گے۔ وہ تو ویسے ہی نام و نمود اور شہرت سے چڑنے والے آدمی ہیں۔ اُن کی بے نیازی اور استغنا کے سینکڑوں قصّے سُن چکا تھا؛ تاہم اطمینان تھا کہ میری بات نہ ٹالیں گے، کہہ سُن کر کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لوں گا۔ اُن کی موت کے بعد ہر لمحے یہی خیال آیا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں کراچی جانے کا موقع ملا۔ محترم فضلِ حق قریشی صاحب سے کہ شاہد صاحب کے پُرانے اور انتہائی عزیز دوستوں میں سے ہیں، ملاقاتیں رہیں، اُن سے ذکر کیا۔ اُنھوں نے حوصلہ افزائی کی، خود بھی مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں اللہ کا نام لے کر میں نے کام شروع کر دیا اور اب پانچ ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد یہ مجموعہ، جیسا کچھ بھی ہے اچھّا یا بُرا، آپ کے سامنے ہے۔ مجھے احساس ہے کہ مرحوم کی دلآویز اور محبوب شخصیّت اور اُن کے فن کا اس میں پُوری طرح جائزہ نہیں لیا جا سکا؛ تاہم مستقبل قریب یا بعید میں، جو لوگ تاریخِ ادب اُردو اور تاریخِ ادب دلّی کے سلسلے میں تحقیقی کام کریں گے، وہ اس کتاب میں خاصا قیمتی مواد پائیں گے۔

جن حضرات نے ازراہِ نوازش وقت نکال کر مضامین قلم بند فرمائے ہیں، اُن کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں؟ خصوصاً ادیبِ طنّاز پروفیسر رشید احمد صدیقی اور حضرت قبلہ ملّا واحدی صاحب کا انتہائی ممنونِ احسان ہوں کہ ان بزرگوں نے بے پایاں خلوص اور محبّت کا اظہار کیا اور ناسازیٔ طبع کے باوجود میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تحریریں ہمارے لیے حرزِ جان ہیں۔ وہ شاہد صاحب پر تفصیلی مضمون لکھنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں اُن کا یہ مضمون شامل ہوگا۔

اس کتاب میں اُن کے تین مکاتیب گرامی شامل کر دیے ہیں جو انہوں نے شاہد صاحب کے سلسلے میں اِس عاجز کے نام تحریر فرمائے۔ آخری مکتوب میں رشید صاحب نے شاہد صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں مرحوم کی پوری شخصیت اور کام سمٹ آیا ہے۔

مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی نے اپنے بے پناہ لطف و کرم کا اظہار فرمایا ہے۔ آجکل موصوف علامہ اقبالؒ پر کام کر رہے ہیں اور ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس کے باوجود میری درخواست پر نہ صرف "یادِ شاہد" کا سرورق عطا فرمایا، بلکہ ایک پیارا سا مضمون بھی لکھا۔ ان کے علاوہ حضرتِ احسان دانش، جناب اخلاق احمد دہلوی، جناب محمد طفیل مدیرِ نقوش، سید ولایت حسین خمار دہلوی، سید ولی اشرف صبوحی اور سید وصی اشرف صاحب کا بھی مجھے شکریہ ادا کرنا ہے کہ ان حضرات نے اس کتاب کی ترتیب میں قدم قدم پر رہنمائی فرمائی اور قیمتی مشورے دیے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض حضرات کے مضامین مجھے ابھی تک نہیں مل سکے۔ ان میں سید انصار ناصری، مولانا اشرف صبوحی اور سردار دیوان سنگھ مفتون سرِ فہرست ہیں۔ ان حضرات کے مضامین بھی آئندہ ایڈیشن میں شریک ہوں گے۔

"یادِ شاہد" کے ۳۲ مضامین میں سے چند مطبوعہ ہیں اور اکثر غیر مطبوعہ۔ جناب صادق الخیری اور جناب جمیل جالبی کے مضامین آج سے بارہ تیرہ برس قبل شاہد صاحب کی حیات میں لکھے گئے تھے۔ ان مضامین میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے انہیں اسی انداز سے دیکھا اور پڑھا جائے۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کتاب میں مضامین کی ترتیب بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے مضامین میرے پاس آئے ہیں۔ ازراہِ کرم ان میں تقدیم و تاخیر اور "چھوٹے بڑے" کا خیال نہ رکھا جائے کہ ان صاحب کا مضمون پہلے کیوں ہے اور اُن صاحب کا بعد میں کیوں۔

مقبول جہانگیر
۱۴۔ نیو مارکیٹ۔ سمن آباد۔ لاہور

آں ساقی نماند

مُلّا واحدی

میری اور شاہد احمد دہلوی کی عمروں میں بیس بائیس برس کا تفاوت تھا۔ یہ تفاوت اتنا زیادہ نہیں ہے کہ مجھے تبرک خیال کر کے میرے پاس دو چار منٹ بیٹھنا ضروری ہو جاتا اور یہ تفاوت اتنا کم بھی نہیں ہے کہ وہ ہم نشیں بننے بنانے کی نیت سے میری طرف بڑھتے۔

میں شاہد صاحب اور اُن کے بھائیوں کی شادیوں میں برابر بُلایا گیا، لیکن پھولوں کے سہروں نے کسی کی صورت نہیں دیکھنے دی۔

ساقی نکلا تو ساقی کا میرے ماہ نامے "نظام المشائخ" سے تبادلہ ہوا۔ میں ساقی شوق سے پڑھتا تھا، مگر شاہد صاحب کو دیکھنے کی نوبت ساقی کے اجرا کے بھی کئی سال بعد آئی۔ شاہد صاحب کی اپنی بچی یا بھتیجی کے حلق میں اٹھنی پھنس گئی تھی اور اروِن ہاسپٹل (دِلّی) کے عملے کی غفلت اور لاپروائی سے اُس کی جان جاتی رہی تھی۔ میں دِلّی میونسپل کمیٹی کا ممبر تھا اور دِلّی میونسپل کمیٹی اروِن ہاسپٹل

کو بیس پچیس ہزار روپے سالانہ امداد دیا کرتی تھی۔ شاہد صاحب اپنی بپتا بیان کرنے تشریف لائے تھے۔ مَیں نے میونسپل کمیٹی کے جلسۂ عام میں خاصے زور سے اِس واقعے کا ذکر کیا۔ شاہد صاحب اسے احسان سمجھے اور پھر جب چلتے پھرتے کہیں مِلے تپاک سے اور جُھک کر مِلے۔ گفتگو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں کی۔ شاہد صاحب کی بابت سُنا ہے کہ جس سے بگڑ جاتے تھے اُسے بخشتے نہیں تھے اور جس سے خوش رہتے تھے اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ بہرحال میرے ساتھ دِلّی اور کراچی، دونوں جگہ شاہد صاحب کا برتاؤ اِس قسم کا رہا کہ آخری دَور کی دِلّی وضعداری اور شرافت کا اُس سے بہتر نمونہ نہیں پیش کر سکتی۔

دُوسری بات جو میرے نزدیک اہم اور قابلِ ذکر ہے، وہ شاہد صاحب کی پاکبازی ہے۔ اُن کے دادا شمسُ العلما خان بہادر مولوی نذیر احمد، ایل۔ ایل۔ ڈی اور اُن کے والد مولوی بشیرالدّین احمد لاکھوں روپے کی تصنیفات، لاکھوں روپے کی جائیداد اور لاکھوں روپے نقد شاہد صاحب اور اُن کے بھائیوں کے واسطے چھوڑ گئے تھے، شاہد صاحب اور اُن کے بھائیوں نے دولت کا ناپاک استعمال نہیں کیا۔

شاہد صاحب کو صرف دو شوق ہوتے۔ ایک انشا پردازی اور ادیب نوازی کا، دوسرا موسیقی کا۔ موسیقی میں شاہد صاحب نے اُستادانہ کمال پیدا کر لیا، مگر ڈوم ڈھاریوں میں گھِر جانے کے باوجود پاک بازی اور نیک چلنی پر داغ نہیں لگنے دیا۔

انشا پردازی کے شوق نے اُن سے ماہنامہ ساقی نکلوایا۔ شاہد صاحب خود تو ادیب ابنِ ادیب ابنِ ادیب تھے ہی، اُن کی بابت مشہور ہے کہ ادیب نواز

اور ادیب گر بھی تھے۔ وہ نئے اور پرانے لکھنے والوں کی کھلے دل سے ہمت افزائی کرتے تھے اور نئے اور پرانے لکھنے والوں کو بھر مٹھی معاوضے دیتے تھے۔ اُن کی مہمان داری اور خاطر مدارات پر بے دریغ روپیہ لٹاتے تھے۔ اُن کے ہاں کے لکھنے والوں میں منشی پریم چند، مرزا عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کی زبان سے میرے کانوں تک بھی شاہد صاحب کی مہمان داری، خاطر مدارات اور ادیبوں پر روپیہ لٹانے کے افسانے پہنچے ہیں۔

دِلّی میں وصی اشرف صاحب کی دُکان پر شام کے وقت روزانہ دِلّی کے نوجوان ادیبوں، مسٹر صادق الخیری، مسٹر انصار ناصری، فضل حق قریشی، سیّد یوسف بخاری اور اشرف صبوحی وغیرہ کا اجتماع ہوتا تھا۔ شاہد صاحب اُس اجتماع کے محرّک اور رُوحِ رواں تھے۔ وصی اشرف صاحب شاہد صاحب کے ماموں زاد بھائی اور ولی اشرف صاحب صبوحی کے سگے بھائی ہیں۔

اُردو بازار دِلّی کے مسلمان کتب فروشوں کا بازار تھا اور ہے۔ زیرِ سایہ جامع مسجد۔ اُردو بازار خواجہ حسن نظامی صاحب کا تجویز کردہ نام ہے جسے مَیں نے میونسپل کمیٹی سے منظور کرایا تھا۔ اِس بازار میں مفتی کفایت اللہ صاحب کے داماد مولوی سمیع اللہ صاحب کی دُکان پر آج کل لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ادیب، شاعر، اہلِ صحافت، اہلِ سیاست۔

دِلّی میں شاہد صاحب میرے ہاں فقط ایک بار آئے تھے، کراچی میں تین بار آئے۔ سردار دیوان سنگھ صاحب مفتوں (ایڈیٹر ریاست) کے ذمّے میری کتاب "میرے زمانے کی دِلّی" کا تھوڑا سا روپیہ تھا۔ شاہد صاحب وہ روپیہ دینے بہ نفسِ نفیس آ گئے۔ اخبار ریاست کے پاکستانی خریداروں کے چندے

اُس زمانے میں شاہد صاحب وصول کرتے تھے۔ دوسری دفعہ جمیل جالبی صاحب کو لے کر آئے۔ جمیل جالبی صاحب کو اپنے بزرگ بابائے صحافت میر جالب دہلوی کے بارے میں کچھ پُوچھنا تھا۔ جالب صاحب میرے کرم فرما اور ہم محلّہ تھے۔

تیسری دفعہ شاہد صاحب کراچی ریڈیو اسٹیشن کے دو تین حضرات کے ساتھ صبح کی تقریروں (قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی) میں شرکت کی دعوت دینے آئے۔ میری بصارت خاتمے کے قریب تھی۔ مَیں پہچانا نہیں۔ چلے گئے تو بچّوں نے بتایا کہ شاہد صاحب بھی تھے۔ مَیں نے معذرت کا خط لکھا اور نہ پہچان سکنے اور ریڈیو پر نہ بول سکنے کی مجبوری بالتفصیل ظاہر کی۔ شاہد صاحب میرا خط پڑھ کر رو پڑے۔ شاہد صاحب کا جواب میرے نواسے سیّد اوصاف علی نے بیگم شاہد احمد کی نذر کر دیا ہے۔

اوصاف علی "ساقی" کے مضمون نگار ہیں۔ مضمون نگاری کی ابتدا ہے۔ پاکستان میں لُٹانے کے لائق روپیہ میسّر نہیں تھا، لیکن زبان اور قلم سے نئے لکھنے والوں کی ہمّت بڑھانے کے وصف کا اندازہ اُن خطوط سے براہِ راست بھی ہُوا جو شاہد صاحب نے اوصاف علی کو وقتاً فوقتاً بھیجے تھے۔

آہستہ آہستہ عُمر کا تفاوت گھٹ رہا تھا۔ اسّی سال اور ساٹھ سال کی عُمروں میں ویسا فرق محسوس نہیں ہوتا جیسا چالیس سال اور بیس سال کی عُمروں میں محسوس ہُوا کرتا ہے۔

مَیں نے ریڈیو پر بولنے سے تو انکار کیا تھا، لیکن ساقی میں قریباً ہر مہینے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یوُں ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آ چلے تھے کہ یکایک موت اُنہیں مجھ سے کیا، سب سے چِھین کر دُور لے گئی ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

مگر شاہد صاحب نے اُردو ادب میں ایسا مقام حاصل کر لیا ہے کہ شاہد صاحب مر کر بھی زندہ ہیں اور انشا اللہ مدّتوں زندہ رہیں گے ۔

ایک اچھّا انسان

حکیم محمد سعید دہلوی

شاہد احمد دِلّی والے تھے اور دِلّی کی تمام ادائیں اُن میں تھیں۔ اصل دِلّی والے بڑے بانکے ہوتے ہیں۔ بات کے بڑے پکّے ہوتے ہیں۔ اُصول کے بڑے شیدائی ہوتے ہیں۔ رکھ رکھاؤ کے بڑے شائق ہوتے ہیں۔ احترام کرتے ہیں احترام کراتے ہیں۔ عزّت کرتے ہیں عزّت کراتے ہیں۔ جوشیلے بھی ہوتے ہیں ساتھ ہی ہوشیلے بھی —— کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے خوب غور کر لیتے ہیں اور جب کام کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں، تو اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیتے ہیں۔ مَیں سوچتا ہوں کہ اِن میں سے کون سی بات شاہد احمد میں نہ تھی۔ سب ہی باتیں اُن میں تھیں۔ اوّل بھی تھیں اور آخر دَم تک بھی تھیں۔ دِلّی میں بھی وہ دِلّی والے رہے اور کراچی آکر بھی دِلّی والے ہی رہے۔ کیا مجال کہ جو باتیں دِلّی والوں کو سجتی ہیں، اُن کے سجاؤ میں کراچی میں ذرا فرق آیا ہو۔ شاہد احمد دہلوی اور اُن جیسے لوگوں کو کراچی میں دیکھ کر دِلّی کا مزہ آجاتا ہے۔ نہ سہی وہ جامع مسجد اور اس کی سیڑھیاں، نہ سہی ہرے بھرے

شاہ کا مزار، نہ سہی لال قلعہ، نہ سہی نظام الدّین اور قطب وغیرہ —— ان سب کو یاد کر کے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے، مگر دِلّی والے چند باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی صُحبت میں دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ جُوں جُوں یہ دِلّی والے چھُٹتے جاتے ہیں، اوسان چھُٹے جاتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی اللہ کو کیا پیارے ہوئے، دلّی جیسے ہاتھ سے نکل گئی۔ اُن کے مرنے کا غم ایسا ہی سخت اور ان کی موت کا سانحہ ایسا ہی شدید ہے کہ جیسے دہلیٔ مرحوم کے چھُٹنے کا غم اور سانحۂ عظیم۔

شاہد احمد دہلوی ایک تاریخ ساز شخصیّت تھے۔ گھن گرج والے —— ان کی سب باتوں کو چھوڑیے ایک اُن کے "ساقی" کو لیجیے اور دیکھیے کہ اس کے اثرات کہاں کہاں پہنچے۔ دُنیائے علم وادب میں "ساقی" نے ایک ایسا مقام پیدا کیا اور ایسی ایسی روایات قائم کیں کہ باید و شاید —— نہ معلوم کتنے آج کے لکھنے والے "ساقی" کے رہینِ منّت ہیں۔ نہ جانے کتنوں کو "ساقی" نے سرشار کر دیا۔ شاہد احمد دہلوی کی یہی ایک وزنی خدمت ہے کہ تاریخِ ادبِ اُردو جب بھی لکھی جائے گی اور کوئی بھی لکھے گا، وہ شاہد و ساقی کا ذکر نہ کرے اور اُن کو قرار واقعی مقام نہ دے تو یہ تاریخ سچّی نہیں ہو سکتی۔

شاہد احمد دہلوی نے موسیقی میں بھی کمال پیدا کیا۔ ماہرینِ موسیقی کہتے ہیں کہ اُن کا شُمار اُستادانِ فن میں ہو سکتا ہے۔ موسیقی انہوں نے تفریحاً شروع کی۔ خاصے کمال تک جا پہنچے۔ دُکھ یہی ہے کہ آخر میں یہی موسیقی ان کی روزی بن گئی۔ کاش! ایسا نہ ہوتا، مگر وہ موسیقی کے ذریعے کما کما کر "ساقی" کو زندہ رکھے رہے۔ یہ اُن کی ضِد تھی، ورنہ یہ دَور "ساقی" جیسے رسالوں کا کہاں رہا۔ دِلّی والے تھے —— ضدّی —— بات کے پکّے —— زبان کے دھنی —— ہٹیلے۔ اُن کی زندگی

تک "ساقی" زندہ رہا، اب ان کے مرنے کے بعد اُن کی اہلیہ شاہد احمد دہلوی کی اس یادگار کو باقی رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ضرور جانتی ہیں کہ یہ چنے لوہے کے ہیں چبیں نہ چبیں۔ چب گئے تو واہ واہ، نہ چبے تو جہاں شاہد احمد دہلوی چلے گئے، اُن کا "ساقی" بھی چلا جائے۔ وہ بھی غم یہ بھی غم —— ماتم سخت۔

شاہد احمد دہلوی ادیب بھی تھے اور ادیب گر بھی۔ اُنہوں نے بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ لکھوایا۔ بیسیوں کو لکھنا سکھا دیا۔ ادیب بنا دیا۔ ادب کی دُنیا میں جما دیا۔ اِس دَور میں ادب خسارے کا سودا ہے۔ شاہد احمد نے اس سودے کو خوشی سے قبول کیا تھا اور خوش دِلی کے ساتھ آخر تک نبھایا۔ وہ چاہتے تو اپنی خدمات جتا کر پاکستان میں خوش حال زندگی بسر کر سکتے تھے، لیکن اس خوش حالی کے عوض ان کو کچھ قربانی دینا پڑتی۔ اگر یہ قربانی جان و مال کی ہوتی تو وہ ضرور دیتے اور انہوں نے یہ قربانی دی، لیکن ادبی قدروں اور روایات کی قربانی انہیں گوارا نہ تھی جس کی قیمت انہیں ادا کرنی پڑی۔ ان کے بنائے ہوئے بہت سے آگے بڑھ گئے مالا مال ہو گئے، لیکن شاہد احمد اپنی گرہ سے کھوتے ہی رہے۔ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ حالات نے ان کو نڈھال کر دیا تھا، لیکن ادب کی خدمت میں کمی نہ آنے دی۔ دوستوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ دوست نما لوگوں نے نقصان پہنچایا، لیکن نہ ان کی وضع داری میں فرق آیا اور نہ ادب سے انہوں نے اپنا تعلّق توڑا۔ پاکستان کی زندگی عسرِ معاش میں کٹی۔ صحت نے ساتھ نہ دیا، لیکن انہوں نے ہمّت کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ ہنستے ہوئے مشکلات کا مقابلہ کیا۔ کبھی اپنا دُکھڑا نہ رویا۔ دوستوں کو بھی اپنے حال سے بے خبر رکھا۔ کسی سے مدد نہ مانگی شہرت کی ہَوَس نہ کی۔ محفلوں میں جاتے تو خاموشی سے پچھلی صفوں میں بیٹھ جاتے۔ ہر ایک سے خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے

مِلتے۔ نہ ٹھسّا نہ اکڑ —— منکسر —— بامروّت —— کم آمیز —— کم آزار —— بے نیاز۔

شاہد احمد دِلّی کی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ایک سچّے فن کار —— ایک اچھے انسان ——

شاہد احمد نے خاکے لکھ لکھ کر بہت سوں کو زندہ کر دیا اور خاکہ نگاری کو عروج پر پہنچا دیا۔ اُن کا خاکہ کون لکھّے گا؟

اُردُو کا محسن

عبد الرحمٰن چغتائی

خاندانی وقار سے ہمیشہ معاشرے نے ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں۔ زبان اور روایات کا تسلسل ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہیں ہوُا اور اس کے نتائج ہمارے سامنے اتنے وسیع پیمانے پر موجود ہیں کہ ہم اُردو کو قومی زبان کہہ کر فخر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ غدر کے المناک واقعات غدر کے دَوران اور بعد جہاں تک نظر جاتی ہے، قومی یکجہتی میں بعض شخصیتوں کا اتنا اہم کردار سامنے آتا ہے کہ زبان کے مسئلے کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی ان کی سلامتی، قومی وقار کی سلامتی، تہذیب و تمدّن کی سلامتی، وضع داری کی سلامتی اور اپنی سلامتی قدرِ مشترک معلوم ہوتی ہے۔ مَیں خیال کرتا ہوں، میرا یقین ہے وقت کی ضروریات اور رجحانات نے ایسے ہی خاندانوں کے دامن سے دامنِ مراد بھرا ہے جس کے ایک فرد شاہد احمد دہلوی تھے۔

دہلی کے اکثر فن کار اور دوسرے کئی خاندان بھی دہلی میں رہ کر پنجابی کہلاتے

تھے۔ جب بھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ملاقات کا موقع ہاتھ آیا تو یہ جذبہ ہمیشہ ہی کارفرما رہا اور تفصیل حاصل کرتا رہا کہ وہ دہلی میں رہ کر اُردو بولتے ہوئے وہاں کے رسم و رواج اور لباس تک کو اپنائے ہوتے اپنے آپ کو پنجابی کہنے پر فخر کیوں محسوس کرتے ہیں۔ آج جب مُلک کی تقسیم سے جو واقعات رونما ہوئے ہیں اور جن کا کبھی تصوّر بھی نہ تھا کہ تاریخ میں ایسا وقت بھی آئے گا کہ یہ دہلوی، یہ دہلی میں بسنے والے، یہ زبان داں طبقہ پاکستان کی سرزمین پر آباد ہوگا۔ اُن پنجابیوں کی طرح جو دہلی میں رہ کر پنجابی اور لاہوری کہلاتے تھے، اب پنجاب کی سرزمین پر دہلی کے لوگ آباد ہو کر دہلوی کہلاتے رہیں گے۔ اپنے آپ کو دہلوی لکھتے رہیں گے اور اُردو زبان کی ترقّی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے اور اُردو زبان اس پاک سرزمین پر قومی زبان کہلانے کا حق حاصل کرلے گی۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں ساقی کا اجراء کب ہوا۔ جب بھی ہوا مجھے شاہد احمد صاحب نے ساقی کا سرورق بنانے کے لیے کہا تھا۔ مَیں نے ان کی خوشی پوری کی اور جب وہ مُلک کی تقسیم کے بعد لاہور آئے اور یہاں آباد ہوگئے تب بھی ان کے کہنے کو کبھی نہیں موڑا، مگر جب ساقی کا اجراء عمل میں آیا۔ مَیں نے ان کو ٹوکا تو نہیں، مگر اشارۃً کہا ضرور تھا۔ یہ نام اس رسالے کے لیے موزوں نہیں جو مقصد آپ کے سامنے ہے اُس مقصد کے لیے مناسب نہیں۔

ساقی پر کئی دَور آتے رہے، لیکن محفل گرم رہی۔ اس کی مقبولیت اور مانگ بڑھتی رہی اور آخری دم تک شاہد احمد صاحب کی یہی کوشش رہی کہ ان کا حلقۂ احباب اہلِ محفل اس سے مستفید ہوتے رہیں۔ اس شکل میں بھی جب گرد و غبار اُٹھتے رہے۔ دَم رُکتا رہا، مگر وہ جنوں جو شاہد احمد دہلوی کو اپنے اعتماد پر تھا

کسی نہ کسی بہانے محفل کو گرمانے میں سرگرم عمل رہا۔ محفل کی ہما ہمی قائم رہی ساقی اپنے مقصد کو لیے معاشرے میں تہذیب و تمدن کا علمبردار رہا۔ شاہد صاحب کی رفتار، گفتار، طرزِ زندگی میں تصنع نام کو نہ تھا۔ مشرقی انداز، معاشرتی وضعداری، دوستی، دوستی کے رشتے، خود اعتمادی اور اس کے پہلو بہ پہلو قدیم دہلوی معاشرت کی جھلکیاں جو ان کا خاندانی ورثہ تھا۔

میری اُن سے پہلی ملاقات اور تقسیم کے بعد آخری ملاقات میاں ایم اسلم مشہور مصنف کے ہاں ہوئی۔ لاہور کے قیام میں اپنی ادبی مصروفیتوں کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ مطمئن نہ تھے۔ جب پتہ چلا تو وہ کراچی جا چکے تھے۔ انہیں فطری طور پر ادب کا بار اُٹھانے اور نئی سے نئی تحریک چلانے کا جنون تھا جس سے نپٹنے کے لیے وہ آخری دَم تک ہمہ تن مصروف رہے اور یہ مصروفیت ہی انہیں مقبول بنانے میں کام آتی رہی۔

یہ ایک حقیقت ہے شاہد احمد دہلوی اور ان کے خاندان کا ہماری قومی زبان کو قومی زبان بنانے میں بڑا حصّہ ہے۔ یہ چند خاندان اور منفرد شخصیتیں نہ ہوتیں تو نہ اُردو زبان، زبان بنتی اور نہ قومی زبان کہلاتی۔

شاہد احمد کے دادا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کا نام آتے ہی یوں لگتا ہے کہ سرسیّد نے ضابطہ دیوانی کے تحت ایک ضابطہ حیات تیار کیا تھا تاکہ قومی بیداری محض چند لوگوں تک محدود نہ رہ جائے۔ یہ زبان اور اس زبان کا والہانہ جذبہ فرد اور افراد میں یکسر پھُوٹ نکلے کونسا مسلمان گھرانا ہوگا جس نے ڈپٹی نذیر احمد کی شہرۂ آفاق تصنیف مراۃ العرُوس سے استفادہ نہ کیا ہوگا۔ ہماری ماؤں، بہو بیٹیوں اور بہنوں کو اخلاقی تربیت دے اور اسلامی روایات کا تسلسل قائم رکھنے میں ان کی خدمات

زندہ تابندہ ہیں۔

اُردو زبان کی اہمیّت اور اس کی موجودہ حیثیّت کے اسباب پیدا کرنے میں سر سیّد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، نوشہ میاں غالب، داغ دہلوی، مولانا شبلی، مولانا سلیمان ندوی، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علیخاں، حضرت سالک، عبدالقادر اور علاّمہ اقبال کو جو رُتبہ حاصل ہے، اُردو کی خدمت میں شاہد احمد بھی شامل ہیں۔

شاہد احمد دہلوی

جمیل جالبی

جب مَیں اُس دکان میں داخل ہُوا تو وہاں ایک نئے صاحب کو بیٹھے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی گہرے کتھئی رنگ کی شیروانی، کھلتا ہُوا سیاہ رنگ، پھیلی ہوئی کھڑی ناک، مُسکراتے ہوئے سنجیدہ ہونٹ، مُنہ میں بیڑی، آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ، ڈاڑھی مونچھ صاف، سر پر جناح کیپ، چہرے پر ایک وقار اور سنجیدگی۔ کوئی بات کرتا تو مُسکرا کر خاکسارانہ انداز میں مختصر سا جواب دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کوئی کچھ اور کہتا تو زور سے ہنس کر ذرا سی دیر میں پھر سنجیدہ ہو جاتے۔ وہ کتابوں کی دُکان تھی۔ بہت سے خریدار آ جا رہے تھے۔ آنے والوں میں سے اکثر ان صاحب سے سلام دُعا کرتے، احترام سے ہاتھ ملاتے۔ خیر صلّا خیر عافیت پُوچھتے۔ کچھ دیر ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ یہ دیکھ کر مَیں نے سوچا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون؟ مَیں نے برابر کھڑے ہوئے ایک صاحب سے پُوچھا جو اُن سے بات چیت کر کے ابھی فارغ ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر جلدی سے بولے ——— "شاہد احمد دہلوی ہیں۔"

یہ نام سنتے ہی میرے جسم میں ایک لہر دوڑ گئی۔ شاہد صاحب کا نام میں نے سینکڑوں بار سُنا اور پڑھا تھا اور اُن سے ملنے کی تمنا ایک زمانہ سے تھی۔ چونکہ دُکان میں بہت سے لوگ کھڑے تھے میری ہمّت نہ ہوئی کہ مَیں اُن سے ہاتھ ملاؤں۔ کچھ دیر الگ کھڑا اُن کو ایک خاص احترام کے ساتھ دیکھتا رہا اور جب مَیں نے یہ محسوس کیا کہ اب لوگ مجھے دیکھنے لگے ہیں، مَیں دُکان سے باہر آگیا۔

شاہد صاحب اُس زمانہ میں ایک عزیز کے ساتھ مارٹن روڈ پر رہتے تھے۔ چھوٹا سا مکان اور اس میں کئی گھبسے، نہ بجلی نہ پانی، ابھی بن رہے تھے۔ ایک دن مَیں ملنے کے ارادے سے چلا۔ بڑی مشکل سے مکان ملا۔ شاہد صاحب ململ کا کُرتہ پہنے، تہمد باندھے پلنگ پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ سُورج غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی نہایت تیزی کے ساتھ اپنا جال بُن رہی تھی۔ مَیں نے کہا:

"شاہد صاحب، مَیں آپ سے ملنے آیا ہوں۔" مُسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ کہا "آئیے یہیں بیٹھ جائیے۔" اندر سے لیمپ منگوایا جو کراچی کی تیز ہوا کے جھونکے سے فوراً ہی بُجھ گیا۔ پھر لالٹین منگوائی جو کچھ دیر تو ٹھیک جلتی رہی اور پھر ایک دم بھڑکنے لگی۔ اتنے میں کوئی بچّہ اسے اندر اُٹھا کر لے گیا۔ اسی اندھیرے میں اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ دُنیا زمانے کی باتیں، فساد کے قصّے، دلّی کا ذکر اور نہ جانے کیا کیا۔ کہنے لگے "بہت سوں کو تو ابھی معلوم بھی نہیں کہ میں زندہ ہوں۔ کرشن چندر کا خط آیا تھا جس میں میرے انتقال پُر ملال کے بارے میں تعزیتی جلسہ اور قرارداد کا ذکر کیا تھا، مگر مَیں ابھی زندہ ہوں۔ جما جمایا سارا کام بکھر گیا ــــــ دلّی چھُٹ گئی۔ بہار کالونی میں مکان بنوا رہا ہوں۔" مَیں کئی گھنٹے بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اُن کے اخلاق اور خلوص کو دیکھ کر میرا دل بڑھ گیا اور پھر ہمارے تعلقات

اتنی تیزی کے ساتھ بڑھے کہ وہ میرے دُکھ درد میں شریک اور مَیں ان کے دُکھ تکلیف میں ساتھ۔ اُٹھنا بیٹھنا، آنا جانا بڑھ گیا۔ شام کو ہم ساتھ جاتے، چائے پیتے، بے مقصد گھومتے، مَیں نے قدم قدم پر اُن کے خلوص اور محبت کو محسوس کیا۔ شاہد صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جن کی دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

کچھ دن بعد شاہد صاحب نے بہار کالونی کا مکان فروخت کر دیا۔ وہاں کی آب و ہوا خراب تھی۔ تمام دیواروں میں شور اور سیل۔ پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان خرید لیا اور یہیں اُٹھ آئے۔ مَیں نے بھی ایک مکان یہیں خرید لیا تھا۔ جب جی گھبراتا اور کہیں جانے کو جی نہ چاہتا تو مَیں اُن کے ہاں چلا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا، گپّیں لڑاتا اور چلا آتا۔ جی ہلکا ہو جاتا۔ ساری کوفت دُور ہو جاتی۔ اگر مَیں ایک آدھ دن نہ جاتا تو خود آتے اور نہ آنے کی وجہ پُوچھتے۔

فسادات کے بعد کون سی مصیبت تھی جو اُن پر نہ ٹوٹی۔ دوست دشمن ہو گئے، اپنے بیگانے ہو گئے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر دلّی کے پُرانے قلعہ میں آ پڑے کئی دن وہاں رہے۔ مصیبتیں جو سب نے جھیلیں ان سے زیادہ انہوں نے جھیلیں —— زندگی بھر آرام سے گزری تھی۔ مصیبت یا پریشانی کاہے کو دیکھی تھی۔ یہاں کئی دن دُھوپ، بارش، بدبُو اور تعفّن میں چھوٹے بڑے بچّوں کے ساتھ پڑے رہے اور پھر ایک دن مہاجرین کی ٹرین میں بیٹھ کر راستے کی صعُوبتیں اور حملے برداشت کرتے لاہور آ گئے اور جب لاہور میں کچھ نہ ہوا تو کراچی آ پڑے اور اپنا پُرانا مشغلہ پھر سے شروع کر دیا اور وہ پُونجی جو لا سکے تھے اسی پر گنوا دی۔ دلّی کی ساری جائیداد اور کُتب خانہ کچھ کسٹوڈین صاحب کی ستم ظریفی کی نذر ہو گیا اور کچھ خُرد بُرد ہو گیا۔ ساقی آج تک کبھی فائدہ میں نہیں چلا تھا۔ کراچی میں تو کیا چلتا۔ لوگوں کو گھر بار اور

دال روٹی کی پڑی تھی، کتابیں اور رسالے کون پڑھتا۔ تہذیب اور کلچر کی باتیں کون سُنتا۔ شاہد صاحب کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ صدمہ پر صدمہ، بڑا کنبہ، کھانے والے سب اور کمانے والا کوئی نہیں۔ شاہد صاحب اگر ساقی نہ نکالتے اور گانے بجانے کا شوق نہ ہوتا تو شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکتے۔ کچھ ساقی میں مصروف رہے، کچھ گانے بجانے میں۔ بُرے دن گزر گئے، بات پُرانی ہوگئی، غم ہلکا ہوگیا۔

اس عرصے میں سب کچھ ہوا، لیکن شاہد صاحب کی وضع داری میں فرق نہیں آیا۔ اس مصیبت کے زمانے میں نہ اُنہوں نے کسی کی خوشامد کی، نہ کسی سے گِر کر بات کی، نہ کہیں خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ بے وطنی اور غربت میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ کمینے اور شریف کی پہچان ایسے ہی موقع پر ہوتی ہے، لیکن انہوں نے نہ اپنی خُو چھوڑی، نہ وضع بدلی، نہ شبک سر بن کے کسی سے سرگرانی کی وجہ پُوچھی اور یہ بات اُن کے کردار کا وہ جوہر ہے جو گنتی کے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

شاہد صاحب میں سب سے بڑی بات اُن کی سادگی ہے۔ جھُوٹی عزّت ان کو پاس سے بھی چھُو کر نہیں گزری۔ تہمد باندھے چلے آرہے ہیں۔ کھُل کر باتیں کر رہے ہیں۔ نہ کسی کی بُرائی، نہ کسی کی غیبت۔ سب پر فقرے چُست کریں گے۔ سب کا ذکر کریں گے۔ مزا لیں گے، مذاق اُڑائیں گے جس قسم کی صُحبت میں بیٹھیں گے، اس میں گھُل مِل جائیں گے۔ بڈھوں میں بڈھے، جوانوں میں جوان اور بڑوں میں بڑے۔ ہر ایک کے متعلّق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہر ادیب کا ذکر کریں گے۔ اپنی ملاقات کی تفصیل سُنائیں گے۔ لچھّے دار انداز میں گفتگو کریں گے۔ خود بھی ہنسیں گے اور سُننے والوں کو بھی ہنسائیں گے۔ گھنٹوں چہچہے رہے گی۔ اچھّی بُری ہر قسم کی بات کریں گے۔ شاہد صاحب سے باتیں کرتے وقت آدمی سب کچھ بھُول کر ایک الگ دنیا میں کھو جاتا

ہے۔ جہاں خلوص، ہنسی، دل چسپی، ادب اور موسیقی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ادیبوں اور شاعروں کے قصے ہوں گے۔ ان کے بھی جو مر گئے، اُن کے بھی جو جیتے ہیں اور اُن کے بھی جو ابھی اُبھر رہے ہیں۔ ادیبوں کا ذکر آئے گا۔ اُن کی اچھی بُری عادتوں کا ذکر کریں گے۔ چال چلن، اطوار اور حماقتوں پر روشنی ڈالیں گے۔ کھُل کر ان کے لین دین، مروّت، معاملہ، شراب، عورت، شادی بیاہ، عشق اور ہَوَس کا ذکر کریں گے۔ ایک دن مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ دلّی کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجاز بھی تھے۔ مجاز شراب کا رسیا، عورت کا عاشق۔ بات چل نکلی۔ مجاز نے شراب پی پی کر اپنی صحت خراب کر لی تھی۔ شاہد صاحب نے کہا، مجاز، مر جاؤ گے۔ مجاز نے بے ساختہ کہا، شاہد صاحب ؎

موت بھی اس لیے گوارا ہے
موت "آتا" نہیں ہے "آتی" ہے

کہنے لگے حیدر آباد میں جوش سے ملاقات ہوئی۔ جوش شراب پی رہے تھے۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ دَور چل رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے، شاہد صاحب! آپ بھی پیجیے۔ میں نے انکار کیا۔ اُن کا اصرار بڑھا۔ جب اُدھر سے اصرار اور اِدھر سے انکار بڑھا تو جوش اپنے مخصوص انداز میں بولے ؎

"ساقی" کے "مدیر" اور نہیں ہیں مخمور
برعکس نہند نامِ زنگی کافور

ہر ایک سے ملتے ہیں اور کھُل کر ملتے ہیں۔ آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو، لیکن ملیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کے نئے واقف کار نہیں، پُرانے دوست ہیں۔ ایسے موقع پر ہمدردی کی باتیں کریں گے اور مقدور بھر جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو انہی کی وجہ سے پیٹ پال رہے ہیں۔ ان میں ادیب بھی ہیں اور ڈوم ڈھاڑی بھی۔ بات کرتے ہیں چلتی پھرتی گالیاں بھی دیں گے۔ چھیڑ چھاڑ بھی کریں گے، مگر سنجیدگیٔ طبع موجود رہے گی۔ ساقی جب کراچی سے نکلا تو ساقی کے پرانے منشی بھی یہیں کام کرنے لگے۔ ان سے بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے۔ مزے لیتے۔ کام کرتے جاتے، فقرے کستے جاتے۔ ایک دن شاہد صاحب، منشی جی اور میں ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ منشی جی اپنی بیوی سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ بڈھے آدمی ہیں، لیکن اُس کے بُرے سلوک کے ایسے شاکی کہ میں حیرت میں رہ گیا۔ شاہد صاحب بہت دیر تو سُنتے رہے پھر ایک دم بولے "کیوں بھئی! تمہاری "سوتیلی بیوی" ہیں؟" اور پھر ہنسنے لگے۔

مارٹن روڈ پر سرکاری کوارٹر ہیں جو سب کے سب ہم شکل اور یکساں ہیں۔ ایک دن شام کو گھر لوٹ رہے تھے۔ غلطی سے کسی اور مکان میں گھس گئے۔ بلا تکلف اندر کمرے میں گئے۔ شیروانی اُتاری اور کھونٹی پر لٹکانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ کھونٹی وہاں نہ تھی کسی کو آواز دی۔ ایک عورت کمرے میں آئی، غیر مرد کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ جلدی سے شیروانی لیے اور دونوں ہاتھوں سے دستار تھامتے باہر نکلے۔ اندر سے عورتیں چیخنے چلاّنے لگیں۔ انہوں نے معذرت چاہی۔ کہنے لگے "جمیل صاحب! قُربِ قیامت ہے، ہر چیز ہم شکل ہونے لگی ہے" اور پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔

شاہد صاحب ہنستے بڑے مزے سے ہیں۔ پہلے بات کہیں گے مزے لے لے کر، تفصیل کے ساتھ۔ بات کے دوران میں وہ بالکل سنجیدہ رہیں گے۔ سُننے والا مسکراتا رہے گا۔ جب بات ختم ہو جائے گی تو پھر گہری گہری آنکھوں سے دیکھیں گے اور یک لخت زور زور سے ہنسنے لگیں گے۔ پھر ہنسی کا غوطہ لگائیں گے اور پھر ہموار

ہو جائیں گے۔ ان کے ہنسنے کا انداز دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گھنگھور گھٹا میں ابابیل سیدھی اُڑتے اُڑتے بھیگی بھیگی فضا میں غوطہ لگاتی ہے اور پھر سیدھی اُڑنے لگتی ہے ——— پھر غوطہ لگاتی ہے اور سیدھی اُڑنے لگتی ہے۔

شاہد صاحب کو شاعروں سے چڑ ہے۔ چڑ اِن معنی میں نہیں کہ وہ شعر و شاعری کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان معنی میں کہ شاعروں کو سُنانے کا مرض ہوتا ہے اور انہیں سُننے سے اللہ واسطے کا بَیر ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑے کھرے ہیں۔ صاف صاف لحاظ مروّت کو بالائے طاق رکھ کر سختی سے انکار کر دیں گے۔ کہنے لگے:

جمیل صاحب، اگر مَیں ایسا نہ کروں تو میری زندگی عذاب بن جائے۔ مجھے سڑک پر، ہوٹل میں، بسوں میں، گھروں پر، دعوتوں میں ہر جگہ غزلیں سُنانے لگیں ——— دو تین سال پہلے کی بات ہے ایک صاحب لکھنؤ سے آئے۔ طبلہ بجاتے تھے، موسیقی کے سلسلے میں شاہد صاحب کی تعریف سُنی تھی۔ شاہد صاحب سے ملنے آئے۔ 'کند ہم جنس باہم جنس پرواز' کے مصداق پھر روز آنے لگے۔ اپنے طبلے کی بہت ڈینگیں مارتے۔ کئی محفلوں میں انہوں نے طبلہ بجایا۔ شاہد صاحب نے تعریف کی۔ کچھ مروّت سے، کچھ ویسے ہی، عطائی تھے۔ ایک دن گانے بجانے کی ایک محفل میں مُصر ہوئے کہ شاہد صاحب میرے ساتھ گایئے۔ شاہد صاحب راضی ہو گئے۔ ——— لیکن طبلہ بجاتے وقت وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ کسی صورت سے گانے والے پر غالب آجائیں اور شاہد صاحب کو من چہ می سرایم کا احساس ہو جائے۔ شاہد صاحب نے جب یہ دیکھا تو ایسے اُستادانہ انداز سے راگ گایا کہ کچھ دیر بعد طبلہ صاحب عاجز ہو گئے۔ شاہد صاحب نے کہا، میر صاحب! کیا بجا رہے ہیں؟ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔

یہی صاحب ایک دن تشریف لائے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مَیں بھی وہیں بیٹھا تھا۔ سال نامے کی تیاری تھی۔ کاپیاں جوڑی جا رہی تھیں۔ وہ فرمانے لگے، شاہد صاحب! مَیں نے ایک غزل کہی ہے۔ ذرا سُن لیجیے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی ـــــ شاہد صاحب نے انہیں دیکھا۔ آگ ہی تو لگ گئی۔ کہنے لگے، صاحب، مروّت میں ایک دفعہ بُرا کام کرایا جا سکتا ہے مگر غزل نہیں سُنی جا سکتی۔ ایک دفعہ مَیں غزل سُن چکا ہوں۔ اب بار بار تو یہ حرکت نہیں ہو سکتی۔ وہ بے چارے دم بخود رہ گئے۔ کچھ دیر بیٹھے اور پھر چلے گئے، مگر شاہد صاحب کا پیچھا اس پر بھی ان سے آج تک نہیں چھُوٹا۔

ایک دن ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک خط میری طرف بڑھایا۔ بولے پڑھ لیجیے۔ اس میں لکھا تھا "مکرمی، غزل روانہ ہے۔ بڑی محنت اور کاوش سے کہی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے بہت پسند کی ہے۔ براہِ کرم ساقی میں نمایاں طور پر شائع فرما کر ممنون فرمایئے" یہ خط پڑھ کر مَیں نے واپس کیا۔ کہنے لگے: "جمیل صاحب، کیا سالے کو ٹائٹل پیج پر چھاپ دُوں؟"

ایک دن باتوں باتوں میں سرکاری افسروں کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے "یہ سالے ہر وقت اور ہر جگہ افسر ہی رہتے ہیں۔ انسان کبھی نہیں ہوتے۔ ایسے ایسے لائق افسر پڑے ہیں کہ جو جس کام پر لگایا گیا ہے بس وہی کام اسے نہیں آتا" ایک محکمے کے ایک بڑے افسر کا ذکر کرنے لگے۔ وہ طباعت کے نگران تھے۔ ایک صاحب ان کے پاس گئے۔ اُن کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ بڑے مسخرے اور ہنس مُکھ۔ اُن سے کہنے لگے ـــــ صاحب، آپ کی سرکاری طباعت میں لفظوں میں ذرا بھی چمک نہیں ہوتی۔ شاید آپ کتابت کے بعد مسطر پر زیتون کا تیل نہیں پھرواتے؟

یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہی گئی تھی۔ اُنھوں نے فرمایا ــــ "نہیں تو۔" یہی وجہ ہے کہ الفاظ چکنے نہیں ہوتے۔ یہ تو کاتب کا کام تھا کہ وہ کتابت کے بعد سطر پر تیل کا پچارا پھیرے۔" وہ غصّے میں بھر گئے۔ فوراً انچارج کاتب کو بُلایا۔ ڈانٹا اور کہا "عجیب بات ہے کہ آپ اپنے تجربہ کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، لیکن زیتون کا تیل تک سطر پر کتابت کے بعد نہیں پھیرتے۔" کاتب یہ سُن کر سناٹے میں آگیا۔ کہنے لگا "صاحب!" ــــ "صاحب واب کچھ نہیں۔ آئندہ سے خیال رہے۔" کاتب چلا گیا۔ وہ صاحب ہنسنے لگے۔ "یار، مَیں تو مذاق کر رہا تھا۔"

شاہد صاحب چائے کے بہت دھنی ہیں۔ دن میں بیسیوں پیالیاں پی جاتے ہیں۔ اس میں اچھی بُری کی کوئی تخصیص نہیں۔ چائے ہو اور بس۔ مہینہ میں پندرہ سو بیڑیاں پی جاتے ہیں۔ ساقی کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ ایک دن حسبِ معمول بنیان پہنے، تہمد باندھے زمین پر بیٹھے ہوئے پرچہ پیک کر رہے تھے۔ مَیں پہنچ گیا۔ مَیں نے کہا شاہد صاحب، ایسے میں آپ کی تصویر لے لی جائے۔ زور سے ہنسے، کہنے لگے: ہاں اُس کے نیچے لکھ دینا ــــ "پچیس سال ادب کی خدمت کرنے کا حشر۔"

گانے کے رسیا ہیں اور اس فن کے اُستاد۔ ہندوستان و پاکستان میں ایک آدھ ہی شخص ایسا ہوگا جو اس فن سے ایسا واقف ہو جیسے کہ شاہد صاحب ہیں۔ مَیں نے بڑے بڑے خاندانی خانصاحبوں کو ان کے سامنے عقیدت مندانہ طریقے سے بیٹھے دیکھا ہے۔ اُستاد بُندو خاں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ وہ سارنگی بجانے سے پہلے کم از کم تیس چالیس منٹ تک بھری محفل میں سارنگی کے تاروں کو

چلاتے رہتے ہیں۔ سامعین بیٹھے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہر محفل میں اُن کی یہ روش قائم رہتی ہے۔ کس کی مجال کہ کوئی ان سے کچھ کہے۔ اپنے فن کے لاثانی فن کار۔ ناراض ہو جائیں یا رُوٹھ جائیں تو پھر منائے نہ منیں، لیکن مَیں نے دیکھا ہے کہ شاہد صاحب ان کو غصے بھرے لہجے میں ڈانٹ دیتے ہیں۔ یا پھر جل کر اس عرصے میں کسی اور کو گوا دیتے ہیں اور وہ ان کی بات ایسے سُن لیتے ہیں جیسے کوئی ان کے اُستاد یا بزرگ ہوں۔ وہ اس فن پر لکھ بھی ماہرانہ انداز سے لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ گا بھی اُستادانہ طریقے پر لیتے ہیں۔ مَیں نے انہیں بیسیوں دفعہ سُنا۔ ریڈیو پر بھی اور محفلوں میں بھی۔ گانے والے کے جوہر محفل میں کھُلتے ہیں۔ شاہد صاحب جب محفل میں گاتے ہیں تو وہ لوگ بھی جو کلاسیکل موسیقی سے ناواقف ہیں، تال اور سُروں کے زیر و بم اور اُتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک دن میرے ہاں محفل تھی۔ کراچی کے سب مشہور گویے اور سازندے جمع تھے۔ رات کے تین بجے شاہد صاحب کی باری آئی سب نے آنکھیں مَلیں، پہلو بدلے اور اُنہیں سُننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ شاہد صاحب سامنے آئے۔ طبلچی نے طبلہ کھڑکھڑایا، سارنگیہ نے سارنگی کے تار کسے۔ ستاریہ نے ستار کی کھونٹیاں گھمائیں۔ ایک شاگرد نے تان پورہ سنبھالا۔ شاہد صاحب نے گانا شروع کیا۔ تقریباً پون گھنٹہ گاتے۔ ایسا سماں باندھا کہ سب محو ہو گئے۔ محفل کو سانپ سا سُونگھ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی جادُوگر نے ساری محفل کو باندھ دیا ہے۔ ڈھلتی رات، چاروں طرف فضا میں سناٹا، وقت کی راگنی 'مال کوس' گا رہے تھے۔ ترانہ میں "تنانادیم" کی تکرار پر ستاریہ اور سارنگیہ ہاتھ چھوڑ بیٹھے۔ گویا تاروں کی موسیقی سے بہت آگے نکل گیا۔ طبلچی بے قابو ہو کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں رَس

گھل رہا ہے۔

گاتے اُونچی آواز میں ہیں۔ بول بہت یاد ہیں۔ بیسیوں شاگرد ہیں۔ سب اُستاد کہتے ہیں۔ طبلہ، سارنگی اور دوسرے ساز کمرے میں رکھے رہتے ہیں۔ ڈوم ڈھاڑی، عطائی اور خان صاحب سب ان کے فن کا لوہا مانتے ہیں۔ شاہد صاحب کا کہنا ہے کہ فنِ موسیقی کو ہندوؤں نے اپنا لیا، حالاں کہ جتنی خدمات، ایجادیں اور اضافے مسلم فن کاروں نے کیے، دوسری قوم اس کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچتی۔ اس سلسلے میں اِن کے متعدّد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

اُن کی شرافت ضرب المثل ہے۔ پچیّس تیس سال ہو گئے ہیں، لیکن آج تک کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں گئے اور نہ آج تک کسی طوائف کو شاگرد بنایا، اور وہ صرف اس لیے کہ اسی چیز نے اس عظیم فن کو بدنام کر دیا ہے اور شرفاء اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ان کا ایک شاگرد ایک مرتبہ کسی طوائف کے ہاں چلا گیا۔ کچھ آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ابھی بتدی تھا۔ شاہد صاحب کو معلوم ہُوا تو بہت بگڑے۔ کہنے لگے اللہ تعالیٰ نے موسیقی و شراب کو اسی لیے حرام کیا ہے کہ اس میں بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عام آدمی کے پاس ہوتا نہیں ہے۔ اسے ہی دیکھو (اپنے شاگرد کی طرف) کچھ آتا جاتا ہے نہیں سبق دینے لگے ہیں۔ کراچی میں مسلمان، ہندو، پارسی لڑکیاں عام طور پر اسی محفل میں شریک ہوتی ہیں جس میں شاہد صاحب شریک ہوں۔ موسیقی کی وہی محفلیں کامیاب ہوتی ہیں جن کے محرک شاہد صاحب ہوں اور اسی وجہ سے پاکستان میوزک اکاڈمی کے جلسے اور محفلیں کراچی میں سب سے زیادہ شان دار اور کامیاب ہوتی ہیں۔ شاہد صاحب اس اکاڈمی کے بانی اور صدر ہیں۔ ایسی محفلوں میں وہ خاص طور پر اپنے بیوی بچّوں کو ضرور لے

جانتے ہیں۔

آج سے پچّیس تیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ شاہد صاحب ابھی پڑھتے تھے۔ دِلّی میں کوئی گانے کی محفل تھی۔ دِلّی کے مشہور گویّے چاند خاں کے چھوٹے بھائی رمضان خاں بھی اس میں شریک تھے۔ بڑے اور خاندانی گویّوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ شاہد صاحب کی جب باری آئی تو وہ گانے کے لیے سامنے آئے اور "خیال" گانا چاہا۔ رمضان خاں اس پر اَڑ گئے۔ کہنے لگے "خیال" نہیں گا سکتے۔ میاں صاحب زادے غزل گاؤ۔ ان کے خیال میں اُستادوں کی محفل میں نَومشق اور غیر خاندانی گویّے کا 'خیال' گانا ان کی ہتک اور بے عزّتی تھی۔ شاہد صاحب بے چارے اُٹھ آئے۔ ذِلّت کا ایک احساس ان کے سارے وجود پر چھا گیا۔ انہوں نے اس فن کو انتہائی محنت اور کاوش سے حاصل کرنا شروع کیا۔ دن رات کا ریاض، بڑے بڑے گویّوں کی صحبت، اچھّے اُستادوں کی شاگردی۔ چھُپے ہوئے جوہر نکھر آئے اور ایسے چمکے کہ خود اُستادوں کی صف میں شامل ہو گئے اور اب پچّیس تیس سال بعد عید کے چاند ان کے بڑے لڑکے کی شادی تھی۔ ولیمہ کی دعوت کے بعد رات کو گانا بجانا تھا۔ استاد ڈُنڈو خان، رمضان خان، امراؤ خاں، ظہوری، کبیر خان اور دوسرے نامی فن کار جمع تھے کہ ایک نوجوان لڑکا گانے کے لیے آیا اور "خیال" گانا شروع کیا۔ شاہد صاحب جو ایک طرف کھڑے تھے بولے "میاں صاحبزادے 'خیال' مت گاؤ۔ غزل گاؤ" اور اس پر اتنا اصرار بڑھا کہ وہ خیال نہ گا سکا۔ مَیں نے شاہد صاحب کے چہرے کو دیکھا۔ پھر رمضان خان کی طرف دیکھا اور میرا ذہن ماضی کے دُھندلکوں میں کھو گیا۔

شاہد صاحب دِلّی کی دائی ہیں۔ دِلّی کی ہر بات، ہر رسم و رواج، ہر عمارت،

ہر پہلو، ہر شخص سے خوب واقف ہیں۔ دِلّی کا کبابی ہو یا باورچی، کبوتر باز ہو یا قُلفی حلیم والا سب کے متعلق پُوری معلومات رکھتے ہیں۔ جو زندہ ہیں اُن سے دُعا سلام ہے۔ اکثر کہتے ہیں جمیل صاحب، چلو بھئی دِلّی کے کباب کھالیں۔ فلاں کبابی کا لڑکا آگیا ہے۔ دِلّی میں یہ اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اب تو گدّی پر بیٹھتا ہے، لیکن اُس زمانہ میں پنکھا جھلتا تھا۔ دِلّی سے شاہد صاحب کو والہانہ محبّت ہے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد داخلہ کے لیے علی گڑھ گئے۔ ابھی غازی آباد ہی پہنچے تھے کہ دِلّی کی یاد ستانے لگی۔ علی گڑھ پہنچے، پروفیسر ہادی سے مِلے اور دُوسرے دن دِلّی واپس آگئے اور پھر واپس نہ گئے۔ کراچی آکر دِلّی کے بارے میں شاہد صاحب نے بہت سے مضامین لکھے۔ یہ مضمون دِلّی سے متعلق اچھوتے اور مخصوص اسلوب میں ایسی تہذیبی دستاویز ہیں جن کا لکھنا صرف شاہد صاحب ہی کا حصّہ ہے۔ اُن کے پاس معلومات بھی ہیں اور کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی دِلّی کی پیاری اور ٹکسالی زبان بھی۔ ان سب مضامین کو یکجا کر دیا جاتے تو خاصے کی چیز بن جائے۔ یہ سب مضامین دل چسپ، ایسے لطیف اور ایسے پیارے ہیں کہ افسانے کی طرح پڑھے جاتے ہیں۔ دِلّی کی بِپتا، چوک کی بہار، دِلّی کی عید، سترھویں کی سیر شائع ہو کر خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں —— ایسے ہی ان کے ترجمے ہیں۔ وہ اُردو کے ایک بہترین مترجم ہیں۔ انھوں نے سینکڑوں مشہور افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے کیے۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمے نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرنے کی مشق اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ بڑی تیزی سے ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ مسوّدہ میں کہیں کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی، جو مسوّدہ ہوتا ہے وہی مبیّضہ۔ یہ خوبی مجھے بہت کم مترجموں میں نظر آتی ہے۔

ایک دن ترجمہ کر رہے تھے۔ مَیں پہنچ گیا۔ دیکھ کر مُسکرائے، کہنے لگے مزدوری کر رہا ہوں۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ پکّا گانا ہو رہا تھا جب تال سُر کا اُتار چڑھاؤ ہوتا تو اُن کی آنکھ اور سر بھی اسی اُتار چڑھاؤ پر ہلتے۔ مَیں نے کہا: شاہد صاحب، موسیقی کے پس منظر میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ کہنے لگے "نہیں بھئی پلمن ازم کی مشق کر رہا ہوں۔ ایک وقت میں دو کام۔

ہنسی مذاق اُن کی فطرت میں شامل ہے۔ میاں بیوی میں بڑے خوش گوار تعلقات ہیں۔ سب کی موجودگی میں بھابی کا مذاق اُڑاتے رہتے ہیں۔ ان کی ہمّت شکنی کرتے رہتے ہیں۔ پانچ بچّوں کی ماں۔ کوئی بیس سال کے بعد اُنہیں شوق ہوا کہ وہ بی۔اے کا امتحان دیں۔ تیاّری شروع کر دی۔ امتحان قریب تھا۔ میں پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے انگریزی شاعروں کے متعلق کچھ پُوچھنے لگیں۔ شاہد صاحب بولے: جمیل صاحب! اگر یہ پاس ہو گئیں اور انہیں بی۔اے کی سند مل گئی تو میں اپنی سند واپس کر دُوں گا۔

پاکستان بننے کے بعد جب ترقی پسندوں نے واویلا مچائی اور اپنے سے جُدا نظریہ رکھنے والوں کو رجعت پسند اور قدامت پرست قرار دیا تو لاہور کے جلسے میں "ساقی" کے خلاف بھی قرارداد پاس ہوئی۔ ساقی اور ادارۂ ساقی کو رجعت پسند قرار دیا۔ ساقی کو رجعت پسند قرار دینے اور بائیکاٹ کرنے میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں ساقی اور شاہد صاحب کے توسّط یا توسل سے شہرت ملی تھی یا ان کی ادبی حیثیت قائم ہوئی تھی ——— بات کچھ بھی نہ تھی۔ عسکری صاحب بیچارے "جھلکیاں" لکھتے تھے۔ اس میں کھری باتیں کرتے تھے۔ وہ باتیں جوان کے

دماغ میں آتی تھیں واضح طور پر ایمان داری کے بل بوتے پر لکھ دیتے تھے اور وہ اس فکر میں تھے کہ انتشار اور ابر آلود فضا کو چیر کر صاف اور واضح فکر تک پہنچ سکیں۔ اس زد میں ترقّی پسندوں کے محدود نظریات بھی آ گئے۔ ادب میں سطحی سیاست، غلط پالیسی اور پروپاگنڈا کا ذکر بھی آیا۔ ترقّی پسندوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ ساقی مطعون ہوا۔ سب نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ترقّی پسند کس حد تک آمرانہ رویّہ رکھتے ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں اور کس انداز سے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ترقّی پسندوں کو خود اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کے قرارداد پاس کرنے یا کسی رسالہ کا بائیکاٹ کرنے سے رسالہ اشاعت و مقبولیت کے اعتبار سے کس حد تک متاثر ہو سکتا ہے۔ شاہد صاحب کہا کرتے تھے کہ ابھی کچھ دن کی بات ہے سب ڈھنگ پر آ جائیں گے۔ میں تو جب بھی ان کو چھاپنے کو تیار تھا اور اب بھی ہوں۔ ساقی کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور مختلف الخیال قسم کے مضامین اور نظریات پیش کر سکے تاکہ اس تنوّع سے ادب صحیح معنی میں ترقّی کر سکے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایسے مضامین شائع کیے جو خود ادارے کے ایک آدمی —— عسکری صاحب کے خلاف تھے۔ نہ اس پر ان کو اعتراض تھا اور نہ خود عسکری صاحب کو۔ انتظار حسین نے عسکری کے خلاف سخت مضمون لکھا۔ وہ ساقی میں چھپا اور پسند کیا گیا۔ میں نے خود بارہا عسکری صاحب کی مخالفت "باتوں" میں کی۔ ادب (ONE WAY TRAFFIC) تو ہے نہیں کہ جو ایک گروہ یا جماعت پیش کرے وہی صحیح ہو اور جو راستہ اس نے خیالات کی آمد و رفت کا مقرر کر دیا اس کے علاوہ دوسرا راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاہد صاحب کا کہنا تھا کہ ادیب کو کبھی بھی سیاسی یا جماعتی ہرکارہ نہیں بننا چاہیے۔ نتیجہ یہ

ہوُا کہ جب ترقّی پسندوں کے ہوش حواس ٹھکانے آئے تو انہوں نے کراچی میں جلسہ کیا اور اس میں کُھلے بندوں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور وہی راستہ اختیار کیا جس کا پرچار ساقی ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔ ساقی کی یہ پالیسی دوسروں کو کھٹکتی ہو تو کھٹکا کرے، لیکن اس سے ادب کو بہت فائدہ پہنچتا رہا ہے اور ساقی کی اشاعت کا یہی مقصد رہا ہے جسے وہ گزشتہ پچیس سال سے حتّی الوسع پُورا کر رہا ہے، جب ترقّی پسند تحریک کا سلسلہ شروع ہوُا تھا اور یارانِ حاشیہ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تحریک کیا ہوتی ہے اور ترقّی پسندی کس چڑیا کا نام ہے؟ شاہد صاحب نے ہی سب سے پہلے دِلّی میں "انجمن ترقّی پسند مصنّفین" قائم کی تھی۔ جس کے وہ ایک زمانہ تک جنرل سیکرٹری رہے۔ ساقی نے ترقّی پسند ادب کی خوب خوب اشاعت کی۔ ان کی کتابیں شائع کیں۔ اُن کے حوصلے بڑھائے۔ اُن کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ اسے اُن کی جوہر شناسی کہیئے یا ادب کی خدمت کا صحیح و صحّت مند جذبہ۔ کرشن چندر سے شاہد صاحب کہہ رہے تھے، کرشن ناول لکھو میں شائع کروں گا۔ کرشن اُس وقت دِلّی میں تھے۔ انہوں نے کہا شاہد بھائی ایک ہزار روپیہ دے دیجیے۔ کشمیر جا کر لکھوں گا۔ شاہد صاحب نے ایک ہزار روپیہ دے دیا۔ کرشن چندر کشمیر چلے گئے اور وہاں کی صحّت مند آب وہوا میں ایک ناول لکھ لائے جو بعد میں "شکست" کے نام سے شائع ہوُا۔ عصمت نے ساقی ہی میں لکھنا شروع کیا اور یہیں سے عصمت، عصمت بنیں۔ ساقی نے جتنے ادیبوں کو پیدا کیا اور اُبھارا، کسی دُوسرے اُردو رسالے کو یہ فخر حاصل نہیں ہے اور یہ شاہد صاحب اور ساقی کی وہ خدمت ہے جسے اُردو ادب کی تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔

وہ واحد شخص ہیں جو نئے اور پُرانوں سب کو جانتے ہیں۔ دِلّی میں ایک

دُکان تھی ——— کُتب خانۂ علم و ادب ——— یہ ہمیشہ ادیبوں کی بیٹھک اور نشست گاہ رہی ہے۔ وصی اشرف اس کے مالک تھے۔ شام کو یہاں ادیبوں کا جمگھٹا رہتا۔ شعر و شاعری ہوتی، تبادلۂ خیالات ہوتا، اچھی بُری باتیں ہوتیں۔ جو باہر سے دِلّی آتا وہ یہاں آجاتا اور سب سے مِل لیتا۔ سامنے چوک تھا۔ شام ہوئی اور میلہ لگ گیا۔ یہ جگہ دِلّی کے عوامی کلچر کا مرکز تھی۔ کبوتر باز، مُرغ باز، کبابی، قُلفی والے، حلیم والے، کباڑی، کپڑے والے، دہی بڑے اور پھُلکی والے اور پنواڑی ——— کوئی چیز ایسی ہوگی جس کا سودا یہاں نہ ہوتا ہو۔ سامنے اُردو بازار تھا اور یہیں یہ کُتب خانہ۔ ایک دن وصی اشرف نے کہا: شاہد صاحب، اگر آپ ان لوگوں پر لکھ دیں جو کُتب خانے میں آئے اور بیٹھے تو بڑی مزے دار چیز بن سکتی ہے۔ شاہد صاحب نے کہا "آپ فہرست بنا دیجیے، جو رہ جائیں گے مَیں شامل کر لُوں گا۔ فہرست جو بنی تو تین سو سے زیادہ افراد تھے ——— شاہد صاحب کے علاوہ ان ادیبوں پر دُوسرا کُھل کر نہیں لکھ سکتا۔ مَیں بھی چار سال سے سر ہوں۔ مَیں نے یہ بھی کہا کہ ژاں پال سارتر نے بھی ایک طویل سلسلۂ مضامین لکھّا ہے۔ جس میں اُن تمام ادیبوں، فن کاروں، شاعروں کا ذکر کیا ہے جن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ضمنی طور پر ادبی تحریکات، میلانات اور نظریات پر بھی بحث ہوتی چلی گئی ہے۔ میرے زیادہ اصرار پر انہوں نے کچھ لکّھا جو "خریطۂ خیال" کے عنوان سے ساقی میں اور کچھ مختلف عنوانات سے "نقش" "ماہِ نو" وغیرہ میں شائع ہوا۔ اگر وہ اس عنوان سے کچھ لکھیں تو خاصے کی چیز بن جائے۔ اس طرح تیس چالیس سال کے زمانہ کا احاطہ ہو سکتا ہے اور اُردو ادب کے قدیم و جدید رُجحانات پر روشنی بھی پڑ سکتی ہے ——— ایک تو

ذاتی حالات اور پھر شاہد صاحب کا اسلوب ——— واقعی مزا آجائے ———
دیکھیے اللہ میاں شاہد صاحب کو کب نیکی دیتا ہے۔

شاہد صاحب بڑے کاہل ہیں۔ یہ چیز ان کے وجود کا ناگزیر جزو بن کر رہ گئی ہے۔ کہیں آنے جانے سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ پابندیٔ اوقات کا یہ عالم کہ اگر کہیں پانچ بجے جانا ہے تو وہاں سات بجے پہنچیں گے۔ یا پھر اتنی پابندی ہو گی کہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں گے۔ انتظامی صلاحیت بالکل نہیں ہے اور یہ شاید اس وجہ سے ہو کہ طبیعت میں مروّت اور لحاظ حد درجہ ہے۔ کراچی آئے تو مالی اعتبار سے پریشان رہے۔ قدر دانوں نے جب دیکھا تو ریڈیو میں رکھ لیا۔ بڑی قدر کی، معقول مشاہرہ دیا۔ زندگی بھر نوکری کی نہیں تھی۔ نوکری کے لیے کچھ اور خوبیاں چاہییں، وقت کی پابندی ——— مکھن لگانے کی غیر معمولی صلاحیت ——— آنا جانا ——— کھانا پینا ——— اُٹھنا بیٹھنا ——— اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ باتیں ان میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ کچھ ہی دنوں میں وہ لوگ جو قدر دان تھے شاکی ہو گئے اور نوکری کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک دن کہنے لگے ——— جمیل صاحب! پاکستان میں ملازمت اور منافقت شاید ہم معنی الفاظ ہیں۔ واقعی نوکری کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ کہہ کر بیڑی سُلگائی اور زور زور سے کش لگانے لگے۔

ایک دلچسپ واقعہ اور سُنیے۔ جب پاکستان بنا اور یہ لاہور آئے تو لوگوں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ ایک دن ریڈیو پاکستان لاہور میں بیٹھے حسبِ معمول بیڑی پی رہے تھے۔ لاہور ریڈیو والے ان کی خاطر تواضع سے اپنی عقیدت مندی اور احترام کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمدردی، خلوص اور محبت کی باتیں

ہو رہی تھیں۔ ایک خاتون کچھ فاصلہ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ ایک آخر یہ صاحب ہیں کون۔ کسی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔ یہ سنتے ہی چونک پڑیں۔ غالباً دَورانِ خون تیز ہو گیا تھا۔ دماغ پر استعجاب اور عقیدت کا کوندا لپکا۔ وہ پہلو بدلنے لگیں اور بے ساختہ بولیں اگر یہ بیڑی نہ پیتے ہوتے تو میں ان پر ابھی عاشق ہو جاتی۔ کہنے لگے، خدا کا شکر ہے کہ میں کیوپڈ صاحب کی سِتم ظریفیوں سے بال بال بچ گیا اور بیڑی میرا (ORGAN OF DEFENCE) بن گئی۔

شاہد صاحب کو عظیم بیگ چغتائی اور عظیم بیگ چغتائی کو شاہد صاحب سے والہانہ محبت تھی۔ دونوں ایک دُوسرے پر جان چھڑکتے تھے ——————— "نیرنگِ خیال" کے عروج کا زمانہ تھا۔ اُردو دان طبقے میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ عظیم بیگ اسی میں لکھتے تھے۔ جب ان کا مشہور افسانہ "انگوٹھی کی مُصیبت" شائع ہوا تو گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔ اُنہوں نے بھی جو کبھی افسانہ نہیں پڑھتے تھے، بڑے شوق اور اشتیاق سے اسے پڑھا۔ اس افسانے کی اشاعت سے عظیم بیگ کی شہرت ایک دم پھیل گئی۔ شاہد صاحب نے ابھی ساقی نکالا ہی تھا۔ نیا نیا زمانہ تھا۔ مضمون نگار ملتے نہ تھے۔ حجاب امتیاز علی اور فرحتُ اللہ بیگ لکھنے لگے تھے۔ انہیں فکر ہوئی کہ کسی طرح عظیم بیگ کا پتہ معلوم کریں۔ بہت کوشش کی، مگر پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ عرصے بعد ساقی کی ڈاک میں ایک خط آیا۔ یہ عظیم بیگ کا خط تھا ——————— اس میں لکھا تھا کہ میرے پاس سب پرچے آتے ہیں، لیکن ساقی نہیں آتا۔ کیا آپ ایک پرچہ نمونے کے طور پر بھیج سکتے ہیں؟ اس خط کے ساتھ ہی دونوں کے تعلقات اتنے تیزی سے بڑھے کہ دانت کاٹی روٹی

بن گئے۔ عظیم بیگ دِلّی آتے تو شاہد صاحب کے ہاں ٹھیرتے۔ شاہد صاحب عظیم بیگ کے ہاں جاتے تو کئی کئی دن رہتے۔ راتوں باتیں کرتے۔ وہ افسانے لکھتے اور شاہد صاحب کو دے دیتے۔ ایک ہفتہ میں ناول لکھ دیتے۔ شاہد صاحب اسے شائع کرنے کے منصوبے بناتے۔ تپ دق کے مریض تھے۔ دس سال بیمار رہے اسی بیماری میں بہترین افسانے لکھّے۔ دھول دھپّا اور ہنسی مذاق کرتے رہے اور یُوں ہی مر گئے۔ جب ان کے مرنے کی اطّلاع شاہد صاحب کو ملی، تو ایسے روئے کہ اگر کوئی قریبی عزیز بھی مرتا تو نہ روتے۔ کئی روز تک سوگ مناتے رہے۔ اب بھی بیگم چغتائی آتی رہتی ہیں اور شاہد صاحب خلوص کے مارے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ شاید اُن کو دیکھ کر عظیم بیگ یاد آجاتے ہیں۔ دبے زخم اُبھر آتے ہیں۔ پُرانا دوست یاد آ جاتا ہے۔ وہ دوست جو وقت سے پہلے مرگیا۔ جواں مرگ۔

شاہد صاحب ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ دِلّی میں پلے بڑھے۔ بچپن جوانی وہیں گزرا۔ بال سفید ہوئے تو پاکستان آگئے۔ ۱۹۴۷ء سے پیر الٰہی بخش کالونی میں مقیم ہیں۔ یہیں ساقی کا دفتر ہے۔ وضع وہی ہے جو دِلّی میں تھی۔ دِلّی میں سکُون تھا، آسُودگی تھی۔ کراچی میں نہ سکون ہے نہ آسُودگی۔ بڑا کُنبہ ہے۔ پیٹ پالنے کے لیے اپنی ساری صلاحیتّوں کو وضعداری کے ساتھ بروئے کار لاتے ہیں۔ کبھی گا کر کماتے ہیں، کبھی لکھ کر۔ زمانے کی نیرنگیاں ہیں۔ سدا زمانہ ایک سا نہیں رہتا۔ اب وہ ہیں اور ریڈیو پاکستان۔ اگر آپ کبھی ریڈیو پاکستان سے گزریں اور ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے جس کا ایک یا دو بٹن لگے ہوں، سیاہ رنگ ہو، آنکھوں پر چشمہ ہو، بیڑی مُنہ میں ہو، سر پر سیاہ یا گہرے کتھئی رنگ کی جناح کیپ ہو، ذرا دائیں طرف کو جُھکی ہوئی۔ بائیں طرف سے اُٹھی

ہوئی اور وہ شخص کسی کا بازو پکڑے یا کندھے پر ہاتھ رکھے چشمہ سے جھانکتی ہوئی چمک دار آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے، چھوٹی مہری کا پاجامہ پہنے جس کے پائنچے کی مُہری کے ڈورے نکلے ہوں اور ہلکا سا کشیدہ کاری کا جال بنا ہوا نیوکٹ کا جُوتا ہو تو سمجھ لیجیے کہ شاہد احمد دہلوی ہیں —— دِل چسپ انسان، فاضل مُدیر، بہترین مترجم، صاحبِ زبان، دِلّی والے۔

"میں شاہد احمد دہلوی ہوں"

ماہر القادری

میری شاعری اور مضمون نگاری کا آغاز اخباروں سے ہوا اُس کے بعد ماہنامہ "عالمگیر" (لاہور) اور ماہنامہ "پیشوا" (دہلی) میں میرے مضامین شائع ہونے لگے۔ یہ میری ادبی زندگی کا دَورِ مراہقت تھا۔ پھر ۱۹۳۱ء کے بعد ماہنامہ "ساقی" میں میرے کلام اور مضامین کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، تو برسوں یہ رسم اور وضع جاری رہی۔ یہ میرے "بلوغ فکر" کا آغاز تھا ایسا بھی ہوا کہ ایک دوبار میری نظمیں بعض دوسرے پرچوں میں نہ چھپ سکیں۔ مَیں نے "ساقی" میں اشاعت کے لیے بھیجیں تو وہ چھپ گئیں۔ شاہد احمد دہلوی سے یہی مضمون نگاری ذریعہ تعارف تھا۔ مرزا یاس یگانہ لکھنوی کی رباعیوں کے مجموعے —— ترانہ —— پر میرا تقریباً تیس صفحے کا تنقیدی مضمون "ساقی" میں شائع ہوا۔ شاہد صاحب نے میرے کسی مضمون میں کبھی ذرا سا بھی ردّوبدل نہیں فرمایا۔ میں جو کچھ لکھ کر بھیج دیتا وہ لفظ بلفظ اُسی طرح چھپ جاتا اس چیز نے راقم الحروف میں خود اعتمادی پیدا کر دی۔

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے چھ جون مینہ برس رہا تھا اور میں حیدر آباد دکن کے دفتر معتمدی فوج میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک صاحب دفتر کے دروازے سے داخل ہوئے۔ میں انہیں دیکھ کر چونکا، میرے استفسار سے پہلے وہ خود ہی بول اُٹھے:

"میں شاہد احمد دہلوی ہوں۔"

میں تعظیم و خیر مقدم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مصافحہ بلکہ معانقہ ہوا فرمانے لگے:

"میں پہلے نظامت پٹہ (پوسٹ ماسٹر جنرل کے آفس) پہنچا وہاں معلوم ہوا کہ آپ کی اس دفتر میں بدلی ہو گئی ہے۔"

شاہد مرحوم کی اس محبت اور خلوص نوازش نے مجھے بدحواس سا کر دیا تھا کہ وہ اتنی شدید بارش میں مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچے۔ میں نے چپراسی کو اشارہ کیا اور تھوڑی سی دیر میں دو پلیٹ بالائی دو گلچے اور چائے کی دو پیالیاں ہوٹل سے آ گئیں۔ اس تواضع پر میری خاموشی زبانِ حال سے عرض کر رہی تھی ع

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مشہور ادیب سیّد وزیر حسن صاحب کے ہاں شاہد صاحب نے قیام فرمایا۔ بازدید کے لیے میں وہاں گیا۔ یہ اُن سے میری پہلی ملاقات تھی۔ خط و کتابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔ انہوں نے مجھے اور میں نے انہیں سینکڑوں خط لکھے ہوں گے۔

غالباً ۱۹۳۵ء میں اُن کا کرم نامہ آیا جس طرح مشاعروں میں غزل کہنے کے لیے طرحی مصرعے شاعروں کو دیے جاتے ہیں اسی انداز پر شاہد صاحب نے افسانے کا پلاٹ بھیجا اور دعوت دی کہ "آپ اس پر افسانہ لکھیں"! میں نے جواب دیا کہ مجھے افسانہ نگاری کی زیادہ مشق نہیں ہے، آپ نے جن مشاق اور مشہور افسانہ نگاروں کو اس "طرحی افسانہ" کے لیے منتخب کیا ہے، ان میں آپ کی نگاہِ انتخاب اس ہیچمدان پر کس طرح پڑی؟

شاہد احمد مرحوم نے جواب میں لکھا کہ آپ افسانہ لکھ سکتے ہیں، آپ کو افسانہ لکھنا ہوگا؛ چناں چہ ان کی فرمائش اور اصرار پر میں نے افسانہ لکھا اور اُس دَور کے مشاہیر افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ساتھ میرا افسانہ بھی "ساقی" میں شائع ہوا۔

اسی زمانہ (۱۹۳۶ء) کا ایک واقعہ ہے کہ جن دنوں حیدرآباد دکن میں میرا قیام تھا ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنی سائیکل پر چادر گھاٹ کے پُل کے قریب سے گزر رہا تھا۔ حرماں خیرآبادی مرحوم سائیکل کے پیچھے ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے۔ پولیس کے سپاہی نے ایک سائیکل پر دو آدمیوں کو سوار دیکھ کر ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں نے سائیکل روک لی اُس نے کہا کہ تم دونوں کو تھانے چلنا ہوگا۔ میں نے کہا بھئی! جیسی چاہے قسم لے لو، ہمیں اس قانون کی خبر نہ تھی کہ دو آدمیوں کا ایک سائیکل پر سوار ہونا جرم ہے۔ کانسٹیبل نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کو کیا خود راقم الحروف کو اُس وقت مجموعہ تعزیرات کی اس پہلی دفعہ کا کہاں علم تھا کہ (IGNORANCE OF LAW IS NO—

—EXCUSE)

میں نے اور حرماں مرحوم نے سپاہی کی بہت کچھ خوشامد کی، مگر اُس کا دِل کسی طرح نہ پسیجا۔ ہاں! اُس کی مٹھی گرم کر دیتے تو اس مخمصے سے ہمیں نجات مِل جاتی، مگر ہم دونوں شاعر قلاّش تھے، دونوں کی جیبوں میں بہت سے بہت چند آنے ہوں گے۔ خیر صاحب! وہ سپاہی ہم دونوں کو لیے ہوئے چنچل گوڑہ کے پولیس اسٹیشن پہنچا، سب انسپکٹر صاحب کے سامنے ہمیں پیش کیا گیا۔ اُنھوں نے حکم دیا کہ چالان مرتب کیا جائے۔ تھانہ کے دیوان نے ایک چھپا ہوا فارم پُر کیا۔ ہم دونوں کے نام، ولدیت عمر اور پتے لکھے گئے۔ یہ چالان جب امین صاحب پولیس (سب انسپکٹر) کے سامنے لایا گیا، تو وہ چونک کر بولے:

"ایں —— آپ ماہر القادری ہیں ؟"

مَیں نے لجاجت آمیز انداز میں کہا —— "جی ہاں ——"

میرے مُنہ سے "ہاں" سُن کر اُنہوں نے وہ چالان چاک کر دیا۔ اور فرمانے لگے :

"آپ نے آتے ہی اپنا نام کیوں نہیں بتا دیا ؟"

مَیں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا اُنہوں نے گفتگو کا ٹوٹا ہُوا سلسلہ پھر جوڑ دیا، بولے :

"میرا نام مبشّر ہے، مَیں شاہد احمد دہلوی کا بھائی ہوں۔ آپ کے مضامین 'ساقی' میں پڑھتا رہتا ہوں —— اور ——"

شاہد احمد دہلوی اور اُن کے رسالہ 'ساقی' کے اس تعارف نے بڑی کرامت دکھائی، ورنہ اس جرم میں "جرمانہ" دے کر پیچھا چھوٹتا اور سب سے زیادہ پریشانی کی بات عدالت کی حاضری اور پیشی کا معاملہ تھا۔

۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء کے بعد "ساقی" سے قلمی تعلّق قطع سا ہو گیا۔ اس کا سبب خود مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا اور جہاں تک شاہد احمد کی ذات کا تعلّق ہے اُن سے دلّی میں کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی —— مگر ؎

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو۔

پاکستان بننے کے بعد وہ بھی کراچی چلے آئے اور راقم الحروف نے بھی اسی شہر کا رُخ کیا۔ یہاں "انجمن ادبی رسائل" کی بدولت مرحوم سے جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ اب سے چھ، سات سال قبل لاہور میں اس انجمن کا سالانہ اجلاس تھا، اُس میں شریک ہونے کے لیے ہم ممبروں کی پُوری ٹیم نے ریل کے ایک ہی ڈبّے میں سفر

گیا اور ایک ہی ہوٹل میں ٹھیرے۔ اس طرح کئی دن شاہد احمد مرحوم کا ساتھ رہا۔

کراچی کے "ساقی" میں میرے دو تین مضامین اور ایک دو غزلیں شائع ہوئیں "جوش نمبر" کے مضمون کے لیے انہوں نے ٹیلی فون پر خود تقاضا کیا۔ دو چار مہینے کے بعد کسی نہ کسی تقریب میں اُن سے ملنا ہوتا رہتا۔ خاصے تپاک سے ملتے۔ کبھی کبھار ہنسی دل لگی کا کوئی ہلکا پھلکا فقرہ بھی اُن کی زبان سے سُننے میں آتا۔ اُن کی کاٹھی اچھی تھی چہرے سے وہ ساٹھ سال کے نہیں لگتے تھے۔ دل کا دَورہ پڑنے کے بعد وہ اچھے ہو گئے، چلنے پھرنے لگے، مگر ۲۷ اور ۲۸ مئی کی درمیانی شب میں کھانا کھانے کے بعد ریڈیو سنا، پھر وہ گھٹن اور بے آرامی محسوس کرنے لگے۔ اسی دَوران میں کھانسی آئی تھوڑی سی دیر میں حالت غیر ہو گئی ——— اور پھر دُنیوی زندگی کا ڈراپ سین! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

اُن کے دادا ڈپٹی نذیر احمد ریاست حیدر آباد دکن میں صوبیدار تھے اور اخراجات کے معاملے میں بڑے محتاط اور جُزرس۔ انہوں نے بہت کچھ دولت چھوڑی۔ اُن کے بعد اُن کے اکلوتے بیٹے اور شاہد مرحوم کے والد بشیر الدّین احمد برسوں حیدر آباد میں اوّل تعلقدار (کلکٹر) رہے۔ دو پُشتوں کا اندوختہ اور ہزاروں کی سکنی جائداد اس خاندان کو ورثہ میں ملی۔ شاہد صاحب نے دہلی میں بڑی بے فکری کی زندگی گزاری۔ مکانوں کا اتنا کرایہ مِل جاتا تھا جو اُن کے اخراجات کے لیے کافی تھا۔ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے کے باوجود اُن کا خیال تک ملازمت کی طرف نہیں گیا۔ آزادرہ کر زبان و ادب کی خدمت انجام دی۔ کتنے بہت سے مشہور ادیب، افسانہ نگار اور اہلِ قلم ہیں جن کو رسالہ "ساقی" نے چمکایا اور اسی اُفق سے اُن کی شہرت کا آفتاب طلوع ہوا۔

تقسیمِ ہند کے بعد وہ کراچی بڑی بے سروسامانی کے عالم میں آئے۔ یہ اُنھی کی ہمت اور دل گردہ تھا کہ اس قدر ناسازگار حالات میں "ساقی" یہاں سے نکالا اور اس کے ساتھ معیار کو گرنے نہیں دیا۔

شاہد احمد دہلوی مرحوم کو زبان و ادب کے ساتھ موسیقی سے بھی غیر معمولی دلچسپی اور لگاؤ تھا برسوں اس فن میں ریاض کیا۔ جہاں تک خالص فن کا تعلق ہے، راگ راگنی کو اُن کی برابر جاننے والے پاکستان اور ہندوستان میں مشکل ہی سے چند لوگ نکلیں گے۔ یہی فن جو انھوں نے پیشے کے طور پر نہیں، شوقیہ سیکھا تھا، پاکستان میں ان کی روزی کا خاصہ ذریعہ بن گیا ریڈیو پاکستان میں وہ شعبۂ موسیقی کے ہدایت کار تھے چار سو یا پانسو اس کا معاوضہ ملتا تھا۔ تھائی لینڈ میں اُن کو ایک ماہرِ فن کی حیثیت ہی سے بُلایا گیا۔ فنّی معلومات کے ساتھ آواز میں سوز، گلے میں نور اور لہجے میں دل کشی ہوتی تو کیا عجب تھا کہ عبدالکریم خاں اور بڑے غلام علی خاں جیسے نامور موسیقاروں کی صف میں اُن کا شمار ہوتا۔

تقسیمِ ہند سے قبل شاہد احمد مرحوم کے "ترجمے" تو ضرور شائع ہوئے ہیں، مگر اُردو مضامین شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئے ہیں۔ اُن کی انشا پردازی کے جوہر تو پاکستان میں آکر کھلے۔ ان کے قلم سے بڑی جاندار اور باوقار تحریریں نکلی ہیں جن میں زبان کا رچاؤ، محاوروں کی برجستگی، بیان و اظہار کا حُسن اور نفسیات و کردار کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ ان کی ادبی شہرت اور شخصیت سے حکومت پاکستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اُن کو صدر ایوارڈ ملا۔ ڈھائی سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ زندہ رہتے تو اور زیادہ قدر افزائی ہوتی ـــــ مگر وہ ـــــ جسے "بے فکری" اور آسائش کہتے ہیں انھیں میسّر نہ آسکی۔ اتنا مشہور ادیب کراچی کی سڑکوں پر بس کے انتظار میں پہروں کھڑا رہتا۔

ذاتی مکان بنوا لیا تھا مگر وہ بس گزر بسر کے قابل تھا ؟ اُن کا بچپن خاصے ناز و نعم میں بسر ہوا۔ تقسیمِ ہند سے قبل دہلی کی زندگی کا زمانہ بھی خوش حالی اور بے فکری میں گزارا مگر پاکستان آنے کے بعد آذوقۂ حیات کے لیے انہیں خاصی جدّ و جہد کرنا پڑی۔ کثیر العیال بھی تھے، لیکن اُن کی قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ اُن کے عزیزوں اور دوستوں تک کو اُن کے حالات کی خبر نہ ہوتی۔ حالات سازگار ہوتے تو اُن کی بیگم صاحبہ کو کالج میں معلّمی کی مشقّت کا ہے کو اُٹھانی پڑتی۔

شعر کے معاملے میں شاہد احمد دہلوی کا ذوق پکّے راگ سے ملتا جُلتا تھا، اس لیے ساقی، کا حصّۂ نظم، نثر کے مقابلہ میں کم زور رہا۔ لباس خالص مشرقی پہنتے، مَیں نے انہیں کبھی کوٹ پتلون میں نہیں دیکھا، جلسوں میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے نمایاں ہونے اور پیش پیش رہنے کی کوشش نہ کرتے۔ چہرے پر شگفتگی سے زیادہ فکرمندی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ وہ فطرۃً کم آمیز بھی تھے !

ان کے جنازے میں اہلِ قلم اور شاعروں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ سب سوگوار اور غم زدہ تھے، مگر اس کو کیا کیجیے ؎

سحر کاری تری اے عالمِ فانی دیکھی
گھر تک آئے اثرِ گورِ غریباں نہ رہا

اُردُو ادَب کا عاشق

نواب مُشتاق احمد خان

شاہد احمد دہلوی جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے دل میں اک ہُوک سی اُٹھتی ہے، اُن کے بڑے بھائی منذر احمد علی گڑھ میں میرے ہم جماعت تھے۔ جماعت میں ایک جگہ بیٹھتے تھے۔ ہم دونوں ایک دارالاقامہ میں نہیں تھے۔ مَیں ممتاز ہوسٹل میں تھا اور وہ شاید میکڈانل ہوسٹل میں، مگر اسکول میں سارا وقت ساتھ گزرتا تھا۔ منذر ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ مَیں بالکل پھسڈّی تو خیر نہیں تھا، بس یُوں سمجھ لیجیے کہ ایک "اجبی قسم کا طالب علم تھا۔ ان کی محنت و ذہانت کے علاوہ ایک عظیم المرتبت دادا کے پوتے ہونے کی وجہ سے مَیں اُن سے کافی مرعوب تھا۔ منذر کے دادا اور والد کا حیدر آباد سے بھی تعلق رہ چکا تھا، اس لیے اُن میں اور مجھ میں حیدر آباد بھی ایک قدر مشترک تھا۔ جب مَیں علی گڑھ گیا تو شاہد مرحوم بھی وہیں پڑھتے تھے، مگر چُونکہ وہ مجھ سے چھوٹی جماعت میں تھے اور "جونیر" تھے اس لیے علی گڑھ کی روایت کے مطابق نہ تو منذر ہی نے مجھے اُن سے مِلایا اور نہ مَیں نے مِلنے کا اشتیاق کا اظہار کیا۔ عدم تعاون

کی تحریک شروع ہوئی اور مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ ہی میں جامعۂ ملیّہ کے قیام کا اعلان کیا اور قدیم قومی درس گاہ میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر بیشتر والدین نے اپنے لڑکوں کو عارضی طور پر وہاں سے بُلوا لیا۔ غالباً منذر اور شاہد نے بھی اُسی وقت علی گڑھ کو چھوڑ دیا۔ مَیں "غالباً" اس لیے کہہ رہا ہوں کہ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کچھ لڑکے اس تحریک سے کم اور مولانا کی شخصیت سے زیادہ متاثر ہو کر نئی درس گاہ میں چلے گئے۔ مَیں گھر تو نہیں گیا، مگر اس ہنگامے سے بچنے کے لیے عارضی طور پر نقل مکانی کر کے مَیں نے میرٹھ کالج میں پناہ لی۔ بس اُسی وقت سے میرا اور منذر کا ساتھ چھوٹ گیا۔

علی گڑھ کے بعد مَیں تعلیم کے لیے ولایت چلا گیا۔ وہاں سے کئی برس کے بعد جب حیدر آباد واپس آیا تو رسالہ 'ساقی'، سے تعارف ہوا۔ "شاہد احمد دہلوی بی۔ اے (آنرس)" کا نام بطور مُدیر دیکھ کر خیال ہوا کہ ہو نہ ہو یہ منذر کے بھائی شاہد ہیں۔ جب اس کا یقین ہو گیا تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا، کیوں کہ ادب ان کے گھرانے کی لونڈی تھا۔ آخر کس دادا کے پوتے اور کس باپ کے بیٹے تھے۔ "باپ پر پُوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔" مگر یہ "تھوڑا تھوڑا" والی بات نہیں تھی۔ رسالے کی اُٹھان اور اس کا ادبی معیار اُس دَور کے رسالوں میں منفرد اور نمایاں تھا۔ مَیں اس رسالے کو بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ 'ساقی'، نے اُس دَور میں کتنے ادیبوں اور فن کاروں کا کھوج نکالا؟ اُن کی فطری صلاحیتوں کو جلا دی اور اُن کے اظہار کے لیے ایک وسیع میدان مہیّا کر دیا؟ مجھ جیسے شخص کو بھی جسے ادیب یا زبان دان ہونے کا دعویٰ نہیں، اُس وقت احساس تھا کہ شاہد صاحب ادیب ہی نہیں "ادیب گر" ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی نے ایک موقع پر اُنہیں

"شاہدِ نازک خیالاں" کہہ کر واقعی ایک حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔

پھر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ برّاعظم ہند کے مختلف حصّوں کے رہنے والے سب ایک ایسی سرزمین میں جمع ہو گئے جو ہمارے بزرگوں کے سُنہری خوابوں کی تعبیر تھی۔ گم شدہ کڑیاں مِل گئیں۔ پُرانے تعلّقات پھر استوار ہو گئے۔ اسی ریلے میں یہ خاندان بھی ہجرت کر کے پاکستان پہنچا اور حالات نے مجھے بھی حیدرآباد کی سرزمین کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا۔ اُن ہنگامہ خیز حالات میں یہ معلوم کرنا کہ کون کون آیا ہے اور کہاں ہے، بالکل ناممکن تھا۔ ایک دن مَیں کراچی میں پیر الٰہی بخش کالونی میں اپنے ایک عزیز سے ملنے کے لیے گیا۔ دَورانِ گفتگو اُن کے ہمسایوں کا ذکر آیا تو معلوم ہُوا کہ اُن کے ساتھ والے مکان میں شاہد احمد دہلوی رہتے ہیں۔ مَیں نے فوراً اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنے ہمسائے کو میری طرف سے کہلا بھیجیں کہ مجھے ملاقات کا اشتیاق ہے۔ مجھے حاضری کی اجازت دیں یا خود آنے کی زحمت گوارا کریں۔ چند منٹ میں شاہد صاحب تشریف لائے اور جس شان سے آئے، وہ سماں آج بھی آنکھوں میں سمایا ہُوا ہے۔ ایک تو اُن کی مخصوص ادا اور پھر پہلی ملاقات، بھلا اس کو کیسے بھُول سکتا ہوں۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ایسے موسم میں عام طور پر لوگ کُرتے اور پاجامے میں گھومتے پھرتے ہیں۔ شاہد صاحب اچکن اور جناح کیپ میں ملبوس یعنی دہلی اور حیدرآباد کے رہن سہن اور رکھ رکھاؤ کے پُورے لوازمات کے ساتھ تشریف لائے۔ یہ میری اُن سے پہلی باقاعدہ مُلاقات تھی۔ میرا تاثر یہ تھا کہ خاموش اور سنجیدہ طبیعت والا یہ ادیب کسرِ نفسی اور خاکساری کا نمونہ ہے۔ نہ رعونت تھی اور نہ اپنے متعلّق کوئی خوش فہمی —— اپنی ادبی کاوشوں کے بارے میں کوئی بلند آہنگ تو کُجا، معمولی دعویٰ بھی اُن کی گفتگو سے ظاہر نہیں ہُوا۔

مَیں نے حیدر آباد سے اپنا تعلّق بتایا۔ منذر سے اپنے مراسم کا ذکر کیا۔ علی گڑھ میں اپنے "سینیئر" ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ 'ساقی' کے اعلیٰ معیار پر اُن کو مبارکباد دی۔ شاہد صاحب نے یہ سب باتیں بڑے باوقار طریقے سے سُنیں۔ میرے تعریفی کلمات کو میری خوش فہمی قرار دیا اور صرف اتنا کہا: "مَیں نے تھوڑی بہت اُردو ادب کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔" یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔ ابھی تک بدمذاقی اور ادب کی ناقدری کا وہ دَور نہیں آیا تھا جس نے بعد میں ہماری ادبی اور ثقافتی اقدار کا حُلیہ بگاڑ دیا، مگر بایں ہمہ شاہد صاحب کی گفتگو سے مجھے یہ بات صاف نظر آتی تھی کہ وہ ماحول کو سازگار نہیں پاتے اور سمجھتے ہیں کہ ساقی کا زرّیں دَور ختم ہو گیا۔ اگر وہ چاہتے تو "بڑے لوگوں" کا دروازہ کھٹکھٹا کر اپنے لیے کوئی راستہ نکال ہی لیتے، مگر اُن کی طبیعت اس اخلاقی گراوٹ کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ بات یہ ہے کہ ادب نوازی کا دَور گزر چکا تھا یہ درباداری کا زمانہ تھا جس میں شاہد احمد جیسا ادیب جس کی شخصیت عزّتِ نفس کے خمیر سے تیار ہوئی تھی، بالکل اپنے آپ کو بے بس اور مجبور پاتا تھا۔ میرے عزیز نے جس کا مَیں نے اُوپر ذکر کیا ہے، کلاسیکی موسیقی سے شاہد صاحب سے لگاؤ کا ذکر کیا، تو انہوں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی: "بس یُوں سمجھ لیجیے کہ یہ میری بے کاری کا مشغلہ ہے۔" اُس وقت یہ کسے معلوم تھا کہ "بے کاری کا یہ مشغلہ" اس ناقدری کے دَور میں اُن کے لیے نانِ جویں مہیّا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

اُس کے بعد شاہد صاحب سے اُسی جگہ کئی بار مُلاقات ہوئی۔ اُن کی ادبی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات، دہلی اور اُس کے باسیوں پر جو بپتا پڑی اس کے خون کے آنسو رُلانے والے حالات شاہد احمد دہلوی کی شُستہ اور دہلی کی مخصوص زبان میں اُن سے سُنا کرتا تھا۔ میرے عزیز کو تاش کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ جہاں

چند دوستوں کا اجتماع ہوا، تاش کی پارٹی جم جاتی تھی۔ معلوم نہیں شاہد صاحب کو اس کا شوق تھا یا نہیں، مگر مَیں نے یہ ضرور دیکھا کہ جہاں تاش پارٹی جمی وہ میرے ساتھ چائے نوشی شروع کر دیتے تھے۔ چائے کے وہ بہت رسیا تھے۔ مجھے بھی چائے پینے کا خاصا شوق ہے، مگر اُن کی چائے نوشی کے سامنے مَیں دو تین پیالیوں کے بعد ہی ہتھیار ڈال دیتا تھا۔

اُس کے بعد میں کراچی سے مستقل اقامت کے لیے لاہور چلا آیا تو ان ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دو چار بار خط و کتابت ہوئی اور بس۔ بالکل حال میں اپنی وفات سے دو چند ماہ قبل لاہور آئے تو بالکل اتفاقیہ میاں ایم اسلم صاحب کے دولتکدے پر ملاقات ہوئی۔ مَیں نے اتنے عرصے کے بعد اُن کی صحت میں کوئی نمایاں فرق نہیں دیکھا، بجز اس کے کہ بال کھچڑی ہونے کی طرف مائل تھے اور چہرے پر تھکان کے آثار نمایاں تھے۔ بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ مَیں نے کہا: "شاہد صاحب، یہ کیا بات ہے کہ باوجود بسیار تلاش کے آپ کا رسالہ کسی بُک سٹال سے دستیاب نہیں ہوتا۔ آپ کیسے ساقی ہیں جو ادب کے تشنہ کاموں کو جام دینے سے کتراتے ہیں؟"

میرے اس سوال اور اس کے پُوچھنے کے طریقے سے مجھے تاثر ہوا کہ ان کی حساس طبیعت کو ٹھیس پہنچی، ذرا رُکتے ہوئے جواب دیا: "کیا بتاؤں مشتاق صاحب، اوّل تو اس دَور میں ساقی جیسے رسالے کو پُوچھتا ہی کون ہے۔ اُس کا ایک دَور تھا جو گزر گیا، اب حالات نے نئی کروٹ لی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مجھ جیسے آدمی اور ساقی جیسے رسالے کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر بُک سٹال والوں کے میری طبیعت جیسے آدمی سے معاملات سُلجھ نہیں پاتے۔ اب ساقی صرف اُن حضرات کی خدمت میں پیش ہوتا ہے جو اس کی قدر کریں۔ اگر آپ کی خواہش ہے تو ساقی آپ کی خدمت میں باقاعدہ

حاضر ہو جایا کرے گا۔

یہ اُن سے میری آخری مُلاقات تھی۔ کراچی جانے کے بعد اُنہوں نے اپنے وعدے کے مطابق فوری طور پر ساقی جاری کر دیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد مَیں نے اُن کی بیماری اور ہسپتال میں داخلے کی خبر سُنی۔ اللہ نے انہیں صحت یاب کر دیا۔ لیکن ایک دن یہ انتہائی المناک خبر سُنی کہ شاہد احمد دہلوی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کے ساتھ ہی ادب کا ایک دَور ختم ہو گیا اور ایک شرافت کا مجسّمہ اور اُردو ادب کا عاشق دُنیا سے رُخصت ہو گیا ؎

خُدا بخشے بہت سی خُوبیاں تھیں مرنے والے میں

شاہد احمد — ایک انجمن

صادق الخیری

"برادرم، سلام مسنون

آپ کا افسانہ واپس ارسال ہے، کیوں کہ آپ اس سے اچھا لکھ سکتے ہیں۔ جب آپ دوسرے رسالوں کو عمدہ افسانے بھیجتے ہیں تو ساقی کے لیے کم تر چیز کیوں؟ اُمید ہے آپ بُرا نہیں مانیں گے اور جلد ایک عمدہ افسانہ بھیج کر مجھے ممنون فرمائیں گے۔

خاکسار، شاہد احمد"

یہ خاکسار شاہد احمد، ساقی کے مدیر مولوی شاہد احمد دہلوی ہیں اور اس مکتوب کا مخاطب، ان سطور کا راقم۔ زمانہ کم و بیش تیئیس سال پیشتر کا ہے جب میری ادبی زندگی شروع ہوئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا۔ اس وقت میرے مضامین زیادہ تر لاہور کے رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ ان کے ایڈیٹروں سے میری ملاقات نہیں تھی، البتہ خط و کتابت کے ذریعے چند حضرات سے کچھ ربط قائم ہو گیا تھا۔ ان میں سے کسی صاحب کا دِلّی آنا

ہوتا اور وہ مجھ سے ملنے تشریف لاتے تو مجھے بڑی جھجک ہوتی تھی۔ مَیں نے ابتداء میں دِلّی کے رسائل و جرائد میں لکھنے سے اسی لیے گریز کیا کہ ان کے ایڈیٹروں سے ملاقات کے زیادہ مواقع تھے، لیکن ایڈیٹروں کے اس رُعب کے باوجود مجھے اپنی مضمون نگاری پر خاصا ناز تھا۔ اُس وقت کے قریباً تمام دقیع ماہ ناموں میں میرے مضامین اور افسانے شائع ہو رہے تھے اور چوں کہ اس سے پہلے میرا کوئی مضمون کہیں مُسترد نہیں ہوا تھا، اس لیے مجھے سان گمان بھی نہیں تھا کہ مدیر ساقی میرا مضمون واپس کر دیں گے۔ اب جو شاہد صاحب کا خط ملا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی اور اُن پر غصّہ بھی آیا۔

شاہد صاحب میرے قریبی عزیز ہیں اور مَیں نے لڑکپن سے اُنہیں اپنے ہاں آتے جاتے دیکھا ہے۔ شاید اسی لیے پہلے میری ہمت نہیں ہوتی تھی کہ مَیں ساقی کو کوئی مضمون بھیجوں، تاہم ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ اب کے وہ ہمارے ہاں آئیں گے تو اللہ کا نام لے کر اُن کو اپنا مضمون تھما دُوں گا۔ چند روز بعد وہ ہمارے ہاں آئے اور سب سے سلام دُعا کے بعد حسبِ معمول والدِ مرحوم (علّامہ راشد الخیریؒ) سے مصروفِ گفتگو ہو گئے۔ مَیں ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا، لیکن جب وہ رخصت ہونے لگے تو ان کی سنجیدگی اور چہرے پر ایک طرح کی خشونت دیکھ کر میری ہمت متزلزل ہو گئی۔ وہ چلے گئے اور مضمون میرے پاس رکھّا رہ گیا۔ مجھے اپنی کم ہمّتی پر افسوس بھی ہوا اور مَیں نے سوچا کہ آخر کیا ظلم ہو جاتا، وہ مجھے کاٹ تو نہ کھاتے؟ بہر حال، شاہد صاحب کے متعلق میرا پہلا تاثّر یہی تھا اور شاید وہ لوگ جو اُن سے پہلی بار ملتے ہیں یا جن کو اُنہیں قریب سے دیکھنے کا اتّفاق نہیں ہوتا وہ بھی کچھ اسی قسم کی رائے قائم کرتے ہوں گے کہ شاہد احمد ایک خشک اور حد سے زیادہ سنجیدہ بزرگ ہیں، نہ جانے کب پلٹ کر برس پڑیں ——— خیر، دُوسرے دن مَیں

نے اپنا مضمون لفافے میں بند کر کے اُن کے پاس بھیج دیا اور اس کا جو حشر ہوا، وہ آپ اس مضمون کے آغاز میں دیکھ چکے ہیں۔

کسی نئے رسالے کے لیے صفِ اوّل کے مصنّفین کا تعاون حاصل کرنا بڑا دُشوار ہے، لیکن شاہد صاحب کو ساقی کے لیے اعلیٰ درجے کے مضامین فراہم کرنے کا جنون تھا۔ اُن کے اس جذبے کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے کیوں کہ ادبی رسائل میں صرف ساقی ہی تھا جس میں علاّمہ راشد الخیریؒ کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے یہ مضامین کس طرح حاصل کیے، یہ ایک دلچسپ قصّہ ہے۔

شاہد صاحب نے ساقی کو عام روش سے ہٹا کر نہایت صاف سُتھرے اور پاکیزہ ادب کا پیامبر بنایا تھا۔ علاّمہ راشد الخیریؒ کو "مخزن" اور پھر "تمدّن" کی ادارت کے زمانے میں بلند پایہ ادب مہیا کرنے کے لیے جو عرق ریزی کرنی پڑی۔ اور صحافت کی اس دُشوار گزار وادی کے جو تلخ تجربے ہوئے تھے، اُن کی بنا پر وہ شاہد صاحب کے مدّاح تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ شاہد احمد نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ خالص ادبی رسالہ معاش کا ذریعہ نہیں بن سکتا، ساقی نکال کر بہت بڑے حوصلے کا ثبوت دیا۔ اس سے پہلے ایک اور خوش ذوق ادیب سیّد امتیاز علی تاج ایک بڑا اچھا رسالہ "کہکشاں" کے نام سے نکال چکے تھے، لیکن اسے بھی بند ہونا پڑا۔ اب جو ساقی اس طمطراق سے نکلا اور شاہد صاحب کے بلند ارادے اتنے ٹھسّے کے ساتھ عملی جامہ پہننے لگے تو علاّمہ مرحوم نے دل کھول کر ان کی ہمّت افزائی کی، لیکن ان کے لیے مضمون نہیں لکھا کیونکہ جب مولانا رازق الخیری نے علاّمہ کے ادبی کاموں کو ازسرِنو ترتیب دیا تو اس وقت اُنھوں نے چند اصول قائم کیے تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہے۔ ان میں سے ایک اصول یہ تھا کہ علاّمہ کا کوئی مضمون یا افسانہ "عصمت" کے علاوہ کہیں اور شائع نہ ہو۔

اس سلسلے میں ناگوار صورتیں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک دفعہ لاہور کے ایک مشہور ادبی رسالے کا سال نامہ شائع ہو رہا تھا اور اس کے ایڈیٹر کی انتہائی خواہش تھی کہ علّامہ کا مضمون مِل جائے۔ وہ اس کے لیے بے حد مُصر اور کوشاں ہوئے، مگر علّامہ مجبور تھے، کیوں کہ رازق الخیری کسی طرح رضامند نہ ہوتے تھے۔ اُنہیں اپنے ہمعصروں کی برہمی تو منظور تھی، مگر یہ گوارا نہیں تھا کہ علّامہ مغفور کی تحریر عصمت کے صفحات کے علاوہ کہیں اور چھپے۔ ممکن ہے یہ رازق الخیری صاحب کی زیادتی ہو اور اُنھوں نے اپنے اس اصول پر قائم رہنے میں غلو سے کام لیا ہو، مَیں نے تو اس بات کا ذکر یہاں اس لیے کیا ہے کہ ساقی کے اجرا کے وقت رازق الخیری صاحب علّامہ کا کوئی مضمون عصمت کے علاوہ کہیں اور شائع ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اب ساقی کا معاملہ آیا تو بڑی مشکل پیدا ہوئی۔ ایک طرف رازق الخیری صاحب کا اصول تھا دوسری طرف شاہد صاحب کی پیہم کوشش اور علّامہ مرحوم کی ان پر شفقت۔ خود رازق صاحب ساقی کے قدر دان تھے۔ آخر شاہد صاحب کو فتح ہوئی، رازق صاحب نے ساقی کے بارے میں خصوصیت برتی اور شاہد صاحب علّامہ سے ساقی کے لیے وقتاً فوقتاً مضامین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

شاہد احمد کی عمر کم و بیش ساٹھ سال ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم دِلّی کی مشہور درس گاہ اینگلو عربک اسکول میں ہوئی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد ان کو ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے لاہور بھیجا گیا، لیکن چوں کہ ان کو ادب کا چسکا تھا، اس لیے ڈاکٹری میں ان کی طبیعت نہیں لگی۔ لاہور جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بے شمار دلچسپیوں اور رنگینیوں کا شہر ہے، شاہد صاحب کو نہ لُبھا سکا اور وہ وہاں سے اس قدر اُکتائے کہ میڈیکل کالج چھوڑ کر دِلّی واپس آئے اور انگریزی ادب میں بی۔ اے آنرز

کا داخلہ لے لیا۔ اسی زمانے میں ان کو شمس العلماء مولوی عبدالرحمان کی صحبتیں میسّر آئیں جو ایک خاموش طبع عالم فاضل اور دِلّی یونیورسٹی میں شعبہ السنہ شرقیہ کے صدر تھے۔ شاہد صاحب مولوی صاحب کے تبحرِ علمی کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ انہوں نے بعد میں ایم۔اے (فارسی) کا داخلہ لے لیا۔

شاہد صاحب کو مولوی صاحب سے قلبی تعلق تھا اور جب کبھی گفتگو یا تحریر میں مولوی صاحب مرحوم کا ذکر آتا ہے، شاہد صاحب کی زبان اور قلم سے اُن کے لیے احترام اور محبّت کے الفاظ نکلتے ہیں۔ مَیں نے مولوی صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا۔ اُن کی خدمت میں نیاز بھی مجھے اُس وقت حاصل ہوا جب سے میں فلسفے کی تعلیم کے لیے سینٹ اسٹیفنز میں داخل ہوا۔ لیکن اِتنا مجھے معلوم ہے کہ مرحوم کو اُردو، فارسی اور عربی الفاظ کے غلط تلفّظ اور گریمر کی غلطیوں سے سخت چڑ تھی۔ ان کے سامنے کوئی شخص غلط تلفّظ ادا کرتا یا صَرف و نحو کی غلطی کرتا تو وہ ضرور ٹوک دیتے تھے۔ شاہد صاحب نے ان کی فصاحت اور زباں دانی سے اکتساب کیا ہے اور ان کے فیض سے زبان و تلفّظ کے حُسن و صحّت کی بہت سی نزاکتیں سیکھی ہیں۔ یُوں تو زبان و الفاظ کا علم انہوں نے ورثے میں پایا اور اپنے والد سے اُردو اور فارسی کا ابتدائی درس لیا، لیکن ذاتی مطالعے اور مولوی عبدالرحمان جیسے بزرگوں نے ان کی واقفیت کو بے حد جِلا دی ہے۔ میرا خیال ہے شاہد صاحب کو جو فارسی کے کلاسیکی ادب سے اتنا شغف ہے اور فارسی شعراء کا کلام اس کثرت سے ازبر ہے، اس کا سبب بھی مولوی صاحب کا فیض ہے۔ بہر حال، گھر کے علمی ماحول، خود لکھنے پڑھنے کے شوق اور بزرگوں کی صُحبتوں نے ان کی اُردو دانی اور حُسنِ نگارش میں چار چاند لگائے اور آج بہت کم ایسے ادیب ہوں گے جو اُن سے

زیادہ دل کش اور صحیح، اُن سے زیادہ سادہ و پُرکار، اور اُن سے زیادہ شُستہ و رُفتہ اُردو لکھ سکیں۔ اُن کی زبان دلّی کی ٹکسالی زبان ہے، اُن کے الفاظ کا ذخیرہ بے پناہ ہے، اُن کا اندازِ فکر نہایت بلیغ، لیکن رنگِ تحریر بے حد سادہ ہے، وہ مشکل اور گنجلک خیالات کو بھی نہایت آسانی اور بے ساختگی سے ادا کرنے پر قادر ہیں۔

شاہد احمد صاحب کے دادا، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد میرے والد ماجد علاّمہ راشد الخیریؒ کے حقیقی پھوپھا تھے۔ اس طرح وہ میرے عم زاد بھائی ہیں اور ہماری دوستی و رفاقت کی ابتدا اسی رشتے سے ہوئی تھی۔ میری اور اُن کی عمر میں کوئی دس سال کا فرق ہے اور مَیں اُن کو "شاہد بھائی" کہتا ہوں۔ اُن کے بڑے اور چھوٹے کئی بھائی اور بہن ہیں، مگر کچھ ہم مذاقی اور کچھ شاہد صاحب کے ذاتی اوصاف کی بنا پر میرے تعلّقات سب سے زیادہ ان ہی سے ہیں۔ کھاری باؤلی، دِلّی کا مشہور محلّہ ہے۔ اس میں شاہد صاحب کا آبائی گھر، جو ڈپٹی صاحب والا مکان کہلاتا ہے، میرے لیے صرف شاہد صاحب کی وجہ سے باعثِ کشش تھا، حالانکہ اس میں نہ صرف شاہد صاحب کے سارے بہن بھائی اپنے بھرے پُرے کُنبے سمیت رہتے تھے، بلکہ ڈپٹی بشیر الدّین احمد مرحوم کی ساری اولاد یہیں آباد تھی۔ یہ مکان کہنے کو مکان ورنہ دراصل ایک محلسرا تھی۔ زنانہ مردانہ الگ الگ مکان، بڑے بڑے کمرے اور بیٹھکیں، دو تین منزلیں، دالان در دالان، وسیع و عریض صحن، تہہ خانے، صحنچیاں، سہ دریاں، غلام گردشیں اور خُدا جانے کیا کیا۔

غرض ایک بڑا بھاری غدّار مکان تھا، مگر شاہد صاحب کے تصرّف میں ایک مختصر حصّہ تھا۔ ان کے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے لیے اس سے زیادہ حصّہ حاصل کریں یا اس مکان کو چھوڑ کر یا نئے حالات کے مطابق تنگ گلیوں سے نِکل

کے صحیح مفہوم سے بھی آگاہ نہیں تھے اور جب وہ جوان ہوتے تو دونوں میاں بیوی میں وہ مفاہمت ، ہمدردی اور محبت راسخ ہو چکی تھی جو دو معصوم دلوں کے درمیان طویل یکجائی پیدا کر دیتی ہے ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ شاہد صاحب کی بیگم کے پہلو میں ناسور پیدا ہو گیا جو لاعلاج مرض تھا ۔ یہ بیماری مریض کے لیے سخت تکلیف دہ اور تیماردار کے لیے بڑی صبر آزما تھی ۔ ان کی بیوی اس طویل علالت سے اُکتا کر زندگی سے کنارہ کرنے لگیں ، مگر شاہد صاحب آخیر تک اُن کو موت سے بچانے کے لیے جدّوجہد کرتے رہے اور انہوں نے جوانی کا وہ زمانہ جو کبھی لوٹ کر نہیں آتا جب انسان بے فکری اور خوشیوں کا متلاشی ہوتا ہے ، اپنی بیوی کی خدمت گزاری میں بسر کر دیا ۔ چودہ سال انہوں نے اپنی بیوی کی پٹی روزانہ خود اپنے ہاتھوں سے کی ۔ شاہد صاحب اور میں ایک ہی شہر میں رہتے تھے ۔ اس کے باوجود ہم دونوں میں وقتاً فوقتاً خط وکتابت ہوتی تھی ۔ بیوی کی علالت کے آخری ایّام میں اُنہوں نے مجھے مندرجہ ذیل خط لکھا جس سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے :

" برادرم ، سلام مسنون

بیوی کی صحت کے ساتھ ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا ہے ۔ مایوسی نے دُنیا اندھیر کر دی ۔ سترہ سال کا ساتھ چھوٹ رہا ہے ۔ دل کٹا جاتا ہے ۔ تمہیں اطلاعاً لکھ رہا ہوں مگر یہ خبر سُن کر تم مجھ سے ملنے مت آنا ، کیوں کہ ذرا سی ہمدردی پر بھی آنسو نکل پڑتے ہیں ۔ جس وقت سے ڈاکٹروں نے جواب دیا ہے ، دل بے کار ہو گیا ہے ۔ اپنوں میں سے کسی کی صورت دیکھتے ہی دل بھر آتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے ۔

تمہارا بھائی شاہد "

گھر کا اُجڑنا ہر شخص کے لیے باعثِ اذیت ہوتا ہے، لیکن جب بیوی سے قلبی تعلق اور اتنا لمبا ساتھ ہو تو انسان پر کیا کچھ نہیں بیت جاتی! شاہد صاحب کے ماشاءاللہ کئی بچے ہیں۔ بیوی کے مرنے پر اُن کا دل خوُن کے آنسو رو دیا۔ نہ صرف اس لیے کہ اُن کی زندگی سوُنی ہوگئی، بلکہ اس لیے بھی کہ اُن کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کا نامعلوم مستقبل سامنے تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں:

"قسمت کی گردش میرے پاؤں میں آگئی ہے۔ بیوی کے مرنے سے زندگی کا کوئی اصول نہیں رہا۔ زندگی میں زاہدانہ یبوست پیدا ہو گئی ہے۔ کسی سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔ تنہائی میں بھی دل گبھراتا ہے۔ کچھ عجیب طرح کی زندگی گزر رہی ہے۔ تین بچیاں بُشریٰ کے ساتھ جگراؤں چلی گئیں۔ مشہود، سراج کے پاس ہے۔ مسعود، منجھو صاحب کے پاس ہے اور اُن کے ساتھ حیدرآباد چلا جائے گا۔ چھوٹا دُودھ پیتا بچہ اعظم خاں کی حویلی میں ہے۔ شیرازہ ہی بکھر گیا۔ منجھو صاحب جمعرات کو حیدرآباد جا رہے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہہ رہے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ دو ہفتے اگر باہر رہوں گا تو خیال کی یکسوئی کی تکلیف سے بچ جاؤں گا۔ یہاں ہر چیز سے مرحومہ کی یاد وابستہ ہے، غالباً اُن کے ساتھ چلا ہی جاؤں گا۔

ساقی وقت پر شائع ہو گیا۔ یہی بہت غنیمت ہے۔ مضامین بھی اچھے جمع ہو گئے۔ جب مجھ سے اچھے لکھنے والے موجود ہوں تو میرے لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پھر طبیعت میں اُمنگ ہی نہیں ؏ دل جل کے بجھ گیا غالب۔ ادیب غائب ہوا۔

نرے آدمی رہ گئے۔ خیر یہ وقت بھی نہیں رہے گا۔" وہ چلے جھٹک کے دامن " کی کیسی بُری تعبیر نکلی ہے۔

یہ خط میرے ایک مکتوب کے جواب میں ہے۔ شاہد صاحب کا زخم تازہ تازہ تھا اور مَیں نے اس خیال سے کہ اُن کا دھیان بٹے، اُن کو مضمون نگاری کی طرف متوجہ کیا تھا۔ مَیں نے لکھا تھا کہ آپ نے بہت دن سے کچھ نہیں لکھا۔ لوگ آپ کا ڈرامہ (اُس وقت شاہد صاحب کئی لاجواب ڈرامے اُردو میں منتقل کر چکے تھے) پڑھنے کے اشتیاق میں ساقی کا انتظار کرتے ہیں۔ شاہد صاحب نے بڑی معصومیّت سے میرے مشورے کو سُنی اَن سُنی کر دیا، لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ سے شرمیلی طبیعت کے آدمی ہیں اور اُن میں نمود و نام کو نہیں۔ یہ اُن کی خاکساری ہی ہے کہ ساقی میں ایک عرصے تک اُنھوں نے اپنی اکیلی تصویر شائع نہیں کی اور جب کسی گروپ کے ساتھ چھپی بھی تو اُنھوں نے اپنی تصویر کے نیچے نام کے بجائے سوالیہ نشان لگا کر چھوڑ دیا...... یہی صورت ساقی میں اُن کے مضامین شائع ہونے کی رہی کہ اُنھوں نے اپنے مضمون ساقی میں کم سے کم چھاپے اور اپنے چھتّیس سالہ زمانۂ ادارت میں اُنھوں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ کسی دُوسرے کا اچھا مضمون نکال کر اپنا مضمون شریکِ اشاعت کر لیں۔ اس خط کے آخیر میں شاہد صاحب نے "وہ چلے جھٹک کے دامن" کا جو ذکر کیا ہے وہ ان کے موسیقی سے شغف کی طرف اشارہ ہے جس کا مَیں ذرا تفصیل سے ذکر کروں گا۔

جب شاہد احمد سے میرے تعلقات کافی بڑھ گئے تو اُن کی ہمارے ہاں آمد و رفت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ وہ جب آتے تو ادبی گفتگو اور نجی باتوں کے علاوہ گانے بجانے کی ننھی مُنّی محفلیں بھی ہو جاتیں۔ قدرت نے اُنہیں گداز دل اور نُور کا

گلا عطا کیا ہے۔ اُن کی آواز گمبھیر اور بڑی پُر تاثیر ہے۔ وہ جب گاتے ہیں تو اُن کے چشم و ابرُو کی حرکات، اُن کا لب و لہجہ اور اُن کی آواز کا اُتار چڑھاؤ جادُو سا جگانے لگتا ہے۔ موسیقی سے اُنھیں بچپن سے دل چسپی ہے، لیکن علماء کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے اُنھیں اس فن کو کُھلے بندوں سیکھنے اور اس کا عام مظاہرہ کرنے سے ہمیشہ احتراز رہا؛ لہٰذا اُنھوں نے چُھپ چُھپ کر گانے اور طرح طرح کے ساز بجانے کی مشق کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شرفاء موسیقی کو "معزز" فن ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، مگر شاہد صاحب کو اس کی لگن تھی۔ اُنھوں نے تمام دُشواریوں اور پابندیوں کے باوجود اس فن کو باقاعدہ سیکھا۔ نہ صرف سیکھا بلکہ انتھک ریاض کے بعد اس میں کمال حاصل کیا۔۔۔۔

لیکن جن دنوں کا یہ خط ہے، اُس وقت شاہد صاحب عام طور پر غزلیں گاتے تھے اور پکّے گانے کی طرف ان کا رجحان اتنا شدید نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ "وہ چلے جھٹک کے دامن میرے دستِ ناتواں سے" اُس زمانے میں دِلّی کی وقتی غزل تھی۔ گلی گلی اور کُوچے کُوچے اس کا شہرہ تھا اور ہر چند کہ ہر کہ و مہ کے گانے سے اس میں عمومیّت آگئی تھی پھر بھی کم سے کم یہ مصرع میرے لیے دو وجوہ سے بے حد کشش کا باعث تھا۔ ایک تو اس لیے کہ اُردو کے البیلے انشا پرداز حضرت خواجہ حسن نظامی نے اسے عنوان بنا کر ۱۹۳۷ء کے خاتمے (اور نئے سال کی آمد) پر بڑا پیارا مضمون لکھا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شاہد صاحب اس غزل کو ایک ادائے خاص سے گاتے تھے۔ اور مَیں فرمائش کر کے اُن سے اسے سُنا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہُوا کہ شاہد صاحب کی بیگم جو عرصے سے علیل تھیں، زیادہ بیمار ہوگئیں اور شاید، شاہد صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ ان کا آخری وقت قریب آرہا ہے؛ چناں چہ وہ اس غزل کو بلکہ اس خاص مصرعے کو اپنی زبان سے ادا کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ اُن کی بیگم کی علالت

یہ صورت اختیار کر چکی ہے ،۔اس لیے مَیں نے حسبِ عادت اس غزل کی فرمائش کی
پھر اُن کو خلافِ معمول مُتامّل دیکھ کر زیادہ اصرار کیا۔ میری ضِد پر وہ رضامند ہو گئے اور
باجے کے دھیمے سُروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اُنھوں نے ہولے ہولے گانا شروع
کیا۔ شاہد صاحب گاتے وقت عموماً مسکراتے ہیں اور اُن کی آنکھیں آواز کے زیر و بم
اور الفاظ کے فہم و تفہیم کیساتھ ساتھ متحرک ہو جاتی ہیں، مگر اُس وقت نہ تو اُن کے
لبوں پر مسکراہٹ کھیلی ، نہ اُن کی آنکھوں میں رقص پیدا ہوا۔ انتہائی اُداسی کے ساتھ
اُنھوں نے یہ غزل گائی اور اس مصرعے کی تکرار کرتے رہے ۔ جانے آج اُنھیں کیا ہو
گیا تھا، کہاں سے اُن کی آواز میں اس غضب کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی اور میرا یہ
حال کہ باوجود اس کے کہ مَیں گانا سُننے کے دَوران میں عموماً ہنستا رہتا ہوں) مَیں
ہمہ تن گوش بنا سُنتا رہا اور اُن کی پُر درد دُھن سے مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت
طاری ہو گئی ۔ جانے کب تک وہ گاتے رہے اور" میرے دستِ ناتواں سے "
کی تکرار کرتے رہے ۔ غزل ختم کر کے اُنھوں نے ہارمونیم آہستگی سے بند کر دیا اور یہ
سب کچھ اِس خاموشی سے ہوا کہ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور بہت دیر تک میرے کانوں
میں اُن کی پُرسوز آواز گونجتی رہی ———— کچھ عرصے بعد جب میں نے شاہد صاحب
کے خط میں یہ فقرہ پڑھا تو مَیں نے بڑے قلق کے ساتھ جانا کہ واقعی " وہ چلے جھٹک کے
دامن ———— مرے دستِ ناتواں سے ". کی تعبیر بہت بُری نکلی۔

شاہد صاحب کو گانے کا شوق تو ساقی کے اجرا کے بعد بھی رہا، لیکن اُن کی زیادہ تر
توجہ اب ساقی کو بہتر سے بہتر بنانے میں صَرف ہوتی تھی۔ اس کے لیے عمدہ مضامین کی
فراہمی اور اُنھیں نفاست کے ساتھ پیش کرنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش بروئے کار

لاتے تھے۔ اُن کا سارا وقت مضمون نگاروں کی تلاش، ان سے خط وکتابت اور طباعت و اشاعت کے مراحل طے کرنے میں گزر جاتا تھا۔ چناں چہ سالہا سال تک اُنہیں موسیقی کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی مُہلت نہیں ملی۔ بس ساقی ہی ان کا اُٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا ہوگیا تھا۔ شاہد صاحب طبعاً خاموش اور گوشہ نشین ہیں۔ نئے لوگوں، خصوصاً بڑے آدمیوں کی ملاقات سے جی چُراتے ہیں۔ نئے تعلّقات پیدا کرنے کی اُنہیں خواہش نہیں۔ جو ادیب یا شاعر خود ان سے ملنے آتا ہے تو بیشتر بے دلی سے ملتے ہیں اور اگر یہ ملاقاتی دُون کی لے تو یہ ملاقات اُن کے لیے وبالِ جان اور دیکھنے والوں کے لیے تماشا بن جاتی ہے۔ اِس کے باوجود شاہد صاحب سے بے شمار اہلِ قلم کی ملاقاتیں ہوئیں اور کئی حضرات سے تعلّقات قائم ہوئے، یہ مُلاقاتیں اور تعلّقات خوش گوار بھی تھے اور ناگوار بھی۔

اَن گِنت مدّاحوں، ہمدردوں اور دوستوں کے ساتھ ساتھ چند دشمن، حاسد اور نکتہ چیں بھی پیدا ہوگئے۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر کا طرزِ عمل حالات کے مطابق بدلتا رہا۔ ایسا بھی ہؤا جو پہلے دوست تھے وہ بعد میں ان کے مخالف ہوگئے اور یُوں بھی ہؤا کہ جس سے وہ برگشتہ تھے آگے چل کر اُس سے دوستی ہوگئی۔ شاہد صاحب کے بعض دوست ایسے ہیں جنہوں نے شروع ہی میں ان کے دل میں جگہ پائی اور آخیر تک وہ شاہد صاحب کے اور شاہد صاحب اُن کے ہمنوا رہے۔ یہ وہ لوگ تھے اور ہیں جن کے درمیان کوئی غرض نہیں اور اُن کی دوست داری کی بُنیاد خلوص اور محبّت پر استوار ہوئی ہے۔ ایک تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے شاہد صاحب سے دوستی "دُور اندیشی" کی بنا پر چاہی۔ مثلاً ساقی کے ذریعہ شہرت طلب کی یا ساقی بُک ڈپو کے ہاتھ کتابیں فروخت کرنا چاہیں یا شاہد صاحب کے حلقۂ اثر میں

کوئی منفعت حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لطیفہ یہ ہے کہ شاہد صاحب نے ایسے بہت سے لوگوں کی مدد کی اور اس کے صلے میں وہی پایا جو اس زمانے میں ملتا ہے۔

شاہد صاحب کے دوستوں، مخالفوں اور واقف کاروں کا ذکر خود شاہد صاحب کا ذکر ہے، کیوں کہ اِن لوگوں سے اُن کا تعلق، اِن کے بارے میں اُن کے تاثرات و محسوسات، اِن کے ساتھ اُن کا رکھ رکھاؤ اور اِن کے ذہن و عمل پر اُن کا ردِّ عمل، دراصل ان کے اپنے عادات و خصائل کا پرتو ہے۔ اس لیے مَیں اس باب کو ذرا تفصیل سے بیان کروں گا۔ شاہد صاحب کے دوستوں اور ملاقاتیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر یہ صرف چند حضرات کا تذکرہ ہے جس سے خود شاہد صاحب کے کردار کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

سب سے پہلے مجھے شاہد احمد کے وہ دوست یاد آتے ہیں جنہوں نے ساقی کے پروان چڑھانے میں مدد دی۔ یہ انصار ناصری اور فضل حق قریشی ہیں جنہوں نے اُردو ادب خصوصاً جدید ڈرامے کو کئی عمدہ چیزیں دی ہیں۔ ان کے تیسرے دوست ممتاز حسین ساقی کے لیے لکھتے بھی تھے اور اس کو سنوارنے کے لیے دن رات محنت بھی کرتے تھے۔ جب ترقّی پسند ادب کا زور تھا تو ایک نہایت عمدہ طنزیہ تمثیل "مُلّا مردودی بھوپالی" شائع ہوئی تھی۔ اس کے مُصنّف یہی ممتاز حسین تھے۔

شاہد صاحب کے چوتھے دوست پیر ولایت حسین تھے جنہیں ادب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن شاہد صاحب سے اُنہیں محبت تھی اور ان کی خاطر وہ بھی اپنا زیادہ تر وقت ساقی کے دفتری کاموں میں صَرف کرتے تھے۔ یہ چاروں اصحاب ساقی کے شباب تک شاہد صاحب کے ساتھ رہے۔

شاہد صاحب نے ساقی کو بامِ عروج پر پہنچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت

نہیں کیا۔ چوں کہ دولت مند تھے اور اُنہیں کوئی لت نہیں تھی اس لیے ساقی پر دل کھول کر روپیہ صرف کرتے تھے۔ انصار ناصری اور فضل حق قریشی جو ان کے دستِ راست تھے، ان کے جوش و خروش کو نہ صرف تازہ رکھتے بلکہ زیادہ سے زیادہ سرگرمی کے لیے اُبھارتے تھے۔ رات رات بھر ساقی کے دفتر میں رونق رہتی، ادبی مشوروں سے جی گھبراتا تو شاہد صاحب کے ساتھ انصار، فضل، ممتاز اور پیر ولایت خریداروں کے پتے لکھنے بیٹھ جاتے، لئی لگا کر ریپر لپیٹتے، حساب کتاب تیار کرتے اور ان سے طبیعت اُکتا جاتی تو پھر ساقی کے لیے نئے نئے منصوبے تیار کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ سب پر نشہ سا سوار ہو گیا تھا۔ ساقی کی بہتری ہر شخص کی رگ و پے میں رچ گئی تھی۔ شاہد صاحب نے اپنے رفیقوں کا دل مٹھی میں لے لیا تھا اور وہ اُن کی خاطر چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ شاہد صاحب کی طبیعت میں اُپج ہے، انہوں نے اپنے رفیقوں کے ساتھ رہ کر رسائل کے لیے بہت سی نئی نئی راہیں نہ صرف تلاش کی ہیں بلکہ تخلیق بھی کیں۔ ان میں سے ایک کتابوں اور رسالوں پر تنقید و تبصرے کا سلسلہ تھا جسے اُنہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ شروع کیا اور اُس میں ایک خاص شہرت پائی۔ اُس وقت شاہد صاحب جوان تھے اور اُن کی رگوں میں گرم خون تھا۔ کسی کتاب، رسالے یا ادیب کے متعلق جو رائے قائم کر لیتے اُسے دھڑلے کے ساتھ ظاہر کر دیتے اور اس میں کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے نتیجہ یہ ہوتا کہ آئے دن ان کے مخالف پیدا ہوتے جو جھنجھلا کر اُنہیں دوسرے رسالوں میں مطعون کرتے۔ اُن کے رفیقوں کو ایسا لگتا جیسے خود اُن ہی کو تیروں کا نشانہ بنایا گیا ہے اور وہ شاہد صاحب کی حمایت میں آستینیں چڑھا کر کھڑے ہو جاتے۔ شاہد صاحب نے اِن دوستوں کو ہمیشہ اچھا جانا۔ اِن کی محنت کی داد دی اور اُنہوں نے ساقی کو بہتر

سے بہتر بنانے کے لیے جو جو مفید اسکیمیں بنائیں اُنہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ان دوستوں میں سے پیرِ ولایت کسی درگاہ کے سجادہ نشین ہو کر ساقی کے دامن سے کنارہ کر گئے، لیکن شاہد صاحب کو اب تک اُن کا خیال ہے۔ اُن کی زندگی میں کئی اہم مراحل آئے اور شاہد صاحب نے اپنی عادت کے مطابق اُن کی خاموشی سے رہنمائی کی۔ ساقی کا پہلا دَور ختم ہونے کے بعد ممتاز حسین کا ادبی ذوق سرد پڑ گیا اور وہ شاہد صاحب سے آہستہ آہستہ دُور ہوتے گئے، لیکن چوں کہ کسی کو کسی سے کوئی غرض وابستہ نہیں تھی اس لیے وہ اب بھی دوست ہیں اور جب ملتے ہیں تو مصافحہ نہیں، معانقہ کرتے ہیں۔ انصار ناصری جب تک زیرِ تعلیم تھے، ساقی کے رُکنِ رکین رہے اور شاہد صاحب ان کے پُشت پناہ۔ اُنھوں نے ساقی کے لیے اور شاہد صاحب نے اُن کے لیے بہت کچھ کیا، لیکن میرا خیال ہے ملازمت میں آنے کے بعد انصار کے تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے۔ بظاہر انصار کو شاہد صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ ادبی اعتبار سے کاہل ہو گئے ہیں اور شاہد صاحب اب ادیبوں کے بجائے گویّوں کی صحبت میں رہتے ہیں جو اگرچہ صحیح بھی ہے تو میرا خیال ہے دوستی میں ان باتوں سے فرق نہیں آنا چاہیے، مگر شاہد صاحب اور انصار ناصری کا معاملہ ایسا ہے کہ اس پر فی الحال کچھ نہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ ہاں اتنا مجھے معلوم ہے کہ انصار اب بھی کسی معاملے میں مشورے کے لیے شاہد صاحب کے پاس جاتے ہیں تو وہ خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ فضل حق قریشی جو ساقی کے افسانہ نگاروں میں پیش پیش اور شاہد صاحب کے محبّانِ خاص میں تھے، وہ بھی اب اجنبی سے ہو گئے ہیں۔ یہ کشیدگی جیسی بھی ہو، ایک بات مجھے معلوم ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے خلوص کے قائل ہیں اور جب ملتے ہیں تو بڑی محبّت سے ملتے ہیں۔

شاہد صاحب کے پُرانے دوستوں میں عظیم بیگ چغتائی کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے ہماری ظرافت میں زبردست اضافہ کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن کے ادبی کارناموں کے سب سے زیادہ محرک شاہد احمد تھے۔ عظیم بیگ کو شاہد احمد سے دِلی تعلّق تھا اور شاہد صاحب نے عظیم بیگ کی خوب قدردانی کی۔ مرحوم، شاہد صاحب کو دِلّی سے جودھ پور بُلاتے اور کبھی اس لیے کہ بیگم شاہد کو رُونمائی دینی ہے، کبھی اس لیے کہ شاہد صاحب اب واپس دِلّی چلے جائیں گے، اُن کو روکنا ہے، کتابوں پر کتابیں لکھ کر ان کی نذر کر دیتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا کہ شاہد صاحب ان کے پروگرام تجویز کرتے اور عظیم بیگ بخوشی اُسے عملی جامہ پہنانے کی غرض سے کبھی سارے کا سارا چغتائی نمبر لکھ دیتے، کبھی ان کے بتاتے ہوئے خطوط پر ناول اور ناولٹ تصنیف کرتے، کبھی افسانے اور مضامین تحریر کرتے۔ شاہد صاحب نے عظیم بیگ کی شہرت بنانے اور پھیلانے میں بڑا کام کیا اور یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے عظیم بیگ کی کتابوں سے خوب کمایا، مگر جب وہ مر گئے ——— تو شاہد صاحب کا عظیم بیگ سے دلی تعلّق نہیں مرا۔ چغتائی (شاہد صاحب اُنہیں ہمیشہ یہی کہتے تھے) کا نام، چغتائی کی بیوہ اور چغتائی کی کم سِن اولاد ان کو ہمیشہ یاد رہی اور وہ ہندوستان کی تقسیم تک ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ ایک معقول رقم انہیں بھیجتے رہے۔ پھر جب پاکستان قائم ہوا اور وہ لُٹ کر دِلّی سے کراچی چلے آئے، جب شاہد صاحب کا کام ٹھپ گیا، جب شاہد صاحب خود روزگار کے متلاشی ہوئے، اُس وقت بھی انہوں نے بلند حوصلگی کا ثبوت دیا۔ چوں کہ اب وہ مرحوم کے بال بچوں کی مالی امداد نہیں کر سکتے، اس لیے اُنہوں نے عظیم بیگ کی کتابوں کے حقوق مرحوم کی بیوہ کے حوالے کر دیے اور وہ یہ کتابیں اب ایک دوسرے ناشر سے چھپوا رہی ہیں۔ عظیم بیگ

کی یہ مقبولِ عام کتابیں کافی آمدنی کا ذریعہ ہیں اور انہیں بیگم چغتائی کو واپس کر کے شاہد صاحب نے یقیناً خدا ترسی اور دوست کی دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ جو لوگ ساقی کا عرصے سے مطالعہ کرتے ہیں اُنہیں ان صفحات پر ایک نام اور ممتاز نظر آتا ہے۔ یہ ایم۔ اسلم کا ہے جن سے شاہد صاحب کے پُرانے تعلقات چلے آتے ہیں۔ ساقی نے ابتدائی منزلیں طے کر کے نئے ادب کی انتہائی بلندیوں کو چھُوا، بڑے اچھے اچھے اہلِ قلم راستے میں ہانپ کر بیٹھ گئے۔ شاہد صاحب نے کئی اچھے لکھنے والوں کی محض اس لیے ہمّت شکنی کی کہ وہ ساقی میں صرف عمدہ چیزیں شائع کرنے کے متمنّی تھے، مگر ایم۔ اسلم کو اُنہوں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ لوگوں نے بلند پایہ مضامین کے پہلو بہ پہلو ایم۔ اسلم کے افسانے شائع کرنے پر انگشت نمائی بھی کی، مگر شاہد صاحب بس یہی جواب دیتے ہیں کہ ان کا اور ساقی کا پُرانا ساتھ ہے، آخر وضعداری بھی کوئی چیز ہے؟ چناں چہ ایم۔ اسلم کو ساقی کے ممتاز افسانہ نگاروں میں اب بھی اسی طرح سرِفہرست جگہ ملتی ہے۔

شاہد احمد متعصّب آدمی ہیں اور بعض اوقات یہ تعصّب ان کے دل میں خواہ مخواہ یا معمولی سی بات پر پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اختر شیرانی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، میراجی، وقار عظیم، ظفر قریشی اور جمیل احمد قدوائی سے بیزار رہتے۔ ان میں بعض سے بیزار نہیں تو کم از کم انہیں ناپسند ضرور کرتے تھے۔ بعد میں منٹو، وقار اور ظفر قریشی کے متعلق اُنہوں نے اپنی رائے بدل لی۔ اختر شیرانی کو وہ اب تک ذاتی اور ادبی دونوں اعتبار سے گھٹیا سمجھتے ہیں۔ ہوا یہ کہ "نیرنگِ خیال" کے سالنامے میں اختر شیرانی نے ایک شاعرہ کی شادی کی خبر سُن کر جو نوحہ و فریاد لکھی تھی، شاہد اسی سے بدظن ہو گئے۔ یہ نظم جن خاتون سے متعلق ہے وہ ساقی کی محبوب افسانہ نگار تھیں

اور شاہد صاحب کو اُن کا احترام منظور تھا، چناں چہ انہوں نے اس نظم کو اختر شیرانی کی "بے ہُودگی" سمجھا اور انسانی سرشت کا تجزیہ کیے بغیر، اُنھوں نے اس نظم کو ان کی اخلاقی کم زوری پر محمول کیا۔ اُن کے خیال میں اختر شیرانی کی عظمت اس میں تھی کہ وہ یہ نظم نہ لکھتے کیوں کہ اُس نظم کے چھپنے سے نامناسب چرچا ہوا۔ انسان کی بلندی اس میں ہے کہ وہ اپنے محسوسات پر قادر رہو۔ نہ کہ وہ ایسا کر گزرے جس سے دوسرے کی رُسوائی کا امکان ہو۔ شاہد احمد فن کار کے کارناموں اور اُس کی شخصیت کو ملا کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ نفیس ادب وہی تخلیق کر سکتا ہے جو نفیس مزاج ہو۔ جس کے خیالات میں پستی و ابتذال ہو گا وہ بلند اور دائم ادب کا خالق نہیں ہو سکتا۔ شائستہ ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مصنّف خود پاک نفس ہو۔ شاہد احمد اپنے اس نظریے میں ترمیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور جیسا کہ آپ ان سطور سے اندازہ کریں گے، اُنھوں نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو اس لیے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا کہ اُن کے خیال میں اِن کی تربیت ناقص ہوئی اور اُن کے رجحانات غیر شائستہ تھے۔ ذکر اختر شیرانی کا تھا۔ شاہد صاحب سے اُن کی مُلاقات ایک دفعہ اس طرح ہوئی کہ اُن کا دِلی آنا ہوا۔ اس زمانے میں اُن کی بے مثل نظم "......غزل خواں رہیں گے" شائع ہوئی تھی۔ مَیں اس سے بڑا متاثر تھا بلکہ ان کا مدّاح تو شروع ہی سے ہوں، کیوں کہ انہوں نے ہمارے شعری ادب کو لازوال شیرینی اور نئی نئی لطافتیں عطا کی ہیں۔

میرے بڑے بھائی مولانا رازق الخیری سے ان کے خصوصی مراسم تھے اور وہ جب تک دِلی رہتے، ہمارے ہاں اُن کا قریب قریب روز آنا جانا ہوتا۔ اختر شیرانی کی مے نوشی کے متعلق چند بُری باتیں مشہور ہیں، لیکن مَیں نے اُن کی اس بات

کی بڑی قدر کی کہ مولانا رازق الخیری سے مراسم ہونے کی وجہ سے وہ مجھے اپنا چھوٹا سمجھتے تھے۔ اس لحاظ انہوں نے ہمیشہ لحاظ رکھا اور باوجود اس کے کہ خود مجھ سے اُن کے کافی تعلّقات تھے، وہ مجھ سے بے تکلّف کبھی نہیں ہوتے۔ چند بار ایسا ہوا کہ دہلی میں اُن کی قیام گاہ پر اُن سے ملنے گیا، وہاں اُن کے دوست احباب کا مجمع ہوتا اور شراب کا دَور چلتا۔ جو لوگ تکلّفاً یا کسی اور وجہ سے شرکت نہ کرتے، اختر شیرانی اصرار کے ساتھ اُنہیں شریک کر لیتے، مگر یہ جان لینے کے بعد کہ مَیں شراب نہیں پیتا، اُنہوں نے کبھی مجھ سے اصرار نہیں کیا۔ اسی طرح مَیں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ اختر، جس کے خمار میں بدتہذیبی کے قصّے مشہور ہیں، جب تک مَیں اُن کے ساتھ رہتا میرے ساتھ اسی طرح اخلاق اور شائستگی کا ثبوت دیتے۔ جیسا ہوش مندی میں۔ ایک روز وہ ہمارے ہاں آئے اور دَورانِ گفتگو میں شاہد صاحب کا ذکر آگیا۔ اُس وقت ساقی عروج پر تھا۔ ادیبوں اور شاعروں اور اُن سے زیادہ مدیروں پر اُنکی پامردی اور تنقید نگاری کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ لاہور کے ادبی حلقے البتّہ مخالف تھے۔ مَیں نے شاہد احمد کی تعریف کی۔ اُن کی ادبی قابلیّت اور لائق ادیبوں کو اپنے گِرد جمع کر لینے کی صلاحیتّوں کو سراہا اور خاص طور پر مَیں نے یہ کہا کہ شاہد صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ اختر شیرانی کے رومان کی ملکیّت اُنہی دنوں اُن کے قبضے سے نکلی تھی اور وہ اپنے بعض دوستوں کی عنایات کے شاکی تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس زمانے میں مخلص آدمی نہیں ہوتا۔ بہر حال شاہد صاحب کے متعلّق میرے خیالات سُن کر ایک دم بولے۔ "تو ہم اُن سے مِلیں گے۔ ان کا گھر کہاں ہے؟" مَیں نے اُنہیں بتایا کہ اس وقت شاہد صاحب کُتب خانۂ علم و ادب پر ہوں گے۔ اگر آپ اس وقت ملنا چاہیں تو راستے میں اُن سے مل لیجیے گا۔ انہوں نے کہا "بہت اچھا، مگر

آپ بھی چلیے۔" مَیں اُن کے ہمراہ ہوگیا۔ تانگہ کُتب خانے کے سامنے جا کر رُکا تو مَیں نے دیکھا کہ شاہد صاحب اندر حسبِ معمول ادیبوں میں گھِرے بیٹھے ہیں۔ اختر شیرانی نے سادہ لوحی سے کہا "جایئے آپ اُنھیں یہاں بُلا لایئے۔" مَیں نے تعمیل کی، لیکن پیشتر اس سے کہ شاہد صاحب اُٹھتے یا کچھ کہتے، اُن کے ایک مشیر نے چہکتے ہوئے کہا "اختر شیرانی ہیں تو کیا ہُوا؟ اُن کے پاؤں میں کیا مہندی لگی ہے؟ وہ اُتر کر یہاں نہیں آسکتے؟" اوگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ شاہد صاحب اُن کے بھڑکانے میں آگئے اور اُنھوں نے خشک مُنہ بنا کر کہا "مَیں نہیں جاتا۔ اُنھیں مِلنا ہو تو یہاں آکر مِل لیں۔" میرے لیے یہ ذرا نیا تجربہ تھا اور مجھے اُن سے اس رُوکھے طرزِ عمل کی توقع نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اختر شیرانی سے جا کر کیا کہوں؟ اُنھیں کیسے بتاؤں کہ شاہد صاحب ایک دوست کے غلط مشورے پر، باہر سے آئے ہوئے مہمان کی پذیرائی کے لیے دو قدم چل کر آنے کے لیے تیار نہیں۔ آج اس واقعے کو دس پندرہ سال ہوگئے مگر مجھے وہ لمحہ اب تک یاد ہے جو اُس وقت مجھ پر گزرا۔ شاہد صاحب کے مشیر کا وہ فقرہ یا شاید انہی کی بات اختر شیرانی نے سُن لی تھی یا میرے چہرے کے رنگ سے وہ صورتِ حال کو تاڑ گئے تھے۔ بہرحال جب میں نے آہستگی سے کہا "چلیے وہیں چلے چلیں" تو وہ فوراً تانگے سے اُتر آئے اور بولے "کوئی بات نہیں، آپ دل مَیلا نہ کیجیے۔" یہ قصّہ تو ختم ہوگیا، لیکن میری اب بھی یہی رائے ہے کہ شاہد صاحب سے اُس دن غلطی ہوئی۔ عوائدِ رسمیہ خواہ کچھ ہی ہوں، شاہد احمد کی شخصیّت کتنی ہی بلند ہو، ساقی کی خدمات کیسی ہی تابناک ہوں، اُنھیں زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ اختر شیرانی ——— جو نئی شاعری کا شہریار تھا جس میں بشری خامیاں چاہے بے شمار ہوں، لیکن جس کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا متکبّر تھا ———

اُس اختر شیرانی کا استقبال کر لیتے۔ وہ کئی وجوہ سے عزّت و تکریم کا مستحق تھا اور جب کہ وہ خود اُن سے ملنے آیا تھا تو اُس تک چلے جانے سے اُن کی کوئی سُبکی نہ ہوتی۔

منٹو سے شاہد صاحب کے تعلقات پیدا ہونے کا قصّہ عجیب سا ہے۔ ہمایوں اور عالم گیر کے فرانسیسی اور رُوسی ادب نمبر نکال کر منٹو مشہور ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے اُن کی "سرگزشتِ اسیر" شائع ہو چکی تھی، لیکن شاہد صاحب نے اُن کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اُن کی ذہانت سے وہ مطلق متاثر نہیں ہوئے بلکہ اُنہیں منٹو کی فرانسیسی اور رُوسی دانی پر شبہ تھا۔ ان کی رائے تھی کہ منٹو انگریزی سے ترجمہ کرتے ہیں اور اُن کو ناحق یہ ادّعا ہے کہ وہ ان زبانوں پر قادر ہے۔ معلوم نہیں منٹو کو بھی یہ زعم تھا یا نہیں، لیکن شاہد صاحب شاید اسی لیے ان کو کچھ اچھّی نظر سے نہ دیکھتے تھے، میں اسے ان کا تعصّب ہی کہتا ہوں۔ ایک دن اتفاقاً ریل کے سفر میں منٹو کی مجھ سے مُلاقات ہو گئی اور ہر چند کہ یہ ملاقات ابتداءً ناخوش گوار تھی، مگر سفر ختم ہونے تک ہم دونوں خاصے دوست ہو گئے۔ پھر منٹو نے علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ایک دفعہ رات گئے وہ بغیر کسی اطلاع کے میرے ہاں آ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک سُرخ سیب تھا جسے وہ نہایت شوق سے تھامے ہوئے تھے۔ کوئی دس بارہ کا عمل ہو گا۔ ایسے بے وقت آنے سے مجھے ذرا تکلیف ہوئی، مگر یہ سُن کر کہ وہ اسٹیشن سے سیدھے آ رہے ہیں، میں اُنہیں اندر لے گیا۔ مَیں نے کھانے کا انتظام کرنا چاہا تو بولے "بالکل بُھوک نہیں ہے۔" پھر جب وہ آرام سے بیٹھ گئے تو اُنھوں نے سیب آگے بڑھا کر کہا "لو ——— یہ کھاؤ۔" مَیں نے جواب دیا "اس کے کھانے کا یہ کون سا وقت ہے؟" تو دم ہنسے "سیب کھانے کا کوئی وقت مقرّر نہیں ہوتا ——— یہ ہر وقت کھایا جا سکتا ہے۔ تمہارے لیے انتخاب کر کے لایا ہوں۔" ہماری نئی نئی دوستی تھی۔

آدھی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تر موضوع اُس وقت کے ادبی رسائل اور افسانہ نگار تھے۔ پھر طبع زاد مضامین اور ترجموں کا ذکر چھڑا۔ اُنہی دنوں میرے پاس ایک عالمی تصویری نمائش کی البم آئی ہوئی تھی جس کا طویل دیباچہ فرانسیسی میں تھا۔ اس البم میں تصویریں اتنی دل کش تھیں کہ مجھے یہ دیباچہ پڑھنے کا بڑا اشتیاق تھا، مگر چوُں کہ مَیں فرانسیسی نہیں جانتا اس لیے البم میری میز پر رکھّی رہی اور میں اس انتظار میں رہا کہ کسی سے اس کا دیباچہ پڑھواؤں۔ منٹو سے ترجموں کا ذکر چلا تو معاً مجھے ان کے فرانسیسی ادب نمبر اور شاہد صاحب کے شبہ کا خیال آیا اور مَیں نے وہ البم ان کی طرف بڑھا دی "ذرا یہ پڑھ کر تو بتاؤ کہ ان تصویروں کے متعلق کیا لکھا ہے؟" منٹو نے وہ موٹی سی البم اُٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لی اور مَیں نے مزید کہا۔ "یہ فرانسیسی میں ہے۔ تم تو اس کے ماہر ہو، مجھے اچھّی طرح سمجھا سکو گے۔" چند لمحوں کے لیے منٹو جیسے سکتے میں آ گئے، لیکن فوراً ہی انہوں نے صورتِ حال پر قابو پا لیا اور اطمینان سے وہ البم واپس میز پر رکھ کر بولے۔ "یہاں فرینچ کس کو آتی ہے؟" جب منٹو نے اقرار کر لیا کہ فرانسیسی اور روسی دونوں سے ناواقف ہیں تو مَیں نے اُن سے یہ شاہد صاحب کا ذکر کیا اور کہا کہ تم نے اپنے متعلّق خوب طومار باندھا ہے۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ تمہیں ان زبانوں پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ جب ہی تو تم نے ایسے عمدہ نمبر پیش کیے۔ منٹو نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "لوگ اگر خود بخود میرے متعلّق کسی مغالطے میں مبتلا ہو جائیں تو مَیں کیا کروں؟" پھر وہ شاہد صاحب اور ساقی کے متعلّق سوالات کرنے لگے۔ مَیں نے پوچھا، تم ساقی میں کیوں نہیں لکھتے؟ اس کے جواب میں اُنہوں نے دو باتیں کہیں۔ ایک تو یہ کہ میں شاہد صاحب کے مزاج سے ناواقف ہوں اور میں نہیں جانتا کہ ساقی میں مضامین چھپنے کی کیا شرائط ہیں۔

دوسرے اُن کا یہ خیال تھا کہ میں اتنا نام پیدا کر چکا ہوں کہ شاہد صاحب خود مجھ سے مضمون مانگیں۔ کچھ دن بعد میرا شاہد صاحب سے ملنا ہوا تو میں نے منٹو کے متعلق گفتگو کی، شاہد صاحب تنک کر بولے "جی نہیں، میں اُن سے مضمون کی درخواست نہیں کروں گا۔ اُنہیں لاکھ دفعہ غرض پڑے تو مضمون بھیج دیں۔" منٹو سے میری مختصر خط و کتابت رہی اور میں نے اُنہیں مشورہ دیا کہ شاہد صاحب کو مضمون بھیجیے، وہ اسے ساقی میں ضرور چھاپیں گے۔ یہی ہوا۔ منٹو نے شاہد صاحب کو مضمون بھیجا اور اُنہوں نے اُسے چھاپا۔ پھر ان دونوں میں مراسلت بڑھی، نہ صرف یہ بلکہ آہستہ آہستہ وہ منٹو کی ذہانت کے قائل ہو گئے۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ ادب میں تجدد اور بے شرمی کا غلغلہ ہوا۔ نفاست و پاکیزگی، شرافت اور حجاب جنہیں شاہد صاحب ساقی کے اوّلین دَور میں ادب کا ضروری جزو سمجھتے تھے، انہیں گھن لگ گیا اور وہ تمام باتیں جو صرف اشاروں کنایوں میں کہی جانی چاہئیں، ساقی کے صفحات پر الم نشرح ہونے لگیں اور میں سمجھتا ہوں کہ شاہد صاحب کو اس ڈگر پر ڈالنے میں عصمت چغتائی کے علاوہ سب سے بڑا حصہ منٹو کا تھا جو "دھواں" کی اشاعت کے بعد شاہد صاحب کے خیالات پر بڑی حد تک اثر انداز ہو گئے۔

شاہد احمد بڑوں کو بڑا مانتے ہیں، لیکن کسی ایسے بڑے آدمی کی پذیرائی کے لیے ہرگز تیار نہیں جس میں تمرّد ہو یا اپنی عظمت کا اس قدر شدید احساس رکھتا ہو کہ وہ اپنے آپ کو عام اخلاق اور تہذیب سے بلند سمجھے۔ اس سلسلے میں مجھے جناب نیاز فتح پوری کا ایک واقعہ یاد آیا جن کی ادبیت کے ساتھ شخصیت کے بھی شاہد صاحب بڑے مداح ہیں۔ غالباً ۱۹۳۷ء میں اُن کا دِلّی آنا ہوا۔ شاہد صاحب نے اُن کے اعزاز میں ایک پُر تکلف عصرانہ ترتیب دیا، جس میں نیاز صاحب کی

مخصوص تحریر کی رعایت سے اُنھوں نے صرف نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا۔ یہ سب لوگ نیاز کی عظمت کا لوہا مانتے تھے اور جن کے ذہنوں پر نیاز کی شخصیت اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ چھائی ہوئی تھی، لیکن چائے کا وقت نکل گیا اور نیاز صاحب تشریف نہیں لائے۔ آخر انتظار نے اضطراب کی شکل اختیار کر لی۔ اُن کے آنے میں جُوں جُوں دیر ہوئی لوگ باتیں چھانٹنے لگے۔ شاہد صاحب کی نگاہوں میں بھی استفسار تھا، مگر چوں کہ صاحبِ خانہ تھے اس لیے اپنے معزز مہمان کے بارے میں اُن کے لیے لب کُشائی کرنا ممکن نہیں تھا۔ انھوں نے اُوپری دل سے دوسرے مہمانوں کی تسلّی کے لیے کہا بھی کہ نیاز کو کوئی مجبوری ہو گئی ہو گی یا اُنھیں گھر کا راستہ نہیں ملا ہو گا، لیکن ان امکانات پر پہلے ہی تبصرے ہو چکے تھے۔ آخر خُدا خُدا کر کے مغرب کے لگ بھگ نیاز صاحب تشریف لائے اور جس اندازِ تمکنت سے اُنھوں نے "نوجوان ادباء" کی تعظیم کا جواب دیا، وہ کسی کو نہیں بھایا۔ خود شاہد صاحب کو بھی نہیں۔ اس مجمع میں معمّر صرف ایک صاحب تھے: یعنی کرنل ڈاکٹر اشرف الحق۔ اُن کو شاہد صاحب نے اس لیے مدعو کر لیا تھا کہ وہ اعادۂ شباب کے نامور ماہر تھے اور نیاز صاحب سے اُن کی جان پہچان تھی۔ اس کے علاوہ شاہد صاحب کے پھوپی زاد بھائی بھی تھے۔ کرنل مرحوم باوجود اس کے کہ ڈاکٹری علم و فضل میں کمال رکھتے تھے، ایک خاص نوع کے شعر کہنے کے عادی تھے، عریاں تخلّص کرتے تھے اور جوانی کا ہر پہلو اُن کی بے باک گفتگو اور شعروں کا موضوع بن جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت بڑے آدمی تھے، لیکن چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ مزے مزے کی باتیں کرنا اُن کا خاص وطیرہ تھا۔ خصوصاً نوجوانوں کی صحبت میں وہ اور ان کی صحبت میں نوجوان ہر قسم کی آزادی محسوس کرتے تھے۔ خود نیاز صاحب "شہوانیات" اور "جنسیات"

وغیرہ کے مفکر و مصنف ہیں، اس لیے شاہد صاحب نے مناسب سمجھا تھا کہ اس عصرانے میں ڈاکٹر صاحب بھی شریک ہوں۔ اب نیاز صاحب نے یہ غضب کیا کہ اُنھوں نے اس محفل میں شاہد صاحب سمیت، ہر متنفس کو نظر انداز کر دیا اور صرف ڈاکٹر صاحب کو لائق اعتنا سمجھا۔ شاید انھوں نے ان ادیبوں کو نوخیز اور شاعروں کو کم عمر سمجھ کر یہ ادا اختیار کی، مگر شاہد صاحب کو اس ادا میں تمکنت و تکبر محسوس ہوا۔ انھیں یہ بھی ناگوار گزرا کہ نیاز صاحب نے دیر سے آنے اور دوسرے مہمانوں کا وقت ضائع ہونے کی معذرت تک نہیں کی۔ خیر تھوڑی دیر تک انھوں نے اس ماحول کو برداشت کیا، اس اُمید میں کہ نیاز صاحب اب توجہ کرتے ہیں، اب توجہ کرتے ہیں۔ جب حد ہو گئی اور شاہد صاحب نے دیکھا کہ نیاز صاحب رُخ دے کر بات ہی نہیں کرتے تو اُن کا ناریل چٹخ گیا اور وہ مہمانوں سے یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے "چلیے، چائے کافی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔" چائے کا انتظام اُوپر کی منزل میں تھا۔ اُن کے احباب گویا اشارے کے منتظر تھے۔ دھب دھب کر کے سب تواضع کے کمرے میں چلے گئے۔ شاہد صاحب نے کچھ دیر وہاں بھی انتظار کیا، مگر جب نیاز صاحب کے متعلق اُن کو پکا یقین ہو گیا کہ خدا کا یہ منکر، بے نیازی میں خود خُدا بننے کی فکر میں ہے تو وہ سوختہ ہو گئے۔ مہمانوں کی اطمینان سے خاطر مدارت کی اور وہ شاہد احمد جو اتنی دیر سے دَم سادھے ہوئے تھے، ایک دم قندیل کی طرح منوّر ہو گئے۔ قہقہوں کا شور بلند ہو گیا۔ فقرے کسے جانے لگے، چُہلیں ہونے لگیں اور چائے ختم ہونے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو سدھارے، پھر شاہد صاحب نے فوراً ہی یہ انتظام کیا کہ نیاز صاحب صورتِ حال سے آگاہ ہو جائیں، چنانچہ اُنھیں خبر ہو گئی کہ جو عصرانہ ان کے اعزاز میں دیا

گیا تھا، وہ ان کی رعونت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اُن کو یہ بھی احساس دلا دیا گیا کہ جو لوگ یہاں اُن کی تعظیم و تکریم کرنے آئے تھے وہ اُن کے متعلق بڑی بُری رائے لے کر گئے ہیں۔ اسی لیے اِن لوگوں نے اُن سے رخصت ہونے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نیاز صاحب کو غالباً خیال نہیں رہا کہ کمان کی تانت حد سے زیادہ کھینچی جائے تو ٹوٹ بھی جاتی ہے۔ بہرحال جب اُنہیں احساس ہؤا تو شرمندہ ہوئے اور فضل حق قریشی کی معرفت، جو اُن کے معتقد ہیں، انہوں نے اظہارِ افسوس کیا۔ شاہد صاحب نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد نہ صرف یہ معذرت قبول کر لی بلکہ ایک دو روز ٹھہر کر یہ اہتمام کیا کہ نیاز کی عظمت کا کُشادہ دلی سے اعتراف کیا جائے، چناں چہ اُن کے ایما پر ہم سب نے اُن کی اس طرح پذیرائی کی گویا شاہد صاحب کے ہاں کچھ ہؤا ہی نہیں تھا۔

یہ واقعہ مَیں نے اس لیے بھی بیان کیا کہ اس سے جہاں شاہد صاحب کی انتقام پسندی ظاہر ہوتی ہے، وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ وسیع قلب کے مالک ہیں۔ کسی سے انہیں سخت شکایت ہو تو اس کے دُور ہونے کے بعد وہ اس کی طرف سے پہنچی ہوئی کوفت کو بھول بھی سکتے ہیں کہ کینہ پروری ان کا شیوہ نہیں۔ اس سلسلے میں دو واقعات ساقی کی زندگی میں بڑے اہم گزرے ہیں۔

ایک واقعہ "نیاز مندانِ لاہور" اور ساقی کے بعض مضمون نگاروں کا ہے۔ یہ ایک ادبی جنگ تھی جو "انار کلی" کے سلسلے میں ہوئی۔ "انار کلی" پر ساقی کی تنقیدیں سیّد امتیاز علی تاج کے حمائتیوں پر بڑی شاق گزریں اور انہوں نے ایک "نقاب پوش" ادیب کی سرکردگی میں ایک یونین کی داغ بیل ڈالی۔ اس یونین نے اپنا نام "نیاز مندانِ لاہور" رکھا اور ساقی اور شاہد احمد پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ اِدھر شاہد صاحب نے ایک جمعیت تیار کی جس کا ساتھ دینے کے لیے بڑے بڑے "لڑاکو" میدان

میں اُتر آئے۔ شاہد احمد اپنے احباب کے ساتھ مِل کر نت نئے جارحانہ حملوں کی تفصیل اور مخالفین کی پیش قدمیوں کے دندان شکن جواب سوچتے۔ نقادوں کے لیے مسالہ تیار کرتے اور ایک تجربے کار سپہ سالار کی طرح اپنے فوجیوں کو "جنگ کا نقشہ" سمجھا کر دادِ شجاعت دینے کی ہدایت کرتے۔ اس جنگ کی کمان تو خیر شاہد صاحب ہی کے ہاتھ میں تھی، لیکن ان کے سب سے بڑے آزمودہ کار اور چالاک جرنیل علامہ مُضحک تھے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا تھا۔ دونوں طرف کے لکھنے والے ایسی ایسی باتیں دماغ سے اُتارتے تھے کہ خدا کی پناہ۔ اصل موضوع سے ہٹ کر شخصی تذلیل نشانِ کامرانی بن گئی تھی۔ بال کی کھال نکال کر گولہ بارود تیار کیا جاتا تھا اور چوں کہ آتش بازی خوش منظر ہوتی ہے اس لیے اُس وقت دل کو بُھاتی تھی۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ محض نقد و تبصرے نے حد سے گزر کر ضد بحث کی شکل کیوں اختیار کر لی؟ لبوں کی مسکراہٹ بڑھتے بڑھتے ناگوار قہقہوں تک کیوں پہنچی؟ آتش بازی تھی نا آخر جس سے اُنگلیوں کے جل جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے! جیسا کہ جنگ کا قاعدہ ہے کہ چھڑ جائے تو پھر ہر چیز جائز ہو جاتی ہے، دونوں طرف سے اتنا کچھ کہا گیا کہ دونوں طرف تلخی ہو گئی اور جب علامہ مضحک نے نیازمندانِ لاہور کو "شلوارانِ ادب" کا خطاب دیا تو براہِ راست ذاتی حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اُن کی زد میں شاہد احمد اور امتیاز علی تاج آ گئے۔ خاص طور پر شاہد صاحب کے متعلق لاہور کے پرچوں میں ناگفتنی باتیں لکھی گئیں۔ "انار کلی" کا قصہ تو خیر ایک دن ختم ہو گیا، لیکن شاہد صاحب کے دل میں لاہور کے بعض اہلِ قلم کی طرف سے کدورت بیٹھ گئی اور لاہور کے بعض لکھنے والے شاہد صاحب سے سخت برگشتہ ہو گئے، البتہ امتیاز علی اور شاہد صاحب کے درمیان جو رنجش تھی وہ جلدی دُور ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ اس شورش کے بعد شاہد صاحب

لاہور گئے تو تاج صاحب نے اُن کو بڑی فراخ دلی اور محبت سے خوش آمدید کہا۔ شاہد صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے اور کسی موقعے پر اُنہوں نے مجھ سے امتیاز صاحب کے اخلاق کی بڑی تعریف کی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس سے جہاں تاج صاحب کی کشادہ دلی ظاہر ہوتی ہے وہاں شاہد صاحب کی وسعتِ قلب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دوسرا واقعہ "نیرنگِ خیال" لاہور کے مدیر حکیم یوسف حسن اور "نیرنگ" دہلی کے ایڈیٹر عشرت رحمانی کا ہے جنہوں نے ساقی کی روز افزوں ترقی دیکھ کر شاہد صاحب سے اُلجھنا ضروری سمجھا۔ یہ چپقلش دراصل پیشہ ورانہ حسد کا نتیجہ تھی۔ ساقی نے جب جوابی حملے شروع کیے تو دونوں تاب نہ لا سکے۔ "نیرنگ" تو خیر بچہ تھا، البتہ "نیرنگِ خیال" جس نے اپنے شاندار سالناموں کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کر لی تھی، کچھ دن تک پنجہ آزماتا رہا۔ صلح صفائی ہو جانے کے بعد شاہد صاحب نے ایک اداریے میں لکھا۔ "حکیم صاحب نے صلح کا ہاتھ بڑھایا تو ہم نے بھی بخوشی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔"

کراچی آنے سے قبل کوئی دس سال سے شاہد احمد کی روزانہ نشست "کتب خانۂ علم و ادب" پر ہوتی تھی جہاں سیّد وصی اشرف کتابوں کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ سرِ شام یہاں شاہد صاحب کے دوست احباب کا مجمع ہوتا تھا جن میں اخلاق احمد، ظفر قریشی، صلاح الدین، تابش دہلوی، محمد مرزا، حبیب اشعر اور اِن سطور کا راقم باقاعدہ آنے والوں میں تھے۔ مرزا فہیم بیگ چغتائی، انصار ناصری، آوارہ، فضل حق قریشی، جناب بیخود دہلوی اور نہال سیوہاروی گنڈے دار آتے تھے۔ شام کو سب سے پہلے آنے اور سب کے بعد جانے والے ایک بزرگ امیر صاحب تھے جنہوں نے "پیرِ مرد" کا خطاب پایا تھا۔ اِن کی تعریف یہ تھی کہ ہر موضوع پر گفتگو

کرتے تھے۔ تجربوں اور معلومات کا بحرِ بیکراں تھے۔ کسی موضوع پر ان کو واقفیت نہ ہوتی تو ایجاد کر لیتے، لیکن ہر بحث میں حصّہ لینا ضروری سمجھتے تھے۔ پہلے دوسروں کو خاموشی سے سُننا شروع کرتے۔ جُوں جُوں دوسرے زیادہ اظہارِ خیال کرتے، ان کی بے قراری بڑھتی جاتی یہاں تک کہ وہ "میدان" میں کُود پڑتے۔ ان کا عام انداز یہ ہوتا کہ تم کیا جانتے ہو؟ ہم جانتے ہیں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ ان کے دَم سے کافی تفریح رہتی تھی کُتب خانے پر۔ شاہد صاحب کے دوستوں کے علاوہ دلّی کے باذوق ادیب اور شاعر بھی وقتاً فوقتاً رونق افروز ہوتے تھے۔ باہر سے آنے والے ادباء و شعرا کے علاوہ لاہور، حیدر آباد اور لکھنؤ کے ممتاز ناشرین کا بھی یہاں آنا ہوتا تھا۔ مستقل آنے والوں کے لیے تو خیر یہ ایک نجی محفل ہوتی، لیکن دوسرے اور باہر سے آنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک طرح سے تہذیبی مجلس بن جاتی تھی، چوں کہ ان اصحاب کا زیادہ تر مقصد ملاقات ہوتا، اس لیے وہ ایک وقت میں بہت سے لوگوں سے ایک ہی جگہ مل لیتے تھے۔ خواہ مخواہ کی سنجیدہ اور کاروباری باتیں عام طور پر بار معلوم ہوتی تھیں اور ہر شخص اس سے احتراز کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ شام کی یہ صحبتیں ہلکے پھُلکے مباحثوں اور خوش وقتیوں کے لیے وقف تھیں۔ ہم یہاں کسی کی بُرائی کرنے جمع نہیں ہوتے تھے اور نہ کوئی ان محفلوں کی فضا اُداس ہونے دیتا تھا۔ یہاں آکر ہر شخص کو آزادی اور یگانگت محسوس ہوتی تھی۔ کوئی شخص کسی وجہ سے چند دن غیر حاضر ہوتا تو سب کو فکر لاحق ہو جاتی اور جب وہ کچھ عرصے بعد پھر نمودار ہوتا تو بے ساختہ اور برجستہ کلمات سے اس کا استقبال کیا جاتا تھا۔

شاہد صاحب عمر کے لحاظ سے ہم سب میں بڑے تھے، مگر ہم مذاقی اور دیرینہ رفاقت کی بنا پر آپس میں بے تکلّفی تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی اس صحبت میں بڑا اچھّا وقت

گزرتا۔ ہنسی مذاق، لطیفے، چٹکلے، فقرے اور پھبتیاں، سب ہی چیزیں اُس وقت جائز ہو جاتیں اور شاہد صاحب جنھیں "پیر مغاں" کا درجہ حاصل تھا، نت نئی پُھلجھڑیاں چھوڑتے چلے جاتے۔ یُوں اُن پر سنجیدہ بلکہ ناگوار حد تک سنجیدہ ہونے کا گمان گزرتا ہے، مگر جب بے تکلّف صحبت ہو تو وہ سراپا شگفتگی بن جاتے ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنی اور ساری محفل کو اپنی بذلہ سنجی سے مسحور کر لینے میں ان کو کمال حاصل ہے۔

شاہد صاحب کی شرافت اور مُروّت تو اُن معاملات سے عیاں ہے جو اُن سے اوپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی، بہزاد لکھنوی وغیرہ وغیرہ نے کیے۔ شاہد صاحب کتابوں کے مسوّدے خریدتے خریدتے عاجز آ گئے تھے، مگر مصنّفین سمجھتے تھے کہ شاہد صاحب مُنہ در مُنہ انکار تو کریں گے نہیں، اس لیے وہ کوئی نہ کوئی پینترا بدل کر شاہد صاحب کو سوفتے میں پکڑ لیتے۔ شاہد صاحب کا اُس وقت وہ حال ہوتا جو بند کمرے میں مظلوم چوہیا کا ہوتا ہے جس کے پیچھے بلّی پڑی ہوئی ہو۔ اس طرح شاہد صاحب کے پاس کتنے مسوّدے ہو گئے ہوں گے جو اُنھوں نے طوعاً و کرہاً خریدے؟ شاید اس کا حساب شاہد صاحب کو بھی نہیں معلوم۔ ذکر کُتب خانے کا تھا۔ جب یہ جگہ شاہد صاحب اور اُن کے دوستوں کا باقاعدہ بیٹھیا بن گئی تو یہاں ادبی چرچے بھی ہونے لگے۔ جو ادیب شاہد صاحب سے غیر رسمی ملاقات کرنی چاہتے یا جنھیں اپنا "شاہکار" پڑھ کر سُنانے کی خواہش ستاتی، وہ یہیں آتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم خود کسی ادیب کی زبان سے اس کا کلامِ نظم و نثر سُننے کی خواہش کرتے۔ چناں چہ اسی کُتب خانے پر "ہماری گلی" سُنایا گیا۔ یہیں "آگ" کا مسوّدہ کئی دن تک اس انتظار میں پڑا رہا کہ شاہد صاحب اسے سُن لیں یا کم از کم اسے پڑھ لیں اور ہو سکے تو خرید لیں۔ یہیں مرزا فہیم بیگ اپنی آوارہ مزاجی کے قصّے سُناتے تھے۔ یہیں محمد مرزا طرح طرح کے

پوز بنا کر مصطفےٰ کمال کو اپنا ثانی بتانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہیں مولویوں اور ادبی مجاوروں کا بخیہ اُدھیڑا جاتا تھا۔ خصوصاً اُس وقت سے جب مولانا مظہرالدّین نے ساقی میں مطبوعہ چند تصاویر پر اپنے اخبار "الامان" میں بے موقع اعتراضات کیے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں منٹو، شاہد صاحب سے مخاطب ہو کر دُون کی لیتا تھا۔ یہیں کرشن چندر، شاہد صاحب کی تلاش میں دبے پاؤں آتے تھے۔ یہ کُتب خانۂ علم و ادب تھا جہاں شاہد صاحب کی بارگاہ سے پیاروں کو مزے مزے کے خطابات ملتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے نزدیک دِلّی کا تختہ اُلٹ گیا۔ سب دوست منتشر ہو گئے۔ وہ محفلیں اُجڑ گئیں۔ وہ مسلسل قہقہے چہچہے ختم ہو گئے۔

مَیں شاہد صاحب کے "خلوت نشانِ راز" میں سے نہیں ہوں۔ مَیں اُن کے حلقۂ احباب میں کافی دیر بعد آیا۔ میری مُلاقات بھی اُن سے شروع شروع میں مختصر اور گاہے گاہے ہوتی تھی، لیکن جب ساقی میں میرے افسانے چھپنے شروع ہوئے اور مجھے شاہد صاحب سے کئی بار مِلنے کا اتّفاق ہُوا تو پتہ چلا کہ یہ بظاہر زاہد طبع اور خشک مزاج شخص تو بلا کا دِل چسپ اور بذلہ سنج ہے۔ یہ خشکی یہ بے رُخی دراصل ان کا اُوپری خول ہے جو نئے ملاقاتیوں اور دُور سے ملنے والوں کے لیے اُن پر آپ ہی آپ منڈھ جاتا ہے۔ یہ ایک دفعہ اُتر جائے تو شاہد احمد سراپا خلوص اور مجسّم ہمدردی ہیں۔ دوسرے کو سمجھنے کی اُن میں بڑی صلاحیت ہے اور لحاظ و مُروّت ان کا شیوہ ہے۔ جب ہماری دوستی ذرا پُرانی ہو گئی تو مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں اب تک ایک بڑی نعمت سے محروم تھا۔ ان کی معیّت میرے لیے نہ صرف باعثِ لُطف و انبساط ہوتی بلکہ وہ ادبی کاموں میں میری دل کھول کر رہنمائی بھی کرتے تھے۔

کالج سے واپسی پر میں وقتاً فوقتاً ان کے پاس جاتا تو وہ مضمون نگاروں سے خط و کتابت اور موصولہ مضامین میں گھرے ملتے ۔ اب ہماری ملاقاتیں رسمی نہیں رہی تھیں ، اس لیے سلام کا جواب سنجیدگی اور بیزاری سے نہیں ملتا تھا ، بلکہ مجھے دیکھ کر اُن کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی تھی اور وہ عینک میں سے جھانک کر کہتے "آیئے"۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور وہ پوچھتے "کہیئے آج کل کیا لکھ رہے ہیں ؟"

میں کوئی افسانہ لکھ رہا ہوتا تو اُس پر تبصرہ کرتے اور ساتھ میں یہ اشارہ کہ افسانہ ختم کر کے ساقی کے لیے بھیج دو ۔ شاہد صاحب کو اُس زمانے میں لکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا بڑا شوق تھا ۔ انگریزی کی بے شمار عمدہ تصانیف ان کی نظر سے گزر چکی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ دوسری زبانوں کے شہ پارے اُردو میں منتقل ہو جائیں ۔ وہ ترجمے کے اختصاصی ہیں اور مجھے ترجمے کا چسکا انہی نے لگایا تھا ۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے دو کتابیں (THAIS) اور (PILGRIM'S PROGRESS) پڑھنے کے لیے دیں ۔ کچھ دن بعد جب میں انہیں پڑھ چکا تو پوچھا " ان کو ترجمہ کرنے کی ہمت ہے ؟" اوّل تو اُس وقت تک مجھے ترجمے پر قدرت نہیں ہوئی تھی ، دوسرے اتنی بڑی کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنانا مجھے ناممکن نظر آیا ۔ شاہد صاحب کے پاس کتابوں کا ذخیرہ تھا اس میں ایک اُردو کی کتاب بھی تھی جسے دیکھ کر وہ ہنسا کرتے تھے اور بات نوکِ قلم تک آگئی تو سوچتا ہوں کہ لکھ بھی دُوں یہ کتاب "خوابِ ہستی" تھی جس کے مصنّف پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی ہیں ۔ کسی زمانے میں خوابِ ہستی اُردو کا بڑا ناول سمجھا جاتا تھا اور مرزا صاحب تو یقیناً ہمارے ادب کی ایک محترم ہستی ہیں ، مگر اس کے متعلق شاہد صاحب کے والد ڈپٹی بشیر الدین احمد نے اپنی جو رائے کتاب کے سرورق پر لکھی تھی ، وہ یہ ہے (NON SENSE) شاہد صاحب اس ریمارک

سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ اُنہوں نے اس کتاب کو بھی پڑھنے کا مجھ سے اصرار کیا اور جب میں نے یہ کتاب واپس کی تو اُنہوں نے اس کے متعلق میری رائے پُوچھی ——— لیکن ناول کے متعلق میری کیا رائے تھی، یہ مَیں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

شاہد صاحب کے ساتھ ربط ضبط بڑھنے کا ایک نتیجہ یہ ہوُا کہ مجھے پہلے ترجمہ کرنے کا شوق اور پھر عادت ہو گئی۔ اپنے ترجموں میں مجھے سب سے زیادہ "اسے عشق کہیں لے چل" پسند ہے۔ یہ ایک دل کش جاپانی ناول ہے جسے مَیں نے شاہد صاحب کے ایما پر ساقی کے جاپان نمبر کے لیے ترجمہ کیا تھا۔ طویل تحریروں سے میری طبیعت گھبراتی ہے۔ شاہد صاحب کی خوشنودی کے لیے مَیں نے اسے مکمّل کر کے ہی دَم لیا۔ یہ ناول بڑا رنگین اور سحر آگیں ہے۔ مجھے اس کے ترجمے کی اتنی داد ملی کہ میرا جی خوش ہو گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ طلوعِ آفتاب کی سرزمین کی یہ داستانِ محبت کبھی اُردو میں منتقل نہ ہوتی۔ اگر شاہد صاحب قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی نہ کرتے اور شدید اصرار و ترغیب کے ساتھ مجھ سے اسے مکمّل نہ کرا لیتے۔ شاہد صاحب کی بدَولت میرا ترجمہ کرنے کا شوق بہت بڑھ گیا تھا، لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ مَیں وبالِ جان سمجھنے لگا۔

باوجود اس کے کہ ترجمہ ایک فن ہے اور مَیں اسے ایک مشکل فن تصوّر کرتا ہوں، میرے خیال میں اس سے تن آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی کوئی چیز اپنی تخلیق کرنے سے جی چُرانے لگتا ہے، اور اس کی طبیعت یہی چاہتی ہے کہ کوئی ترجمہ کر کے قصّہ ختم کرو۔ فکر کرنے سے نجات مل گئی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ یہ ترجمہ بازی میرے اپنے لکھنے میں حائل ہو رہی ہے تو مَیں نے چاہا کہ اس لت کو چھوڑ دُوں

مگر اس لت نے مجھے نہیں چھوڑا۔ چوں کہ مجھے مطالعہ کا شوق تھا اس لیے جو بھی کوئی اچھّی چیز نظر پڑتی دل مچل جاتا کہ اسے جلدی سے اُردو میں منتقل کر دوں اور یہ جذبہ بعض دفعہ اتنا بڑھتا کہ میرے پڑھنے کی رفتار کم ہو جاتی اور خود لکھنا دوبھر معلوم ہونے لگتا۔ آخر خدا خدا کر کے مجھے اس شوق سے چھٹکارا ملا۔ میں نے شاہد صاحب کے لیے کئی افسانے لکھّے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ میرے جو افسانے مقبول ہوئے اُن میں سے اکثر ساقی ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ ان افسانوں سے متعلّق ایک واقعہ ایسا ہے جس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ شاہد صاحب کسی بڑی شخصیت سے مرعوب ہو کر اُسے یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اپنی بڑائی کے زعم میں اپنے آپ کو حکیم اور دوسروں کو کمتر سمجھے شاید ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء کے افسانہ نمبر میں میرا ایک افسانہ شائع ہُوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ "انگارے" جیسی کتابوں کے بعد ادیبوں کو کُھل کر کہنے کی نئی نئی آزادی مِلی تھی، بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ نئی پَود کے افسانہ نگاروں نے افسانے کو زندگی کے قریب لانے کے لیے عورت اور مرد کے تعلّقات اور ان کے جذبات و احساسات کو ذرا تفصیل سے بیان کرنے کی نئی نئی جسارت کی تھی۔ میرا یہ افسانہ شائع ہوّا تو ایک اُدھم مچ گیا۔ مولانا مودودی نے تو خیر اپنی کتاب "پردہ" میں اس کے متعلّق جو گوہر افشانی کی ہے وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں ہے، اس لیے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں، مگر معارف نے اس پر ایک طویل و بسیط تبصرہ کیا اور چند ایسی باتیں کہیں جو کم سے کم مولانا سیّد سلیمان ندوی اور اُن کے رُفقا کو زیب نہیں دیتی تھیں۔ ساقی کا اگلا پرچہ "دانتے کا جہنّم" نمبر تھا۔ شاہد صاحب کو دانتے کا "اِن فرنو" بہت پسند ہے۔ انہوں نے اُس حصّے کو جو دوزخ سے متعلّق ہے مولوی عنایت اللہ سے بطورِ خاص ترجمہ کروایا تھا اور حق یہ ہے

کہ مولوی صاحب مرحوم نے اس کا ترجمہ بھی بڑی کاوش سے نہایت اعلیٰ درجے کا کیا۔ شاہد صاحب نے اس ترجمے کو تمام وکمال ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع کیا اوران کا ارادہ تھا کہ وہ "نگاہِ اوّلیں" میں اس پر ایک مفصل مقالہ لکھیں گے۔ اب جو "معارف" نے ناحق لے دے کی تو شاہد صاحب خفا ہو گئے۔ مولویوں کے اندازِ فکر اور ان کے طریقۂ تنقید نے جو عام طور پر اس افسانے کے متعلق روا رکھا اُس نے اُنہیں چراغ پا کر دیا اور اُنہوں نے "جہنم نمبر" کا سارا اداریہ معارف کی تنقیص پر تنقید کی نذر کر دیا۔ اُنہوں نے اس پر تفصیلی اور سخت حرف گیری کی اور کہا کہ ہم خوش ہوتے اگر آپ اس افسانے پر معقولیت سے گفتگو کرتے۔ آپ کی بحث اس افسانے پر فنّی اعتبار سے ہوتی۔ آپ افسانہ نگار کی زبان و بیان کی غلطیاں نکالتے۔ آپ مذہبی نقطۂ نگاہ کے بجائے اسے ادبی لحاظ سے جانچتے.......... شاہد صاحب نے یہ مقالہ طیش میں آکر لکھا تھا، اس لیے مولانا سلیمان ندوی اس کی لپیٹ میں بُری طرح آ گئے اور چوں کہ شاہد صاحب نے سچّی باتیں صفائی سے اور نڈر ہو کر لکھی تھیں اس لیے کسی سے ان کا جواب بن نہ پڑا۔ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ شاہد صاحب نے "جہنّم نمبر" کی نگاہِ اوّلیں معارف اور مولانا مرحوم کے متعلّق وقف کر کے صرف میرے افسانے کی طرف داری نہیں کی تھی، بلکہ نئے ادب کی ایک اُبھرتی ہوئی تحریک کی حمایت میں کھڑے ہوتے تھے۔ اُنہوں نے بڑے بڑے بُتوں کو یاد دلایا تھا کہ آپ کو جا و بیجا تنقید کا حق نہیں پہنچتا۔ آپ جس دائرے میں رہتے ہیں وہ دُوسرا ہے۔ فن لازماً معلّمِ اخلاق نہیں ہوتا۔ عالمِ دین کو یہ خوش نہیں آتا کہ وہ ادبی محاسب بھی بن بیٹھے۔

شاہد احمد ادب میں قدامت اور جدّت دونوں کے مدّاح ہیں۔ اُنہوں

نے جہاں ہمارے کلاسیکی ادب کی بقا و نشر کا اہتمام کیا ہے، وہاں ادب میں نئے نئے تجربوں کو بھی اہمیت دی ہے۔ اسی لیے ساقی کے صفحات میں آپ کو بزرگوں کے پہلو بہ پہلو نئی پود کے ادیب اور شعراء ہمیشہ سے نظر آئیں گے۔ جب ۱۹۳۶ء کے آس پاس ادب میں تجدد کا غلغلہ بلند ہوا تو شاہد احمد "روشن خیال" ادیبوں کے نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسالیب بیان سے بڑے متاثر ہوئے اور جب ترقی پسند ادب کی تحریک نے آندھی کی طرح زور پکڑا تو انہوں نے اُسے خالصتاً ادبی تحریک سمجھ کر اس میں سرگرم حصہ لیا، بلکہ سجاد ظہیر کے ایما پر وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ترقی پسند رجحانات کا اُن پر اس قدر غلبہ ہوا کہ ایک دن اُنہوں نے ساقی کی لوح ہی بدل ڈالی اور بجائے اُس برتر و اعلیٰ کے جسے اُنہوں نے ابتدائے شعور سے رحمان و رحیم مانا اور جس کے نام سے وہ اپنے رسالے شروع کرنے میں برکت سمجھتے تھے، اُنہوں نے اُسے "بنامِ قوت و حیات" معنون کر دیا۔ یہ تہدیہ بڑا معنی خیز اور عظیم ذہنی انقلاب کا اعلان تھا۔ چناں چہ جب ترقی پسندی "زندگی کے حقائق" کا لبادہ اوڑھ کر تمام مکروہات سمیت نمودار ہوئی تو شاہد احمد بھی اس کی رَو میں بہہ گئے۔ ترقی پسند ادب کے نام سے ساقی میں عُریاں و فحش چیزیں کثرت سے چھپیں۔ اسلامی تہذیب اور قدیم معاشرتی اقدار کے پہلو بہ پہلو جوان بلکہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی بے باکی اور گستاخیوں کو بھی روا رکھا گیا

——— لیکن ان تمام باتوں کے باوجود، ان تمام جھگڑوں کے باوجود، اِس تمام تمسخر و استہزا کے باوجود میں دیکھتا تھا کہ شاہد احمد دل ہی دل میں خُدا سے خائف ہیں۔ جب جمعہ کے روز مؤذن ظہر کی اذان دیتا تو وہ سب خرافات چھوڑ چھاڑ مسجد کا رُخ کرتے تھے۔

شاہد احمد گفتار کے غازی نہیں ہیں۔ زبانی بحث مباحثے سے ان کا جی اُکتاتا ہے، لیکن قلم کے وہ دھنی ہیں۔ مضمون و انشا، تنقید و ترجمہ، مکتوب نویسی اور پاسخ نگاری ہیں ان کا قلم کترنی کی طرح چلتا ہے۔ ان کی تحریر برجستہ، بے تکلّف اور بے تکان ہے۔ نقد و تبصرے کا میدان ہو، مدح و ہجو کا باب ہو، موسیقی پر اظہارِ خیال کریں، کسی علمی موضوع پر مقالہ لکھیں، انگارۂ تشخّص مُرتّب کرنا ہو، دِلّی کی رپورتاژ بیان کرنی منظور ہے، تو پھر دیکھیے کیا کمال دکھاتے ہیں۔ سارا مضمون ایک خطّۂ گلزار بن جاتا ہے۔ خیال سیلاب کی مانند اُمنڈا چلا آتا ہے۔ بیان کی خوبی براہِ راست دل پر اثر کرتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب ایسا ہوتا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ترجمہ ہو تو مولوی عنایت اللہ، ڈاکٹر عابد حسین اور مولانا ظفر علی خاں کا ہم رتبہ و ہم پایہ۔

ساقی اور ساقی بُک ڈپو کے جم جانے کے بعد شاہد صاحب کو فراغت ہو گئی۔ فرصت کے رات دن دیکھ کر وہ پھر موسیقی کی طرف مائل ہوئے۔ اُستادوں کی صحبت اور صبح شام کی محنت سے انہوں نے اپنے شوق کو خوب جِلا دی اور جیسا کہ ڈر تھا وہ خود ایک دن گانے کے اُستاد بن کر ہمارے مطلب کے نہیں رہے۔ ہلکے پُھلکے گانے، ہارمونیم کی صداکاری، تال کے کمالات۔ اِن سب کو انہوں نے یک لخت چھوڑ دیا۔ پکّا گانا (اتنا پکّا کہ اب کیا کہوں)، اُن کی عادت بن گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ساتھیوں میں ادیبوں اور شاعروں کی تعداد بہت کم ہو گئی۔

شاہد صاحب گانے کے ایسے رسیا ہوئے کہ اُن کو اب ادب کی بجائے موسیقی کا نشہ چڑھنے لگا اور وہ ایک عمدہ غزل کی بجائے ایک پُر پیچ راگ پر سر دُھننے لگے۔ چُناں چہ اُن کے نظامِ عمل میں تبدیلی آ گئی۔ اُن کا ماحول بدل گیا اور اُن کی مصروفیات

دوسری قسم کی ہوگئیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دَورانِ جنگ اور اس کے بعد ساقی کے معیار میں جو فرق آیا اس کی وجہ شاہد صاحب کے مزاج کی تبدیلی ہے یا ادیبوں کی قلتِ ماہیت، میرے نزدیک تو ساقی کی ترقی و انحطاط خود ہمارے ادب کے کمال وزوال کی داستان ہے۔ ممکن ہے شاہد صاحب بھی اس کے ذمّہ دار ہوں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب ادب سونے چاندی کا محتاج ہو جائے، فن سرپرستی کا آسرا ڈھونڈنے لگے تو اُس کی راہ بلندی سے پستی کی طرف چلی جاتی ہے۔ جنگ کے زمانے میں ہمارے کتنے ہی ادیب اور شاعر قلم کاغذ چھوڑ چھاڑ کر سرکاری ملازمتوں اور تجارتوں میں لگ گئے۔ ان کو بھوک زیادہ لگنے لگی اور ان کے میلانات میں بڑا انقلاب آگیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ پیٹ کی طلب کے آگے ذہن مُنہ تکتا رہ گیا اور ادب کو آگے بڑھانے والوں میں زیادہ تر دوسرے دُوسرے درجے کے لکھنے والے رہ گئے۔ ان حالات میں، مَیں شاہد احمد اور اُن کے ساتھ دوسرے مدیرانِ رسائل کو بھی داد کا مستحق سمجھتا ہوں جنہوں نے ادیبوں کی کمیابی کے باوجود اچھا ادب پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔ مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ شاہد احمد گانے بجانے میں ایسے مشغول ہوئے کہ بظاہر ساقی ان کی پُوری توجّہ سے محروم ہو گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ شاہد احمد "ساقی" کے لیے نئی نئی راہیں سوچا کرتے تھے اور دوسروں کی نقّالی کو اُنھوں نے بھی گوارا نہیں کیا۔ اگر "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" سالنامہ اور خاص نمبر نکالا کرتے تھے تو اُنھوں نے ان دولیبلوں کو اپنے لیے طرّۂ امتیاز نہیں بنایا۔ "ستارہ می شکنم آفتاب می سازم" ان کا شروع سے اصول ہے، چناں چہ اُنھوں نے دو کی بجائے سال میں چار خصوصی اشاعتیں (جنوری میں سالگرہ نمبر۔ اپریل میں

ظرافت نمبر۔ جولائی میں افسانہ نمبر۔ اکتوبر میں دلّی نمبر) پیش کیں۔ اسی پر بس نہیں ، موقع موقع سے ان کے علاوہ بھی اُنہوں نے کئی خاص نمبر اختراع کیے۔ جہنّم نمبر ، چغتائی نمبر، میر ناصر علی نمبر وغیرہ وغیرہ ان کے حوصلوں اور کارگزاریوں کی نمایاں مثال ہیں۔ افسانہ نمبر کے لیے ایک دفعہ اُنہیں یہ اُپچ سُوجھی کہ ایک ہی پلاٹ پر اُنہوں نے مختلف افسانہ نگاروں سے افسانے لکھوائے۔ ظرافت نمبر کو وسعت دے کر طنز و مزاح نمبر نکالنا شروع کیا...... غرض اُنہوں نے ادبی رسائل کے لیے بہت سے نئے چراغ روشن کیے اور —— ایک یہ زمانہ ہے کہ شاہد صاحب کو ساقی کی نگاہِ اوّلیں لکھنے میں تکلّف ہوتا ہے۔ سوچتے ہیں کوئی کامی ادیب "مہمان مدیر" بن کر کسی اشاعت کا بار سنبھال لے تو اچھّا ہے۔ ادب سے فرصت ہو تو ذرا اور ریاض کا موقع ملے!

ریڈیو شاہد احمد کی زندگی میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ کوئی ان کے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے بیٹھے تو اِس محکمے سے اہم تعلّق کا ذکر ضرور آجاتا ہے۔ تعلّق، ایک حد تک رنجدہ ہے کیوں کہ وہ مشغلہ جو پہلے ان کی تفریح کا باعث تھا اب ان کا ذریعۂ معاش بن گیا ہے۔ شاید یہ سب کو معلوم بھی نہ ہو کہ دِلّی میں شاہد احمد نے ریڈیو سے ابتداً کچھ نہیں کمایا۔ وہ ریڈیو پر شوقیہ جاتے تھے اور اُنہوں نے اپنا نام 'ایس احمد' رکھ لیا تھا۔ ریڈیو کے قواعد کے مطابق ہر گانے والے کو معاوضہ دیا جاتا ہے ، مگر چوُں کہ گانا شاہد صاحب کا پیشہ نہیں تھا اس لیے وہ اُس کا معاوضہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوئے ، لیکن جب حالات بدل گئے تو انہوں نے بادِلِ نخواستہ ریڈیو سے گانے کی فیس قبول کر لی۔ اس کے علاوہ ریڈیو کے رسالے میں ان کی تصویر

بھی ایک موسیقار کی حیثیت سے اور انہی کے نام سے چھپی۔ جب میں نے اُس تصویر کو دیکھا تو میری نظروں میں قاضی نذرالاسلام کی تصویر پھر گئی جو تقسیم ہند سے قبل ریڈیو کے رسالے میں اس طرح شائع ہوئی تھی کہ قاضی صاحب طبلہ بجا رہے ہیں۔ یہ قاضی صاحب کون ہیں؟ وہی نذرالاسلام جس کی شاعری ڈنکے کی چوٹ اور شیر کی للکار ہے، وہی عظیم المرتبت فن کار جسے شاعرِ انقلاب اور شباب کا پیامی کہا جاتا ہے۔ وہی عیر فانی "بدروہی کوی" جس نے اپنے نغموں سے آزادی کا صُور پھُونکا، مگر ریڈیو والوں نے جس کے سربراہ ادیب اور ادیب نواز مشہور تھے، اُسے محض ایک طبلچی کی حیثیت سے پیش کیا! اسی لیے کہ قوم نے اُس کی قدر نہیں کی اور وہ نانِ جویں حاصل کرنے کے لیے شعر گوئی کی بجائے طبلے کو اپنا کشکول بنانے پر مجبور رہا۔ میرا مقصد شاہد احمد اور نذرالاسلام کا موازنہ کرنا نہیں ہے۔ میں یہ پوچھنا بھی نہیں چاہتا کہ ریڈیو کے محکمے نے نذرالاسلام یا شاہد احمد کو ایک بڑا شاعر اور ایک ممتاز ادیب ہوتے ہوئے ایک سازندے یا ایک مغنّی کی طرح کیوں پیش کیا؟ اگر وہ ان کے ہاں اسی حیثیت سے آتے ہیں تو ایک کاروباری ادارے کی طرح ان کو حق ہے کہ وہ اپنے فن کاروں کو ذریعہ بنا کر اپنی تشہیر کریں، لیکن جو چیز ایک اہم سوال بن کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا ادب یہ کیسے گوارا کر لیتا ہے کہ اس کے محترم افراد، ادیب اور شاعر کی حیثیت کی بجائے اُس رُوپ میں نظر آئیں جو پیشے کے اعتبار سے معزّز نہیں سمجھا جاتا۔ موسیقی یقیناً ایک فن ہے مگر چُوں کہ ہماری معاشرت میں طبلچیوں اور گویّوں کو محترم نہیں سمجھا جاتا اس وجہ سے قاضی نذرالاسلام کو طبلہ بجانے یا شاہد احمد کو تان پورہ ہاتھ میں لیے گاتے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ یہ افسوس بالکل واضح ہو جائے گا جب آپ تصوّر سے کام لے کر کسی بھی بڑے شاعر، حکیم، فلسفی یا ادیب کو

مجیرے بجاتے یا پیشہ ورانہ گاتے دیکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے احساسات کو اس تصوّر سے ٹھیس لگے گی۔

شاہد احمد امیر ابن امیر، کبیر ابن کبیر ہیں۔ ان کے والد (ڈپٹی بشیرالدین احمد) اور دادا (ڈپٹی نذیر احمد) نے ہزاروں روپے ماہوار کمائے اور لاکھوں روپے ورثے میں چھوڑے، لیکن شاہد صاحب کے مزاج میں حد سے زیادہ عجز اور مسکینی ہے۔ اُنھوں نے اپنی امارت سے مطلق فائدہ نہیں اُٹھایا۔ وہ پُرانی چال کے آدمی ہیں۔ اُن کا رہن سہن، ان کی وضع قطع، اُن کا کھانا پینا، اُن کی دلچسپیاں اور مشاغل بالکل سادہ، بلکہ کہنا چاہیئے غریبوں کے سے ہیں۔ دولت نے اُن کو مغرور نہیں بنایا، بلکہ محروم ہی کیا ہے۔ وہ اپنی ذات پر اِتنا بھی خرچ نہیں کرتے جتنا ایک متوسّط درجے کا آدمی اپنے اُوپر خرچ کر لیتا ہے۔

شاہد احمد دلّی سے سچ مچ لُٹ کر آئے، لیکن یہ چیز اُن کے لیے کسوٹی بن گئی ہے۔ وہ دل ہی دل میں ضرور مغموم ہوتے ہوں گے۔ اُنھیں اپنے آبائی مکان اور ذاتی آسائشوں کا ضرور خیال آتا ہوگا، لیکن مَیں نے ان کو ہراساں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ راضی بہ رضا رہتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ نئی مملکت میں باعزّت زندگی گزارنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانا ضروری ہوتا ہے۔ پانی پینے کے لیے کنواں کھودنے کی ضرورت ہے۔ اُنھیں سیر ہو کر پینے کے لیے پانی نہیں ملا، تو وہ سمجھتے ہیں کہ خود ان کے دست و بازو میں قوّت کی کمی ہے، خود ان کی طبیعت ان کو بعض کام نہیں کرنے دیتی، لیکن ناکامی کی صورت میں وہ پاکستان کو بُرا بھلا نہیں کہتے۔ اُٹھتے بیٹھتے اپنی تباہی کے چرچے نہیں کرتے۔ دوستوں کے لیے اپنی پریشانیوں کی محفل نہیں سجاتے۔ دوسروں کی بہتری سے اُن کا دِل مَیلا نہیں ہوتا۔ اُن لوگوں کی امیری سے جو ہندوستان میں غریب تھے،

اُنہیں شکایت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں جب قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں تو عروج وزوال کے نقشے ہوتے ہیں۔ کوئی لُٹ جاتا ہے اور کسی کے ہاں سونے کی ریل پیل ہوجاتی ہے۔ جو ہمّت ہار کر بیٹھ گیا، جس نے پدرم سلطان بود کا سہارا لیا اُسے ناکامی کا گلہ زیب نہیں دیتا۔ اس وقت تو ہر شخص کو محنت ومشقت کرنی چاہیئے۔ زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے۔ گنگا ہر شخص کے گھر آکر نہیں بہتی۔ ہمّت اور حوصلہ ہے تو آگے بڑھ کر اُس کا رُخ اپنی طرف موڑ لینا چاہیے۔

شاہد احمد کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی دونوں میں شدّت ہے۔ اگر وہ کسی کو پسند کرتے ہیں تو اُنہیں اُس کے عیوب نظر نہیں آتے۔ اگر آتے بھی ہیں تو وہ اُنہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی حال اُن کی ناپسندیدگی کا ہے۔ اگر وہ کسی کو اچھا نہیں سمجھتے تو اُنہیں اُس کی کوئی خوبی نہیں بھاتی بلکہ اس کی خامیاں ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہیں۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ ان کے ممدوح کو علم نہ ہونے پائے کہ شاہد احمد اس کی خوبیوں کے معترف ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس شخص کو وہ بُرا سمجھتے ہیں اُس پر ان کے خیالات کسی نہ کسی طرح ضرور آشکار ہو جاتے ہیں۔ شاہد احمد کو سیاست اور زمانہ سازی نہیں آتی۔ زمانے کی رفتار کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی وہ اس کے تقاضوں کو پُورا نہیں کرتے۔ اگر وہ کسی شخص سے بیزار ہیں یا اس کی بُرائیاں ان پر اثر انداز ہو رہی ہیں تو وہ اس کو چھپا نہیں سکتے اور اس دَوران میں وہ مصلحتاً بھی اُس شخص سے مصالحت کرنے کے لیے تیّار نہیں ہوتے۔ بس بھنویں تن جاتی ہیں اور وہ انجام سے بے پروا ہو کر نبرد آزمائی کے لیے تیّار ہو جاتے ہیں۔ دِلّی بچھڑنے سے پہلے شاہد احمد کو بہت کم شکستیں ہوئیں اور جو ہوئیں بھی ان کو وہ خاطر میں نہیں لاتے، لیکن پاکستان آکر اُن کو پے درپے ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا اور

ہر ہزیمت ان کی پیشانی پر اپنا نشان چھوڑ گئی۔

شاہد احمد اپنے خاندانی وقار اور ذاتی اوصاف کی وجہ سے کمیاب شخصیتوں میں سے ہیں، مگر ان کی وہ قدر نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے مدیر ساقی کی حیثیت سے جو دشمن پیدا کیے ہیں وہ قوی ہیں۔ یہ دشمن کھل کر دشمنی نہیں کرتے، کیوں کہ ظاہر میں وہ اُن کے دوست اور ہمدرد ہیں۔ ملتے ہیں تو اُن کے گُن گانے لگتے ہیں، لیکن اُن کی پیٹھ پیچھے وہ سب کچھ کہتے اور کر گزرتے ہیں جو ان کے دل میں ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ لوگ دل میں شاہد احمد کی صلاحیتوں کے معترف ہیں، لیکن وہ اُس زخم کو نہیں بھولتے جو ساقی کے صفحات نے اُن کے پندار کو لگایا تھا۔ شاہد احمد سے انھیں انتقام لینے کا اِس سے بہتر موقع اور کون سا مل سکتا تھا۔

ساقی شاہد صاحب کی زندگی کا لہو ہے۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے شروع میں اسے محض شوق کی خاطر جاری کیا تھا مگر اب وہ ان کی رگ رگ میں رچا ہوا ہے۔ ساقی اُن کے عنفوانِ شباب کا رفیق اور اُن کا ہمدم و ہمراز ہے۔

پاکستان میں ساقی نے گویا دوسرا جنم لیا۔ شاہد صاحب نے ساقی بُک ڈپو کو ترتیب دینے کی دوبارہ سعی کی مگر تھوڑی ہی مدّت میں ان کو معلوم ہو گیا کہ اس مُلک میں تو اُردو کا خدا ہی حافظ ہے۔ اُدھر ہندوستان سے، جہاں اُردو کا کاروبار اس وقت وسیع و وافر تھا، مالی لین دین پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہد صاحب جو یہاں ایک نئے ولولے کے ساتھ اُردو ادب کا پرچم لہرانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔ ان کا کاروبار

تھک گیا، کتابوں کی اشاعت اور فروخت سرد پڑ گئی اور اگر ساقی سے ان کو دِلی تعلق نہ ہوتا تو شاید وہ اس کا "موت نمبر" نکال کر اسے بھی ختم کر چکے ہوتے۔ جن دنوں شاہد صاحب اِن حالات سے دوچار تھے، اُنہوں نے مجھے ایک خط کے دَوران میں لکھا:۔

"حال یہ ہے کہ آمدنی کی کوئی صورت نہیں اور خرچ پانچ سو روپے ماہوار سے کم کا نہیں ہے ——— سے روپیہ منگا کر کھا رہا ہوں۔ دلّی سے کتابیں آ جائیں (کوئی اُمّید جلدی کی نہیں ہے) تو کچھ کام چلے۔ بینک ڈوبا پڑا ہے۔ جائیداد کا ایک پیسہ وصول نہیں ہوا اور کرایہ وصول کرنے والا منشی چھے ہزار روپے لے کر روپوش ہو گیا، اب ازسرِ نو زندگی بنانی پڑے گی۔ اس کے لیے جدّوجہد کر رہا ہوں"

شاہد صاحب نے ازسرِ نو زندگی بنانے کے لیے واقعی جدّوجہد کی ہے۔ وہ اُن نارکانِ وطن میں سے ہیں جو نئے وطن کو صحیح معنوں میں اپنا وطن سمجھتے ہیں اور جس کی صبح کو اُنہوں نے صدق دل سے خوش آمدید کہا ہے۔ وہ اپنی طرف سے اس وطن کو سب کچھ دینا چاہتے ہیں، مگر اس سے طلب کچھ نہیں کرتے۔ وہ وطن پر بار نہ ہوں، بس یہی اُن کی تمنّا ہے۔ اپنی روزی ایمان داری سے کمانے کے لیے وہ صبح سے شام تک اور اکثر راتوں کو بھی محنت مشقّت کرتے ہیں اور یُوں وہ خودداری اور وقار کے ساتھ گاڑھے پسینے کی کمائی سے اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ شاہد صاحب جس امتحان سے گزر رہے ہیں وہ بڑا صبر آزما اور حوصلہ شکن ہے، مگر اس دَورِ ابتلا میں بھی اُن کا توازن قائم ہے۔ اتنی مایوسیوں اور محرومیوں کے بعد،

ان کے مزاج میں تلخی یا پژمردگی آجاتی تو کوئی تعجب نہ ہوتا، مگر نہیں۔ ان کی طبیعت کی شگفتگی برقرار ہے اور اپنی بزم میں تو وہ بھی انار کی مانند کھل کھلا کر ہنستے ہیں —— یہ اور بات ہے کہ یہ انار آتش بازی کا ہے جس کا دل اندر سے فردہ و کشتہ ہے!

عجب آزاد مرد تھا

بہزاد لکھنوی

شاہد احمد دہلوی مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ مَیں اُس زمانے میں نیا نیا آل انڈیا ریڈیو (دہلی) میں ملازم ہوا تھا۔ اُن سے مُلاقات بھی عجیب عنوان سے ہوئی۔ مجھے ایک صاحب (نام یاد نہیں) اُردو بازار لے گئے جہاں کُتب خانۂ علم و ادب تھا اور جس کے مالک وصی اشرف صاحب تھے۔ مغرب ہو چکی تھی جب وہ مجھے لیے ہوئے کُتب خانے میں پہنچے۔ وہاں چھ سات آدمی کُرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان صاحب نے مجھے لے جا کر میرا تعارف اُن حضرات سے کرایا۔ سب کے سب جس خلوص اور محبّت کے ساتھ ملے، میں بیان نہیں کر سکتا۔ اُن میں سب سے زیادہ گرم جوشی جن صاحب نے دکھائی، وہ جناب شاہد احمد دہلوی مرحوم تھے۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے اُس وقت جناب ظفر قریشی، جناب عشرت رحمانی، جناب اکبر حیدری، جناب یوسف بُخاری، جناب اشرف صبوحی تھے۔ چائے آئی۔ چائے کے بعد مجھ سے کلام سُنانے کی فرمائش ہوئی۔ مَیں نے پڑھا اور حقیقی داد سے نوازا گیا۔ یہ پہلا تعارف تھا اور

بہت کافی تعارف تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی پڑھا لکھا ایسی صحیح صحبت سے کیونکر دُور رہ سکتا تھا۔ عام طور پر ہر شام میری حاضری اس کُتب خانے میں ضروری ہو گئی۔ مجھے وہاں ان احباب اور اہلِ ادب کے ساتھ جو کیف ملتا تھا، اُس کا جواب نہیں تھا۔ مزاح بھی ہوتا تھا لطیفہ گوئی بھی۔ شعر اور قوّالی بھی ہوتی تھی اور افسانہ خوانی بھی۔ ہر شخص دِل کھول کر گفتگو کرتا تھا۔ باوجود انتہائی بے تکلفی کے مَیں نے کبھی ان حضرات کو دائرۂ ادب سے باہر قدم اُٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حضرت شاہد دہلوی مرحوم ان سب میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ مَیں اُن کی علمیّت، وسعتِ مطالعہ، بالغ نظری اور معاملہ فہمی کا قائل ہوتا چلا گیا۔ وہ تنقید کرتے تھے، لیکن تنقید برائے تنقید ہوتی تھی۔ اس تنقید میں کبھی ذاتی پہلو اور ذاتی معاملات درمیان میں نہیں لائے جاتے تھے۔

مرحوم نے اسی کُتب خانے میں مجھ سے میری غزلوں کا مسوّدہ لیا اور شائع کیا۔ ”نغمۂ نُور“ میرا پہلا مجموعہ تھا جو حضرت شاہد احمد دہلوی کی کاوشوں سے منظرِ عام پر آکر نہایت مقبول ہوا۔ حضرت شاہد احمد کا معاملات کے عالم میں بھی جواب نہیں تھا۔ پیسہ دینے میں کھرے اور وقت اور وعدے کے بے حد پابند تھے۔ اسی زمانے میں ”ساقی“ کے ایک نمبر میں اُنھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے افسران اور کارکنوں پر ایک تنقیدی مضمون لکھا اور نام بہ نام ان کے نقائص اور ان کی غلط پالیسی کو اُجاگر کیا۔

مجھے یاد ہے اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو میں کھلبلی مچ گئی۔ مضمون میں وہ واقعات بھی موجود تھے جو صیغۂ راز میں سمجھے جاتے تھے؛ چنانچہ عام طور پر افسران کو شُبہ میری ذات پر ہُوا کہ میں اِن رازوں کو شاہد صاحب تک پہنچانے کا

ذمے دار ہوں۔ مجھ سے خود تو کسی نے کچھ نہ کہا، لیکن اندر ہی اندر کھچڑی پکنا شروع ہوئی۔ مجھ تک بھی خبریں پہنچ گئیں، لیکن مجھے پریشانی یوں نہیں تھی کہ بحمد للہ اُس دَور میں مشاعروں میں میری اتنی مانگ تھی کہ ریڈیو کی تنخواہ اس کا پاسنگ بھی نہ تھی۔

خدا جانے کیوں کر شاہد احمد کو اس کی خبر پہنچ گئی۔ مَیں نے تو خود کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگلے ماہ کے مضمون میں جہاں بقیہ افسران پر تنقید کی گئی وہاں مجھ پر بھی تنقید تھی اور بڑے سخت انداز میں۔ اس مضمون کے نکلنے کے بعد میری ذات شبہے سے بالاتر قرار پا گئی اور مَیں ریڈیو والوں کی نگاہ میں ملزم نہ رہا۔ ملاقات ہوئی تو شاہد صاحب نے مجھ سے معافی مانگتے ہوئے کہا:

"بہزاد صاحب، مَیں مجبور تھا۔ اگر آپ پر نہ لکھتا تو آپ ریڈیو والوں کی زد میں آجاتے۔ میرا تو وہ کچھ کر نہیں سکتے ہیں۔"

اس تنقید کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا ریڈیو اسٹاف کی وہ واجد علی شاہی وہ مطلق العنانی ختم ہوگئی۔

دہلی واقعی ادب کا گہوارہ تھا۔ ہر مذاق اور ہر طبیعت والے کے لیے ایک بیٹھک وہاں کا معمول تھا جہاں شام کے وقت لوگ لازماً جمع ہوتے تھے۔ کُتب خانۂ علم و ادب ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھک تھی۔ شاہد صاحب کے ذوقِ موسیقی کا علم مجھے قیامِ دہلی کے دَوران قطعاً نہیں ہو سکا۔ وہ مجھ پر بے حد مہربان تھے۔ انہوں نے میرے چار مجموعے یکے بعد دیگرے شائع کیے۔ نغمۂ نور، کیف و سرور، موجِ طُور اور چراغِ طُور۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک عام طور پر میری نشست اُنہی کے ساتھ رہتی تھی۔ اُن کی صحبت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ شام ہوتے ہی بے اختیار پاؤں جامع مسجد کی طرف اُٹھ جایا کرتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب مَیں ریڈیو سے علیٰحدہ ہونے لگا اور مَیں نے

پنچولی فلم کمپنی سے معاہدے کا ارادہ کیا تو جناب شاہد احمد دہلوی نے مجھے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اُن کے دلائل بے حد قوی تھے، لیکن ہائے پیسہ۔ مَیں نے ریڈیو چھوڑ کر فلمی زندگی اختیار کر لی۔ کاش مَیں دہلی نہ چھوڑتا۔

۱۹۴۳ء کے بعد حضرت شاہد احمد دہلوی سے میری ملاقات ۱۹۵۱ء میں ریڈیو پاکستان کراچی میں ہوئی جہاں مَیں ملازمت کے سلسلے میں وابستہ ہو گیا تھا۔ میں پاکستان آیا تو ۱۹۵۰ء میں تھا، لیکن ایک سال بیکار رہنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں ملازم ہوا۔ شاہد صاحب بھی ریڈیو ہی میں ملازم تھے، لیکن ۱۹۴۳ء میں جس شاہد احمد دہلوی سے میری صحبتیں رہتی تھیں، وہ یہاں نہ تھا۔ عمر کے آثار کے ساتھ ساتھ مَیں نے اُن میں وہ شگفتگی بھی نہیں دیکھی۔ یہاں وہ محکمۂ موسیقی سے منسلک تھے اور یہیں آکر مجھے معلوم ہوا کہ وہ موسیقی کے ماہر ترین آدمی ہیں۔ قاری عباس حسین مرحوم بھی میرے ساتھ ہی ملازم تھے جن کے پاس شاہد صاحب آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

ریڈیو کی ملازمت کے دَوران مَیں نے دیکھا کہ شاہد صاحب کا قلم ہمہ رنگ لکھ رہا ہے۔ علاوہ موسیقی کے وہ ریڈیو کے لیے مختلف فیچر بھی لکھتے تھے اور مجھے حیرت یہ ہوتی تھی کہ وہ ہر رنگ پر قادر رہتے۔ ادبی ہو یا تحقیقی، رنگین ہو یا مذہبی، ان کا قلم ہر موضوع پر یکساں چلتا تھا۔ بعض اوقات مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ اگر ریڈیو کو فوری لکھوانے کی ضرورت ہوئی تو سوائے شاہد احمد دہلوی کے اور کوئی ادیب نہ لکھ سکا۔ مَیں نے اُن کا گانا بھی سُنا۔ فنِ موسیقی سے قطعی نابلد ہوں، لیکن آپ یقین مانیں مجھے اُن کا گانا سُن کر بڑا کیف حاصل ہوتا تھا۔ وہ ریڈیو میں موسیقی کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ مَیں نے وہ پروگرام بھی سُنے ہیں اور ان کے طریقۂ تعلیم کے متعلق اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اُنہوں نے موسیقی کو بے حد سہل انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔

۱۹۶۳ء میں جب ریڈیو والوں نے مجھے لال جھنڈی سے سرفراز فرمایا بغیر کسی سبب اور بغیر کسی وجہ کے تو جناب شاہد احمد دہلوی مرحوم ہی کی ایک ذات تھی جس نے اُس وقت میری موافقت میں انتہائی کاوش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ریڈیو والوں کی واجد علی شاہی کے سامنے نہ چل سکی۔

۱۹۶۳ء کے بعد غالباً دو ایک بار حضرت شاہد احمد دہلوی سے میری مُلاقات سرسری طور پر ریڈیو اسٹیشن میں ہوئی اور بس۔ اُن کے انتقال کی خبر سُن کر میں حیران رہ گیا۔ ایک بڑا مُصنّف اور صحیح ادیب اس دُنیا سے اُٹھ گیا ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بیادِ شاہد

احمد ندیم قاسمی

لاہور کے ادبی اور تہذیبی حلقے اُداس ہیں کہ ان سے اُن کا شاہد احمد چھن گیا۔ شاہد احمد جیسے دِلّی کے تھے، اسی طرح کراچی اور ڈھاکہ اور لاہور کے بھی تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ یقیناً دہلوی لکھتے تھے اور یہ لفظ انہیں بجتا بھی تھا کہ انہوں نے دِلّی سے جُدا ہو کر بھی دِلّی کی تہذیب، وہاں کی وضعداری، وہاں کی نجابت کو زندہ رکھا، مگر وہ دہلوی ہو کر بھی برِّ صغیر پاک و ہند کے ان تمام خطّوں کے شاہد احمد تھے جہاں اُردو لکھی، بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کراچی کے ایک اخبار نے بالکل درست لکھا ہے کہ شاہد احمد کا انتقال ہمارے درمیان سے اس نسل کے رخصت ہونے کا نقطۂ آغاز ہے جو پطرس اور تاثیر کے بعد دُنیائے ادب پر اب تک حکمران رہی۔

میں نے اپنے شعر و افسانہ کی اشاعت کا آغاز لاہور کے رسالوں (رومان، شاہکار، ادبی دُنیا، ہمایوں) سے کیا، مگر فوراً بعد ساقی میں بھی چھپنے لگا کہ اُن دنوں کسی شاعر یا ادیب کا ساقی میں شائع ہونا بڑی عزّت کی بات سمجھا جاتا تھا۔ اس دَوران خط و کتابت کے

ذریعے قرب بڑھا اور جب میں ۱۹۴۰ء میں منٹو مرحوم کی دعوت پر دِلّی گیا تو شاہد احمد مرحوم نے میرے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا۔ اس دعوت میں منٹو اور میرے علاوہ دِلّی کے تمام نامور ادیب موجود تھے۔ ہم سب اُردو میں باتیں کر رہے تھے، مگر جب منٹو اور مَیں آپس میں بات کرتے تو پنجابی میں کرتے۔ اس پر شاہد صاحب نے ہمیں ٹوکا اور پوچھا: "جب ہم سب اُردو میں بول رہے ہیں تو آپ دونوں پنجابی میں بات کیوں کر رہے ہیں؟" اور منٹو نے جواب دیا۔ "یہی سوال مَیں آپ سے پُوچھنے والا تھا کہ جب ہم دونوں، جن کے اعزاز میں آپ نے یہ پُر تکلّف دعوت دی ہے، پنجابی بول رہے ہیں تو آپ لوگ اُردو میں کیوں باتیں کر رہے ہیں"؟ مَیں تو منٹو کی اس برجستگی سے لرز گیا اور بعض چہروں پر مَیں نے ناگواری کی شکنیں بھی نمودار ہوتے دیکھیں، مگر شاہد مرحوم اس بات پر بے حد محظوظ ہوئے اور اس دَوران میں منٹو سے جب بھی مخاطب ہوئے، پنجابی بولنے کی کوشش کرتے رہے۔ "پان کھاؤ گے بادشاہو؟" "کیوں بادشاہو، قہوہ پیو گے کہ چائے؟" وغیرہ وغیرہ۔ شاہد احمد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور مَیں ان کی فراخ دلی سے بہت متاثر ہُوا۔ بعد میں جب مَیں نے "ادبِ لطیف" کی ادارت سنبھالی (یہ شاید ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے) تو مرحوم نے مجھے نئے نئے لکھنے والوں کے پتوں کی فہرست بھجوائی، حالانکہ اُن دنوں ان پتوں کو ادبی رسالے کا بڑا اہم راز سمجھا جاتا تھا۔ شاہد احمد مرحوم ہی نے مجھے پنجاب کے لوک گیتوں پر ساقی میں مضامین لکھنے کی دعوت دی اور یہ مضامین ساقی میں مسلسل چھپتے رہے۔ تب میں نے کنہیا لال کپور کا ایک مضمون "اہلِ زبان" ادبِ لطیف میں شائع کیا جو میری رائے میں محض دل لگی کا معاملہ تھا، مگر شاہد صاحب کو غصّہ آ گیا اور میری معذرت کے باوجود انہوں نے ساقی میں ایسے مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا جو "نیاز مندانِ لاہور" پر حملوں کی یاد تازہ کر گیا۔

میں نے ان میں سے کسی بھی مضمون کا جواب لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ شاید شاہد مرحوم کو اس کا احساس تھا۔ اسی لیے قیامِ پاکستان کے بعد جب ملاقات ہوئی تو اتنے تپاک اور اتنی شفقت سے ملے کہ ۱۹۴۰ء کی دِلّی کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ مجھے وہ ہمیشہ بڑی محبت سے یاد کرتے تھے اس لیے جب وہ جوش نمبر مرتّب کرنے میں مصروف تھے تو احباب نے مجھ پر بھی زور دیا کہ میں انہیں اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ مَیں ایسا نہ کر سکا کیونکہ مَیں ان لوگوں کی عرض داشتوں کا انجام دیکھ چکا تھا جو شاہد احمد مرحوم کو مجھ سے کہیں زیادہ عزیز تھے، مگر چند روز پہلے جب مَیں نے کراچی کے اخباروں میں یہ خبر پڑھی کہ شاہد احمد مرحوم کے تعزیتی جلسے میں حضرت جوشؔ بھی شریک ہوئے اور انہوں نے تقریر بھی کی تو مَیں نے سوچا کہ اگر میں جوشؔ کی انسانی وسیع القلبی، شاعرانہ عظمت اور فنی ہمہ گیری کا واسطہ دے کر مرحوم سے استدعا کرتا تو شاید وہ مان جاتے اور ایک ایسا کام نہ کرتے جس سے ان کے بیشتر دوستوں اور عقیدت مندوں کو اتّفاق نہیں تھا۔ شاہد احمد مرحوم کی ادبی سرگرمیوں سے مجھے صرف یہی اختلاف تھا ورنہ مَیں جانتا تھا کہ اس شخص نے صحیح معنوں میں اپنی زندگی اُردو زبان اور اُردو کے نام معنون کر رکھی ہے اور یہی لگن، یہی شیفتگی، یہی سپردگی ان کی ہر دل عزیزی کا راز ہے اور اسی وجہ سے آج برِّصغیر کے دوسرے شہروں کی طرح لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے کہ ان کے درمیان سے ایک دوست، ایک مشفق، ادب اور تہذیب اور کلچر کا ایک چلتا پھرتا نمونہ اُٹھ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔

یاد کا ایک چراغ

ابراھیم جلیس

پاکستانی اہلِ قلم کا یہ پہلا اجتماع ہے کہ اس میں شاہد احمد دہلوی موجود نہیں ہیں۔

اس سے پہلے جب کبھی بھی پاکستان کے ادیب، شاعر اور دانش ور کہیں اکٹھے ہوتے اور شاہد صاحب کو کہیں دیر ہو جاتی تو ان کا انتظار کیا جاتا تھا۔ شہ نشین پر سب سے زیادہ نمایاں جگہ اُن کے لیے ایک کُرسی خالی رکھی جاتی تھی اور جیسے ہی شاہد صاحب تشریف لے آتے تو سارے بڑے چھوٹے ادیب اور شاعر "شاہد بھائی۔ شاہد بھائی" کہتے ہوئے اُن کی طرف بڑھتے اور شاہد بھائی اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں ہر اک سے مصافحہ کرتے اور ہر ایک سے پُوچھتے:

"کہئیے حضرت —— کیسے مزاج ہیں؟"

لیکن آج پاکستانی اہلِ قلم کا یہ پہلا اجتماع ہے کہ اس میں شاہد بھائی کے لیے کوئی کُرسی خالی نہیں ہے۔ وہ آج نہیں آئیں گے۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔

اب اُن کا انتظار نہ کرو یارو۔

اب انہیں زندگی بھر صرف یاد ہی کرتے رہو یارو۔

اب شاہد بھائی کی زندگی کا تابناک سورج غروب ہو چکا ہے۔ ان کے پیچھے غم کا بڑا گہرا اندھیرا پھیل گیا ہے۔ آنسوؤں کے ستاروں سے بھی یہ اندھیرا کم نہیں ہوتا۔ جب ہی تو آج ہم سب ان کی یادوں کے چراغ جلانے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

لیکن میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ یاد کا چراغ کیوں جلاتے ہیں؟

یاد کے چراغ اور قبر کے چراغ میں فرق ہی کیا ہے! یاد کا چراغ ہو یا قبر کا چراغ ——— یہ کہاں راہنما ہوتے ہیں؟ ان چراغوں کی روشنی میں کون کب پلٹ کر آیا ہے کہ شاہد بھائی بھی لوٹ آئیں گے!

لیکن قبر پہ چراغ جلانا ایک پُرانی رسم جو ٹھہری یہ جانتے ہوئے بھی کہ جانے والا لوٹ آنا تو کُجا پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا ——— اسے آواز دینا انسانوں کی ازلی عادت جو ٹھہری!

یہ عادت ہے یا مجبور انسان کا محض اتمام حُجّت ——— میں نہیں جانتا لیکن کبھی نہ لوٹ کر آنے والوں کو سب ہی اسی طرح اُس وقت تک پُکارتے رہتے ہیں جب تک کہ ان کی آوازیں رُندھے ہوئے اور بھرّائے ہوئے گلوں میں ڈوب نہیں جاتیں۔ چنانچہ ہم بھی اب قیامت تک آوازیں دیتے رہیں گے۔

"شاہد بھائی۔ شاہد بھائی۔ شاہد بھائی!!"

قبر پہ چراغ جلانا بھی ازل کی رسم ہے۔ مَیں بھی اب اپنی یاد کا ایک چراغ جلاتا ہوں۔

اس یاد کے چراغ کی روشنی پیچھے ماضی میں اس صدی کے چالیسویں سنگِ میل تک پھیلی ہوئی ہے اور اس روشنی میں مَیں دیکھ رہا ہوں کہ اُردو ادب کی شاہراہ پر بڑی تام جھام کے قافلے گزر رہے ہیں۔ ان قافلوں میں سب سے پیچھے جو قافلہ ہے اس کے میرِ کارواں شاہد احمد دہلوی ہیں اور اہلِ کارواں میں عظیم بیگ چغتائی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، محمد حسن عسکری، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی۔ احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، حجاب امتیاز علی وغیرہ وغیرہ نمایاں ہیں۔

آگے آگے خوبرو دلآویز "ساقی" ہے اور اس کے مے خوار نغمہ خواں رواں دواں ہیں کہ ؎

اس دَور میں مَے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لُطف و کرم اور

مَیں چوروں کی طرح دبے پاؤں اس قافلے کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میری بچپن کی تمنّا مجھے بے چین کیے دے رہی تھی کہ مَیں بھی اس قافلے میں شرکت کی سعادت حاصل کر لوں۔

اُن دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ اور مہذّب گھرانہ ایسا ہوگا جس میں حضرت علّامہ نیاز فتح پوری کا "نگار" حضرت علّامہ راز ق الخیری کا "عصمت" اور مسٹر شاہد احمد دہلوی بی اے آنرز کا "ساقی" باپ، ماں، بہن، بھائی اور اولاد جیسا قریبی عزیز نہ ہو۔ مَیں اُن دنوں نویں جماعت کا طالب عِلم تھا اور اپنے بارے میں یہ ڈینگ ہانکا کرتا تھا کہ:

"ایک دن آئے گا جب میرا نام "نگار" اور "ساقی" میں چھپے گا۔"

اُس زمانے میں "نگار" "ساقی" اور "عصمت" میں کسی نئے قلمکار کا ایک بار بھی چھپ جانا اسے "آناً فاناً" مُلک گیر شہرت کا خزانہ عطا کر دیتا تھا۔ اسی لیے اُس زمانے میں بڑے بڑے قلمکار تک بڑی ہمّت باندھنے کے بعد ان دروازوں پر دستک دینے کی جرأت کرتے تھے چہ جائیکہ مَیں اسکول کا ایک ادنیٰ طالب علم!

لیکن مَیں نے اس قافلے کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے پیچھے دبے دبے پاؤں چلتا ہی رہا۔ اور جب ۱۹۴۱ء کے سنگِ میل پر اس قافلے نے ستانے کے لیے پڑاؤ ڈالا تو مَیں قریب ہی گُم نامی کی مُنڈیر پر چڑھ کر اور چُھپ کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے عجب منظر تھا۔ "ساقی" خُم کے خُم بانٹ رہا تھا۔ میرا بھی جی مچل رہا تھا کہ "ساقی —— ایک جام اِدھر بھی"۔

اُس وقت پتہ نہیں کس نے کرشن چندر نے یا قاسمی نے، منٹو نے یا بیدی نے باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ:

"شاہد بھائی —— یہ کیا بات ہے —— یا تو ہم سب بہت تیز رفتار ہیں یا پھر ہمارے پیچھے کوئی نہیں آرہا ہے۔ پیچھے کسی نئے لکھنے والے کی چاپ تک سُنائی نہیں دیتی۔"

یہ سُن کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور مَیں اچانک دھم سے ان کے بیچوں بیچ کُود پڑا۔ وہ سب چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ مَیں نے خود ہی اپنا دستِ تعارف بڑھا دیا کہ:

"مَیں اس قافلے سے اپنا رشتہ استوار کرنے آیا ہوں۔"

"رشتہ" میرے پہلے افسانے کا نام بھی تھا اور مَیں نے شاہد بھائی کی اجازت سے وہ افسانہ اہل کاروں کو سُنایا۔ شاہد بھائی نے مجھے اُٹھ کر گلے سے لگا لیا اور اعلان کیا کہ:

"یہ لڑکا آج سے اس قافلے میں شامل ہے۔"

دیارِ اُردو ادب کے باشندوں سے میرا سب سے پہلا تعارف شاہد بھائی نے کرایا اور علامہ نیاز فتح پوری مرحوم نے اس دیارِ ادب میں رہنے کے لیے مجھے بے اندازہ شہرت کا ایک جگمگاتا مکان عطا کیا۔

میرے یہ دونوں محسن یکے بعد دیگرے اپنا سایۂ عاطفت میرے سر سے اُٹھالے گئے اور شاہد بھائی کا سایۂ عاطفت کیا ہٹا کہ بڑی تیز اور ناقابلِ برداشت دُھوپ میں برہنہ سر ہو گیا ہوں۔

ہر اہلِ دل کی طرح بیماریٔ دل ہی نے شاہد بھائی کا بھی کام تمام کیا۔

دِلّی شاہد بھائی کا دل تھی۔ دِلّی شاہد بھائی سے کیا بچھڑی کہ دِلّی اُن کے لیے بیماریٔ دل بن گئی۔ مگر وہ ساری زندگی بڑے پیار سے دہلی کی وزنی یاد کو اپنے نام کی پُشت پر ڈھوئے ڈھوئے پھرتے رہے، لیکن شاہد بھائی خود بھی تو بڑے "تنک مزاج محبوب" تھے۔ دِلّی نے ان کے ساری عمر کے عشق کی پروا نہ کی تو وہ کیا پروا کرتے!

چنانچہ ان کی خودداری نے پاک سرزمین کی دو گز زمین تو قبول کر لی، لیکن اس بے وفا دِلّی کی بڑی بڑی ذاتی حویلیوں کا بھی پھر کبھی رُخ نہ کیا۔

عجیب بات یہ ہے۔ سب انسان تو ایک بار مرتے ہیں، لیکن شاہد بھائی دو بار مرے۔

۱۹۴۷ء میں پہلی بار انتقال کیا

۱۹۶۷ء میں آخری بار انتقال کر گئے۔

شاہد صاحب ۔ ساقی والے

الطاف فاطمہ

آپ نے مجھ سے شاہد احمد دہلوی پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی، تو اس احساس کے باوجود کہ مَیں نے اُن کو نہ دیکھنے کے برابر دیکھا ہے، یعنی کُل جمع دو مرتبہ اور بریکٹ میں یہ ضرور پڑھیے کہ وہ بھی سَرسَری، چُناں چہ آپ کو خیال ہوگا کہ مَیں تھوڑے سے انکار کے بعد راضی ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ مَیں انکار کے دُوسرے ہی لمحے یہ محسوس کر رہی تھی کہ مَیں اُن پر ضرور لکھنا چاہتی ہوں۔ وہ کیوں؟ ڈرتی ہوں جواب اتنا طویل نہ ہو جائے کہ خود اُن پہ ایک حرف بھی نہ لکھ پاؤں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اُن پر لکھنے کے خیال سے ذہن میں جیسے ہیرے کی کنیاں سی دَمک اُٹھتی ہیں۔ اُن یادوں باتوں کے چراغ سے جل اُٹھتے تھے جن کا براہ راست شاہد صاحب سے کوئی ناطہ اور کوئی واسطہ نہ تھا، البتّہ ایک تعلّق ضرور ہے ایسا کہ اُن کو اور ساقی کو ان یادوں کا محور کہا جا سکتا ہے۔

مجھے یُوں لگ رہا ہے کہ مَیں ابھی ابھی اُس گھر میں گھُوم پھر کر آئی ہوں

جہاں سے زندگی کے قافلے نے آغازِ سفر کیا تھا۔ ہاں ہاں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ مَیں ابھی وہیں تھی اور مَیں نے باورچی خانے کی سُرخ کھپریل پر چھائی ہوئی انگور کی بیل کے درمیان گلہریوں اور ان کے ننّھے نویلے بچّوں کو پُھدکتے دیکھا ہے۔ کھٹّے کے پیڑ پر شاما کو ایک ڈال سے دوسری ڈال پر بیٹھتے دیکھا ہے اور ایک درے میں چلی آئی ہوں جس کی پیشانی پر مالتی کے سفید، ہلکے، گلابی اور سُرخ جھُومر سے جھُولا کرتے تھے۔ دراصل اس ساری بات کا اصل تعلّق تو اُسی گھر اور زندگی کے اُسی دَور سے ہے، یعنی اُس وقت سے کہ جب میرے نام "پھُول" اور میری بڑی بہن کے نام "ساقی" آیا کرتا تھا۔ بات تو بڑی معمولی سی تھی، مگر دراصل یہی تو ساری باتوں کا پیش خیمہ تھی۔

"پھُول" ایک دُبلا پتلا سا ہفتے وار جریدہ تھا جس میں کہانیوں، دلچسپ باتوں، مزے دار نظموں اور خبروں کے علاوہ مُعمّے بھی چھپا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک یعنی فقط کالے رنگ سے بنی تصویروں کے علاوہ 'راستہ دکھاؤ' یا 'تلاش کرو' وغیرہ قسم کی بھُول بُھلیّاں بھی شامل ہوتی تھیں۔ یوُں تو ہمیں اپنا "پھُول" بہت پسند تھا کہ مہینے میں چار بار ہر پیر کے دن ملا کرتا تھا، یعنی اُس دن ہم ڈاکیے کے انتظار میں باہر ہی منڈلایا کرتے کہ یہی وہ واحد ڈاک تھی جو ہمارے نام آیا کرتی تھی۔ پھر ہم بڑے فخر سے اس کاغذ کو بار بار دیکھتے جس پر ہمارے نام کی چھپی ہوئی چِٹ چسپاں ہوتی تھی۔ اس کو بڑی احتیاط سے کھولتے اور سیدھے باہر کا رُخ کرتے۔ گھاس پر اُوندھے لیٹ کر یا درخت کے کسی موزوں سے گدّے کا گھوڑا بنا کر اُس وقت تک بڑے مزے سے پڑھتے رہتے جس وقت تک کہ احباب آ کر "لاؤ ہمیں دو" اور "ہمیں دکھاؤ"، کے

نعروں کے ساتھ ٹوٹ نہ پڑتے، لیکن بات در اصل "ساقی" کی آمد سے شروع ہوتی ہے کہ یہ ہر ماہ کی پہلی تاریخوں میں آیا کرتا تھا۔ جس کو دیکھ کر میری بہن، جن کے لیے آئندہ بیّی کا لفظ استعمال کروں گی، اُچھل پڑتی تھیں۔ اب ساقی کا یہ تھا کہ وہ چکنا چُپڑا اور موٹا تازہ ہؤا کرتا تھا کہ ہمارے چار پھُول مِل کر بھی اس سے کم ہی نظر آتے۔ اوّل تو یہ کوفت ہی کیا کم تھی کہ ہمارا پھُول تو اتنا پتلا ہے اور بیّی کا ساقی اتنا موٹا اور یہ کوفت امّاں کے یہ سمجھانے سے بھی کم نہ ہوتی کہ بھئی وہ مہینے میں صرف ایک بار آتا ہے جب کہ تمہارا پھُول چار بار اور پھر اس سے بھی زیادہ جو بات ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی، وہ، وہ صورت حال تھی جو ساقی کی آمد کے ساتھ گھر میں پیدا ہوتی۔ یُوں کہنے کو تو امّاں ہمارا پھُول بھی بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھیں۔ اس دعوے کے ساتھ کہ جب میں چھوٹی تھی تو یہی پھُول میرے پاس بھی آیا کرتا تھا، اب تمہارے نام آتا ہے، لیکن در اصل پھُول کی آمد کو گھر میں کبھی یُوں منایا (CELEBERATE) نہیں گیا جس طرح ہر ماہ ساقی کی آمد منائی جاتی۔ اس کے آنے کے ساتھ ہی بیّی جو عام دنوں میں اپنے کمرے میں گھُسی میز پر جھکی پینٹنگ یا ڈرائنگ میں مشغول ہوتیں یا پھر کسی کونے میں بیٹھی موم پگھلا پگھلا کر اس سے چڑیاں، کوّے اور طوطے بنا رہی ہوتیں یا کپڑا دھونے کا صابن لیے چاقو سے چھیل چھیل کر اس میں سے کوئی چہرہ کوئی صورت یا مجسمّہ نکال رہی ہوتیں، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر برآمدے میں نکل آتیں جہاں تختوں کے ایک نیچے، لیکن عریض چوکے کی سفید برّاق سی چاندنی پر بیٹھی امّاں اپنے حساب کتاب میں یا پھر سلائی، بُنائی یا کڑھائی میں مشغول ہوتیں۔ "ساقی" اسی تخت پر امّاں کے پاس بیٹھ کر کھولا جاتا اور وہ فوراً اسی طرف متوجہ

ہو جاتیں۔ فہرستِ مضامین ایک ساتھ ٹٹولی جاتی، پھر مشترکہ طور پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی اور بنّی اپنا رسالہ لے کر اندر چلی جاتیں۔ پھر یُوں ہوتا کہ اماّں مٹر چھیل رہی ہیں، سبزی بنا رہی ہیں یا کسی اور کام میں مصروف ہیں، پاس ہی گاؤ تکیے پر سر رکھے، ہاتھ میں ساقی پکڑے بنّی لیٹی ہیں۔ وہ کچھ پڑھ رہی ہیں اور اماّں سُنے جا رہی ہیں۔ کبھی دونوں ہنس پڑتی ہیں، کبھی رسالہ رکھ کر کسی بحث میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ مَیں اب سوچتی ہوں، تو محسوس ہوتا ہے کہ ان باتوں اور بحث کا انداز وہی ہوتا تھا جو تنقیدی بحثوں کا ہوتا ہے۔ کسی کردار کی بات، کسی پلاٹ پر اعتراض یا تعریف، کسی اسٹائل پر واہ واہ، کسی پر نفریں۔ اکثر یُوں بھی ہوتا کہ گرمی جاڑوں کی دوپہر میں ساتھ والے گھر سے اپنی سلائی لیے پوپلے مُنہ میں پان چباتی پٹھانی بُوا بھی آجاتیں اور تخت کے ایک کونے پر بڑی نفاست سے براجمان ہو جاتیں۔

"اے ہاں، نو بڑی بٹیا، وہ افسانہ تو ہم اُدھورا ہی چھوڑ گئے تھے!"—

"اچھّا بُوا، ابھی سُناتے ہیں۔" پھر وہ اپنا کام جلد جلد نپٹا کر ساقی سنبھال درمیان میں آ بیٹھتیں۔ پٹھانی بُوا کو مزاحیہ چیزیں زیادہ پسند آتی تھیں خصوصًا عصمت چغتائی کے چٹ پٹے افسانے۔ اتنا ہنستیں اتنا ہنستیں کہ ان کا پوپلا مُنہ سُرخ ہو جاتا اور پیٹ اُچھل اُچھل کر تباہ حال ہو جاتا۔ پان، چائے اور شربت کے دَور چلتے اور ساتھ ہی پٹھانی بُوا کا ہاتھ اپنی اُجرت کی سلائی پر تیزی سے چلتا۔ "اے، میرا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے بڑی بٹیا کے ساقی کے سہارے"۔ وہ مگن بیٹھی سیتی رہتیں اور پھر ہفتہ گزرتا کہ قمر باجی آجاتیں۔ وہ آتیں تو بنّی اور اُن کے ساقی کی پارٹی اور مضبوط ہو جاتی۔ اب پڑھا ہوا ساقی دوبارہ پڑھا جاتا قمر باجی کی معیت میں—

اب یہاں سے ہماری اصل خواری شروع ہوتی۔ وہ دونوں کھٹّے کے سائے یا چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں والی بوگن ویلیا کے در کی شکل میں جھکے ہوئے کنج کے درمیان یا کوئی ایسی ہی اچھّی سی پوزیشن لے کر سُوت سے بنی ہوئی نیچی سی پلنگڑی ڈال کر لیٹ جاتیں۔ پھر دل بھر خوب باتیں کرتیں۔ کھی کھی کر کے ہنستیں، پھر ہم پر احکام صادر فرماتیں: "اے چلو ادھر آؤ، کیا گھوڑوں کی طرح گُدکڑے لگا رہی ہو۔ پھوپی جان سے کہتی ہوں۔" قمر باجی ڈراتیں "چلو ہمارے لیے ہزارہ نارنگیاں توڑ کر لاؤ۔" گدّر گدّر امرود اور کچّے آڑو غرض ایسی اُلا بُلا اشیا کی فہرست گوش گزار کیے ہم روانہ ہوتے۔ اب کنّو جیسی رنگت والی چکنی چکنی بیر برابر کھٹّی چوٗنا نارنگیاں توڑ توڑ کر جیبوں میں بھر رہے ہیں۔ درختوں پر چڑھ چڑھ کر توڑ رہے ہیں اور مالی کی للکاریں سُن رہے ہیں۔

"ہم جات ہیں ابھین بیگم صاحب کہنے۔ ای بٹیا ہمار نہیں سُنت ہیں۔ پھر مار گلا پکیہے کھٹّا کھا کھا کر۔"

اب ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ان حرکات کا محرک کون ہے؟ لہٰذا جان پر کھیل کر ساری چیزیں فراہم کرتے۔ اس اُمّید پر کہ شاید "ساقی" کی اس دِل کش تقریب میں ہمیں بھی شامل کر لیا جائے، مگر اب دوسرا آرڈر ملتا:

"جاؤ، باورچی خانے سے نمک مرچ لا کر دو۔"

نمک مرچ لانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا اس لیے کہ مولا بخش کی کوٹھڑی باورچی خانے سے جُڑی ہوئی تھی۔ کھَٹ سے ہوا اور وہ کم بخت آ گیا اُچھل کر اور نمک مرچ والا ہاتھ مروڑ ڈالتا تھا۔ "کہوں بیگم صاحب سے؟ یہ دوپہر بھر نمک مرچ برباد کرتی رہتی ہیں۔" مگر ہم ہر قیمت پر وہ بھی فراہم کر دیتے۔ تو اب ہماری

قسمت کا فیصلہ یہ سُنایا جاتا:

"چلو جاؤ کھیلو۔"

"ہم بھی سُنیں گے افسانہ۔"

"نہیں، جاؤ تم پڑھو اپنا سڑا ہوا پھول۔"

پھول اور سڑا ہوا؟ معاذاللہ، یہ توہین۔ چناں چہ یہی باتیں تھیں کہ جنہوں نے ہمارا دل "ساقی" اور "ساقی" کے شاہد صاحب سے پھاڑ دیا، چناں چہ اب ہم یُوں انتقام لیتے کہ ہانپتے کانپتے آکر بجّی اور قمر باجی کو خبر سُناتے:

"شاہد صاحب آگئے"!

"کون شاہد صاحب؟"

"شاہد صاحب ساقی والے!"

"چل جھُوٹی!"

مجھے یقین ہے کہ ان کو تھوڑا تھوڑا یقین آجاتا تھا۔

"سچ ہم نے دیکھا ہے ابھی اُنہیں۔"

"کہاں؟"

"گیٹ کے پاس سر پہ ساقی کا بڑا سا گٹھّا لیے بیچتے پھر رہے ہیں۔ لو ساقی! ساقی لے لو ٹکے کے پانچ سیر۔"

"اچھا چلو بھاگو بدتمیز نالائق!" وہ پڑھنے میں مشغول ہو جاتیں۔

پھر کسی دن ہم خبر لاتے عصمت چغتائی باہر بیٹھی گھاس چھیل رہی ہیں۔ لال چھینٹ کا لہنگا پہنے ہوئے ہیں۔ کہہ رہی تھیں اپنی بہنوں کو بُلا لاؤ۔

"تم اس کا نوٹس لوگی تو یہ اور اِترائے گی۔" بجّی، قمر باجی کو مشورہ دیتیں۔

پھر کبھی کبھی ہم باہر ہی سے ساقی وصول کر لیتے - دو چار دن کے بعد ہبّی کو لے جاکر بڑی مسکینی سے دیتے - "شاہد صاحب باہر کھڑے ہیں - کہہ رہے ہیں بڑا افسوس ہے دیر سے ساقی آنے کا، مگر میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی لاتا کس طرح" پھر اسی ساقی کے لیے ماموں جان (سیّد رفیق حسین جعفری) افسانے لکھ کر لاتے اور بھیجنے سے پہلے امّاں کو سُناتے - وہ ان کا افسانے سُنانا بھی ایک باقاعدہ تقریب کی حیثیت رکھتا جس میں ہم جیسے افرادِ خانہ بارہ پتھّر باہر ہی رکھے جاتے یا "جاؤ اپنا کام کرو" یا پھر شام ہوئی تو ماسٹر صاحب کے پاس جاکر وہ قسط وار کہانیاں سُنو جو وہ ہفتوں سُناتے رہتے - اندر چائے بنتی، افسانے کی رگ رگ ٹٹولی جاتی اور پھر جب ایک بار قمر باجی ماموں جان کی ہمراہی میں دِلّی جاکر واپس آئیں تو پتہ چلا کہ سچ مچ وہ شاہد صاحب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہیں - افوّہ پھر تو ان دونوں خواتین کا اکسائٹ منٹ دیکھنے کے قابل ہوتا - وہ دونوں الگ الگ ہو جاتیں یعنی قمر باجی ماموں جان کی ملازمت کے سلسلے میں کبھی یہاں کبھی وہاں ہوتیں، تو پھر ایک دُوسرے کو موٹے موٹے جنّاتی خط لکھتیں اتنے کہ بیرنگ ہو جاتے - وہ خط بھی اتنے دلچسپ ہوتے کہ باقاعدہ ان کو سُننے کے لیے وہی محفل جمتی جو ساقی کی آمد پر جمتی - پھر وہ دونوں مِل جاتیں تو مشترکہ مساعی سے ایک 'دیوانے محل' کے نام سے لکھی جانے والی ایک ناول مکمّل کرنے لگ جاتیں اور ابھی وہ نامکمّل ہی تھی کہ دونوں کی یکے بعد دیگرے شادیاں ہوئیں - یہ لڑکیاں بیاہی گئیں تو طاقوں بھری گڑیوں کے بجائے پیچھے کتابوں بھری الماریاں اور پالتو بلّیاں اور خرگوش چھوڑ گئیں - ان کی شادیاں، گھر کی چہل پہل میں کمی اور پھر سرے سے گھروں کا نہ رہنا یہ سب باتیں کتنی تلے اُوپر

ہوئیں۔ سوچو تو ہنسی آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وقت اُن دنوں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تیز چلا تھا۔

یہ تو مجھے خیال نہیں کس سے پتہ چلا تھا شاہد صاحب نہ صرف یہ کہ پاکستان میں ہیں بلکہ یہ بھی کہ ساقی بدستور نکال رہے ہیں۔ ببّی نے اس خبر کو سُن کر پہلا کام یہی کیا کہ ساقی کا وی پی منگوایا تھا۔ وہی عجیب وغریب سی صُراحی نما عورتوں اور یا پھر ایک بوڑھے ساتے کو شراب پلائی ہوئی عورت والے ٹائیٹل والا ساقی۔ اندر سے اب اتنا چکنا اور سُتھرا نہ ہوتا۔

اب ببّی ساقی پڑھتیں تو امّاں کو اتنی فرصت نہ ہوتی کہ ساتھ بیٹھ کر سُنتیں۔ قمر باجی کراچی میں تھیں اور مَیں اب اتنی غیر معزّز نہ رہی تھی، چناں چہ انتظار حسین کا 'محل والے'، نہ صرف اُنہوں نے پڑھ کر سُنایا، بلکہ بڑی دیر تک بھری بھری آنکھوں اور ڈوبی ڈوبی آواز میں بتایا کہ اس افسانے کی خوبصورتی کا راز کیا ہے۔

پھر وہ وقت بھی گزر کر رہا۔ پتہ نہیں جانے والوں کو کیا ہو جاتا ہے نہ آگا دیکھتے ہیں نہ پیچھا، لیکن خیریوں ایکا کر کے جاتے میں نے بہت کم ہم خیالوں اور ہم جولیوں کو دیکھا ہے۔ نہ وہ رہیں نہ وہ۔ قمر باجی کی موت پر مُمانی جان نے امّاں کو جو خط لکھا تھا، اس کی چند سطریں مجھے کبھی نہیں بھولتیں:

"کیسی عجیب تھیں یہ لڑکیاں۔ دونوں ایک ہی سی قسمتیں لائی تھیں۔ اپنے بچّے پالنا نہ اِن کی قسمت میں تھا نہ اُن کی۔ یہ کام اب ہم آپ کریں گے۔ مَیں کہتی ہوں وہ دن ہی اچھّے تھے۔ ہائے، مجھے آپ کے گھر کی راتیں یاد آتی ہیں۔ ساقی پڑھا جا رہا ہے۔ ایک ایک افسانے اور ایک ایک شعر پہ رلئے زنی

ہو رہی ہے۔ ساقی کیا آتا تھا ایک مٹھائی آتی تھی۔"

پھر وہی ساقی کی بات! ساقی! ساقی! ساقی منگوانے والی دُنیا سے اُٹھ گئیں۔ ساقی آتا رہا اسی نام پر۔ کس میں ہمت تھی کہ ساقی والے شاہد صاحب کو لکھ دے اب نہ بھیجا کریں کہ جس نام پر ساقی بھیجتے ہیں وہ فقط ایک کہانی بن کر رہ گیا ہے۔ سال گزرا وی پی آیا۔ حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ میں نے اماں سے پوچھا واپس کر دوں۔ اُنہوں نے ایک لحظہ مجھے دیکھا، صندوقچے میں سے روپے نکال کر دیے "چھڑا لو یہ وی پی۔" مجھے معلوم تھا کہ وہ چھڑا لیں گی۔ اس ساقی کو دیکھ کر اِن کی آنکھوں میں عجیب سی آبادیاں جھانکتی نظر آتی تھیں۔ مجھے احساس تھا کہ ایسے میں ان کی نظروں میں دو نازک نازک سی دراز قد لڑکیاں اُبھرتی تھیں۔ ان کی اپنی چاند کی کرنوں جیسی رنگت اور کُھلی کُھلی آنکھوں پر جُھکی جُھکی لمبی لمبی گھنی گھنی پلکوں والی بیٹی جو ہنستی تو ہنستی چلی جاتی اور سوچتی تو سوچے ہی چلی جاتی، اور دھان پان سی بھتیجی جس کی لمبی لمبی نازک اُنگلیاں سوئی تھامتیں یا قلم، آٹے کے پیڑے پر چلتیں یا قینچی پکڑ کر کپڑے پر۔ غرض جس شے کو چُھو لیتی مُسکرا اُٹھتی۔

غرض ساقی آتا رہا۔ ابھی مَیں نے چند ہی افسانے لکھے تھے کہ ایک دن شاہد صاحب کا خط ملا۔ افسانے کی فرمائش تھی۔ اب کون جان سکتا ہے کہ ہمارے دل کی حالت کیا ہوئی۔ افسانہ بھی ضرور بھیجنا تھا اور ہیبت کا یہ عالم کہ اُس دن مَیں نے پہلی مرتبہ افسانہ لکھتے میں کئی کاغذ پھاڑے۔ ورنہ یُوں ہی گھسیٹ کر رکھ دیا کرتے تھے۔ افسانہ چھپ گیا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جن دنوں ساقی کا وی پی آیا کرتا تھا، مگر اس سال ہمیں وی پی نہ ملا۔ نہ جانے کس

طرح اُن کو پتہ چل گیا تھا کہ جس کے نام ساقی جاری تھا، وہ اب موجود نہیں اور مَیں اس کی بہن ہوں - پھر کبھی ہمیں ساقی کا وی پی نہیں ملا - ساقی میرے نام آتا رہا -

جن دنوں رائٹرز گلڈ قائم ہوئی، اُن دنوں کسی سلسلے میں شاہد صاحب لاہور آئے ہوئے تھے - شام ہو چلی تھی - کسی نے آکر بتایا شاہد احمد دہلوی آئے ہیں - یقین جانیے مَیں اُچھل پڑی تھی - مجھے یقین نہیں آ رہا تھا - ان کے ساتھ ایم اسلم صاحب اور اشرف صبوحی صاحب بھی تھے - باہر کی طرف مَیں چلی تو اماں نے، جو برآمدے میں بیٹھی تھیں، پُرشوق آواز میں کہا تھا:

"بٹّو، شاہد صاحب کو ذرا اُس طرف سے لے کر اندر جانا -"

"کیوں؟" مَیں نے پُوچھا -

"مَیں اس شخص کو دیکھوں گی - ارے یہی تو وہ شخص ہے جس نے میرے بھائی کو پڑھنے والوں سے متعارف کروایا - ان کا افسانہ ساقی میں نہ چھپتا تو رفیق حسین کو کوئی نہ جانتا -"

وہ ان کو دیکھنا چاہ رہی تھیں اور مجھے دیکھیے کہ میرا دل کھٹا کھٹ چل رہا تھا، اور ان کو صُورت دکھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا - ببّی اور قمر باجی کو جلانے کے لیے کہے ہوئے اُن سارے فقروں کی بازگشت کانوں میں گونج رہی تھی -

شاہد صاحب کانے ہیں -

شاہد صاحب کی ٹانگ ٹوٹ گئی جب ہی تو ساقی دیر سے آیا ہے -

شاہد صاحب سر پر ساقی کا گٹھّا لیے بیچ رہے ہیں -

اپنی اُس وقت کی خباثت پھٹکار بن کر مجھ پر برس رہی تھی۔ دل کا چور بڑی طرح متوحش تھا۔ خیر سر وَر ڈھانک کر ان کے سامنے گئی اور جا کر ان کو سلام کر کے بیٹھی ہی تھی کہ بجلی چلی گئی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کے ذہن میں شاید یہی آتا کہ ؏

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

مگر مَیں نے شکر کیا کہ خیر اب ان کو صُورت دکھانے کا سوال ہی نہیں۔ موم بتّی کی روشنی میں ان کو چائے پلائی۔ لوگ بھی کئی تھے۔ وہ کبھی کسی سے کبھی کسی سے بات کرتے اور جواب دیتے۔ ان کی عینک اندھیرے میں چمک رہی تھی۔ کچھ غیر مطمئن کُڑھے کُڑھے سے نظر آتے تھے۔ مجھے ایسے مضطرب اور زُود رنج سے لوگ بڑے اچھے لگتے ہیں۔ شاہد صاحب اُٹھ کر جا رہے تھے کہ بجلی آ گئی اور وہ چلے گئے۔

افسانہ بھیجا نہ بھیجا، اُنہوں نے کبھی شکایت نہ کی، البتّہ بہت دن اُن کو میری خیر خبر نہ ملتی تو چند سطروں پر مشتمل ایک کارڈ مِل جاتا جس میں کبھی عزیزہ اور کبھی محترمہ کر کے القاب ہوتا اور یہ کہ اپنی خیریت سے کبھی کبھی مطلع کر دیا کرو۔

اماں کے انتقال کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ طبیعت بڑی ہراساں سی رہتی تھی۔ ایک دن کالج سے واپسی پر معلوم ہوا سِول لائنز کے تھانے سے کوئی صاحب مِلنے آئے تھے۔ مَیں بڑی ہونق ہوئی۔ یاد نہیں اُسی دن یا دوسرے دن ایک پیارا سا بچّہ ایک پرچہ لے کر آیا جس میں لکھا تھا:

"عزیزہ، مَیں یہاں اپنے لڑکے کے پاس کراچی سے آ رہا تھا تو شاہد احمد دہلوی نے تاکید کی تھی کہ تم سے ضرور مِلوں مَیں آیا تو تم نہ تھیں اب تم آ جاؤ۔"

مَیں بچّے کے ساتھ تیار ہو کر اور حفظِ ماتقدّم کے طور پر حسبِ عادت ایک عدد چھوٹا سا باڈی گارڈ لے کر سول لائنز کے پولیس کوارٹرز میں گئی تو معلوم ہُوا کہ یہ نہایت ہی شفیق، بذلہ سنج اور ناقابلِ بیان حد تک پُرخلوص بزرگ خاں بہادر نقی محمد خان خورجوی ہیں۔ ان سے شاہد صاحب نے میرے متعلق کچھ ایسے لفظوں میں ملنے کی تاکید کی تھی کہ سُن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مَیں نے سوچا وہ گڑھا گُڑھا، زُود رنج اور غیر مطمئن سا انسان اس درجہ شفیق اور قدر دان ہے، مجھے معلوم نہ تھا، اور پھر اپنی ان گستاخیوں کو یاد کر کے اور بھی پشیمان ہوئی جو مَیں نے اپنی بہنوں کو جلانے کے سلسلے میں اس شخص کی شان میں روا رکھی تھیں۔

خان بہادر نقی محمد خان صاحب جب تک لاہور آتے رہے مجھے بڑے شوق اور محبت سے بُلاتے تو خیر تھے ہی، مگر کم نظر آنے کے باوجود بہ دِقّت تمام آتے کہ "بیٹی، تُو آئی نہیں مَیں نے کہا مَیں ہی ہو آؤں۔" مَیں کہتی: "بابا، آپ نے مجھے بُلوا لیا ہوتا۔" پھر وہ از سرِ نو میری ڈیوٹی لگاتے:

"جب تک مَیں رہا کروں تم برابر آتی رہا کرو۔"

ان کی اس درجہ محبت دِل میں جینے کی آرزو پیدا کر دیتی اور اس کو بھی میں شاہد صاحب ہی کا ایک تحفہ سمجھتی تھی۔ میرے دل سے ان کے لیے ایک ہی دُعا نکلتی تھی اللہ ان کو خوش رکھے کہ عین اس زمانے میں جب میں حد سے زیادہ دل برداشتہ اور افسردہ تھی، ایک محبت کرنے والا بزرگ مجھے دے دیا۔

اگر مَیں نے کبھی افسانے کی تاخیر کا سبب اپنی بیماری لکھ دیا تو شاہد صاحب

بو ایسی خیریت پُچھوانے کا خط لکھتے۔ اس خیریت طلبی کی قدر تو وہی جان سکتے ہیں جن کے پُرسانِ حال کم ہوتے ہیں اور جن کی اپنی نظر میں بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی آٹھ یا دس تاریخ تھی۔ مَیں ریڈ کراس سے کرفیو کے وقت واپس آئی۔ گھر میں سب چُپ چُپ تھے۔ ریڈیو کے سوا اور کوئی آواز نہ سُنائی دے رہی تھی۔ مَیں بھی خاموشی سے ایک طرف آ کر بیٹھ گئی۔ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ کل کیا ہونے والا ہے بلکہ ابھی دوسرے لمحے کیا ہو جائے گا اور کیا خبر آئے گی، کسی کو معلوم نہ تھا۔ سڑک خاموش تھی اور سارے ہنگامے سوئے پڑے تھے۔ کسی نے ایک کارڈ لا کر میرے ہاتھ میں دے دیا جو دن کی کسی ڈاک میں آیا تھا۔ مَیں کارڈ لے کر اندر گئی۔ ماچس کی تیلی جلا کر اس پر روشنی ڈالی۔ مجھے ایک بار اور ماچس کی تیلی جلانا پڑی اس لیے کہ بالکل یقین نہ آ رہا تھا۔ کوئی یقین کرنے والی بات بھی ہوتی۔ بھلا شاہد احمد دہلوی کو کیا پڑی تھی کہ اس افراتفری میں میری خیریت پُچھواتے کہ براہِ کرم اپنی خیریت لکھو۔ مگر یہ کہ واقعی اُنہوں نے پُچھوائی تھی۔ چھوٹا سا رُوکھا سا خط تھا، لیکن لفظ لفظ ان کی دِلی فکرمندی کا غمّاز تھا، اور جنگ کے اتنے دنوں میں یہ پہلا خط یا خیریت طلبی تھی جو مجھے وصول ہوئی۔ یعنی لڑائی کا لفظ سُن کر وہ جو ایک لگن پن کا احساس تھا کہ "ادنہہ ہماری فکر کس کو لاحق ہو گی" وہ گویا بے بنیاد تھا۔ ہم یہ کیوں سوچ لیتے ہیں کہ دُنیا میں خیال اور بے غرض محبت کرنے والے لوگ نہیں بستے۔

شاہد صاحب سے دُوسری بار مِلنا اُس وقت ہُوا جب مَیں ۶۶ء میں

کراچی گئی۔ کراچی والوں کے دل میں لاہور والوں کے لیے کتنی محبت ہے، یہ احساس بھی مجھے جب ہی ہوا تھا۔ بہر حال اسی سلسلے میں جمیل جالبی صاحب کے ہاں جانا ہوا۔ وہ مجھے اپنے ہاں کھانے پر لے گئے تھے اور شاہد صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کو بھی ان کے گھر لینے گئے۔ میں نے باہر ہی سے وہ گھر دیکھا تھا۔ خود شاہد صاحب ہی کے کسی پروگرام کی بنا پر تاخیر ممکن نہ تھی اور اندر جانا ممکن تھا، لیکن گھر کے دروازے ہی تک جا کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ایک سچّے قناعت پسند انسان کا گھر ہے۔ اس کراچی میں جہاں آگے بڑھنے دوڑ کر چلنے اور معیارِ زندگی کی چھوڑ پکڑ میں یہ شخص کس قدر ٹھکا ہوا معیار رکھتا ہے، میں نے سامنے کی بیٹھک کے کھلے دروازے میں سے جھانکتی ہوئی زندگی اور معیار کی ایک جھلک دیکھ کر سوچا تھا۔

شاہد صاحب اس مرتبہ بھی خاموش اور غیر مطمئن اور مضطرب سے نظر آئے۔ پتہ نہیں وہ اوروں کو بھی ایسے ہی نظر آتے تھے یا مجھ ہی کو محسوس ہوا تھا کہ ان کے اندر کوئی خلش، کوئی بے چینی اور بڑی گڑھن سی ہے۔ وہ یقیناً اپنی اولاد اور معاش کے معاملے میں بے فکر اور آسودہ ہی ہوں گے، لیکن ان کے اندر تو کوئی اور ہی بے چینی تھی جس کا تعلّق دنیا کی ہَوس سے نہیں ہوا کرتا۔ ایسا اضطراب دُوسروں کو کھلتا ہے، لیکن ان کے اندر جو خلش اور اضطراب مجھے محسوس ہوا تھا، وہ دوسرے کو مرعوب اور افسردہ کر دیا کرتا ہے۔

اُن کے ساتھ اُن کی بیگم تھیں جو کسی اسکول میں پڑھاتی بھی ہیں۔ اُن کی سادگی دیکھ کر مجھے بڑا اچھا لگا۔ مذاقِ ادب رکھنے والی اور اس شخص کی

بیوی جو نہ صرف اہلِ قلم تھا، بلکہ آج کے زیادہ تر نامور ادیبوں کا کھوج لگا کر اُن کو ان کے مقام کا احساس دلانے والا اور قدردانی کے سلسلے میں فراخ دل ——— لیکن یہ کتنی بے نیاز اور باظرف بیوی تھیں۔ آج کل ہمارے ظرف کے پیمانے کتنے مختصر ہوتے ہیں اور انانیت کتنی قوی ہوتی ہے اور یہ خاتون تو بالکل گھروالی اور خالص ماں نظر آرہی تھیں، البتّہ پڑھانے والوں کی سی مستعدی اور منظّم عادات کا احساس دُور ہی سے دیکھ کر ہوتا ہے اور ان کو دیکھتے ہی تدریس سے ان کے تعلّق کا احساس ہوا۔

اُس شام بھی جمیل صاحب کی خوبصورت اور بے حد نفاست سے چھٹی ہوئی لان کے جس حصّے پر ہم بیٹھے تھے، وہاں مدّھم مدّھم سی روشنی تھی جو ٹھنڈک کے ساتھ تحفّظ کا احساس دلا رہی تھی۔ اس لیے کہ میرے ذہن میں ایک بار ان تمام گستاخانہ کلمات کی بازگشت ہو رہی تھی جو میں ببّی کو جلانے کی خاطر شاہد صاحب ساقی والے کی شان میں کہا کرتی تھی۔ مجھے اس وقت بہت کچھ یاد آرہا تھا۔

ببّی یاد آرہی تھیں۔ قمر باجی کا خیال آرہا تھا۔ پوپلے مُنہ سے پیٹ ہِلا ہِلا کر ہنستی ہوئی پٹھانی بواجن کو ساقی کا انتظار یُوں رہتا تھا کہ اس کے افسانے اور مزے دار مضمون سُنتے سُنتے اُجرت کی سلائی پر ان کا ہاتھ جلد اور تیز چلتا تھا۔ امّاں یاد آئیں اور وہ گھر یاد آیا تھا جہاں سے زندگی کا قافلہ روانہ ہوا تھا۔ مَیں نے جمیل صاحب کو کہتے سُنا "ابھی ابھی راستے میں شاہد صاحب نے بتایا آپ رفیق حسین جعفری کی بھانجی ہیں"۔ پھر وہ ان کے افسانوں کے متعلّق باتیں کرنے لگے۔ مَیں اُن کی آواز جیسے دُور سے سُن رہی تھی ——— ان کی لان پر

خوبصورت گلاب کھل رہے تھے، مگر میرے سامنے ان کے بجائے مولسری کی وہ نیچی اور گھنی جھاڑی تھی جو صحن کے مغربی کونے پر تھی۔ مَیں سُرخ کھپریلوں کے درمیان پُھدکتی گلہریوں کا نظارا کر رہی تھی اور مالتی کے جھومر سے گچھوں کی مہک ناک میں گُھسی چلی آ رہی تھی۔ شاہد صاحب کے پیشِ نظر کیا ہوگا، وہ آیا وہیں جمیل صاحب کے لان پر حقیقتاً موجود تھے یا وہ بھی میری طرح اُس وقت کہیں اور گئے ہوئے تھے۔ کون جانے۔ وہ مجھے سُست اور بیمار سے نظر آ رہے تھے۔ مَیں نے وجہ دریافت کی تو اُنہوں نے اپنی بیماری اور اس سے متعلّق تکلیفوں کا ذکر کیا۔ بظاہر وہ اتنے بیمار اور ناتواں نظر نہیں آ رہے تھے، لیکن خدا گواہ ہے میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہے گاہے خیر طلبی کے بے لوث کارڈ لکھنے والا یہ انسان مجھے اب دوبارہ نظر نہیں آئے گا۔ شاہد صاحب کے سامنے ادبی قسم کی گفتگو کا سوال ہی نہ تھا۔ ایک دریا کے کنارے بیٹھ کر صراحی جیسے تنگ سے ظرف میں پڑے پانی کے چند قطروں کا ذکر دریا کی توہین ہی تو ہوتی ہے، چناں چہ دوا، پرہیز کراچی اور لاہور کے موسموں، آب و ہوا، جمیل جالبی صاحب کے علاوہ اور سہارن پور کے آموں کی باتیں دل لگا کر ہوتی رہیں۔ انہوں نے کھانا بھی مختصر کھایا۔ ان ہی کی خاطر ہم لوگ جلد ہی جمیل صاحب کے ہاں سے اُٹھے۔ اُن کے گھر کی طرف چلے تو وہ کسی اور ہی گھر پر گاڑی ٹھیرا کر اُتر گئے۔ یہاں رات گئے تک رِیاض ہونا تھا۔ مجھے معاً خیال آیا شاہد صاحب اس فن کے بھی شناور ہیں، مگر کیا کہیئے وہ آدمی دیکھنے میں بڑا معمولی اور غم زدہ سا لگتا تھا کہ دیکھ کر کسی بات کا خیال ہی نہ آئے بجز اس کے اندر کے اضطراب کے۔ وہ اُترے تو مجھے رات کے

اندھیرے میں بڑھتے ہوئے اس انسان کو دیکھ کر بڑا دُکھ سا ہوا - پتہ نہیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ جب انسان اتنی بے تعلقی سے گردوپیش پر نظر ڈالنے لگتا ہے تو پھر اس خرابے میں زیادہ دیر نہیں ٹھیرتا - کچھ گاڑی کی اور کچھ اپنے قدموں کی دُھول میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے - نہ جانے کیوں دل بہت ہی کُڑھ رہا تھا -

لاہور آ کر فکر سی لگی رہی - اپنی عادت کے خلاف پابندی سے ان کی خیریت پچھواتی رہی - پھر جمیل بھائی نے ان کی بیٹی کی اچانک وفات کا لکھا - مَیں نے شاید ان کو تعزیت نہیں لکھی تھی - وہ ٹوٹا ہوا دِل اور بھی نہ ٹوٹ جائے، حادثے کی تکرار اور یاددہانی سے -

پھر ایک دن ان کا اپنا خط آیا جو انہوں نے دل کی تکلیف کے افاقے کے بعد لکھا تھا - مَیں نے ان کو واقعی دل سے لکھا تھا کہ آپ یہاں آ جائیں لاہور کراچی سے آنے والوں کو بہت راس آتا ہے، مگر بیماری اور کمزوری میں اپنا ٹھکانا اور بھی عزیز ہو جاتا ہے، چناں چہ انہوں نے یہی لکھا :

" مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھے دل سے بُلایا ہے، لیکن اب ٹھیک ہونے ہی پر آؤں گا "

ہمارا بُڈھا حسبِ عادت بیٹھے بیٹھے اُٹھ کر آزاد کشمیر چھٹی منانے چل دیا تھا اور جب بہت دن کھانا پکانے کا کام نہ کرو تو کام سے ربط ختم ہو جاتا ہے بلہذا نہایت دل برداشتہ اور اُکھڑے اُکھڑے انداز میں ہنڈیا بھُون رہی تھی - اُس دن فقط میری ہی چھُٹی تھی اس لیے گھر میں کوئی نہ تھا - پھوپا ابّا اندر کمرے میں ریڈیو سُن رہے تھے، شاید گیارہ بجے کی خبریں ——

بُولا کر باہر آگئے۔ "سُنا بیٹی شمو، شاہد احمد ختم ہو گئے۔"

"کون؟" مَیں چونکی۔

"شاہد احمد دہلوی، ڈپٹی بشیر احمد کے لڑکے۔" ان کی آواز بھرّا رہی تھی۔ "بڑا وضع دار انسان تھا۔ دادا کا وارث ادب کی کیسی خدمت کر گیا۔"

مجھے شاہد صاحب کے ختم ہونے کے بجائے ان کی بات پر حیرت ہو رہی تھی۔ بظاہر تو ان کو ادب سے کوئی گہرا لگاؤ نہ تھا اور مَیں نے پھوپا ابّا کو خالص ادبی چیزیں کم ہی پڑھتے دیکھا، مگر اُن کو کس درجہ قلق ہو رہا تھا اُس اُردو ادب کے خادم کی موت پر۔

پھر اہلِ ادب کے قلق کا کیا عالم ہونا چاہیے؟

عجیب بات تھی مَیں ان کی موت کے بجائے دوسری باتوں پر غور کر رہی تھی۔

پھر یُوں ہوا مجھے قطعی یاد نہ رہا کہ اُن دنوں مجھے کام کرنے کا ربط نہیں رہا ہے اور یہ کہ اُس وقت خاصی گرمی ہے، بلکہ میں نے ہر بات بھُول کر بڑے دل لگا کر سالن تیّار کیا اور روٹی ڈالتے ڈالتے سوچنے لگی چلو چھُٹّی ہوئی۔ ایک شخص تھا جو بہت دن خط نہ ملنے اور خیریت نہ معلوم ہونے پر کارڈ ڈال دیا کرتا تھا تھوڑا سا خفیف سا ناراضگی کا انداز لیے کہ خیریت لکھو۔ پھر وقت نکال کر خیریت لکھنا پڑ ہی جاتی تھی، اور اب تو کوئی نہیں لکھے گا نا ——

تیسرے دن مجھے اُس ماہ کا ساقی کا شمارہ مِلا یقین نہ آتا تھا کہ شاہد صاحب ساقی والے نہیں رہے اس دنیا میں۔ کوئی جیسے کہہ رہا تھا تم تو ساقی وصول کر کے بیّا سے جا کر کہتی تھیں:

شاہد صاحب کہہ رہے ہیں میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس لیے ساقی دیر سے آیا ہے لاتا کیسے۔

اور اب دیکھو وہ کہہ رہے ہیں۔

مَیں مرگیا پھر بھی ساقی پڑھنے والوں کو وقت سے پہنچ رہا ہے۔

مَیں نے ان کی بیگم کو آج تک تعزیت کا خط نہیں لکھا۔ بات یہ ہے کہ شاہد صاحب مرنے والوں میں سے نہیں ہیں تو فضول خط لکھنے سے فائدہ۔

میرے سلیقے سے میری نبھی محبّت میں

میرزا ادیب

یوں تو زندگی بسر کرنا کوئی کٹھن کام نہیں ہے۔ جب دنیا میں آتے ہیں تو کسی نہ کسی طرح زندگی گزار ہی لیں گے۔ شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن۔ اس کے لیے نہ تو کسی معیّن فلسفے کی ضرورت ہے اور نہ معیّن نظریے کی، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ زندگی گزارنا بھی ایک ہُنر ہے کچھ غلط بات نہیں ہے، کیوں کہ کسی سلیقے سے زندگی بسر کرنا واقعی ایک بڑا ہُنر ہے۔ بے سلیقہ زندگی فقط زندگی ہے اور باسلیقہ زندگی ایک ہُنر۔ میر تقی میر کی زندگی میں کتنا کرب تھا اور یہ محض اس وجہ سے کہ اس نے ایک خاص سلیقے سے زندگی نبھائی تھی اور یہی حال شاہد احمد دہلوی کا جو ۲۷ مئی کی رات کو ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

شاہد احمد دہلوی نے اکسٹھ برس کی عُمر پائی۔ اکسٹھ برس کی عمر کوئی زیادہ طویل عُمر نہیں ہے، لیکن جب زندگی کا ایک دن بھی کسی اصول، کسی طریقے، کسی سلیقے سے بسر کرنا مشکل ہوتا ہے تو پھر یہ زندگی جو ایک اُوپر ساٹھ برس پر پھیلی

ہوئی ہے، کتنی طویل نظر آتی ہے! کتنی کرب آفریں محسوس ہوتی ہے۔

وہ دہلی کے ایک بڑے معزز اور متموّل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُنہیں ورثۃً وہ سب کچھ مِل گیا تھا جو بڑی آسانی سے آبرومندانہ زندگی کی کفالت کرسکتا ہے۔ کس چیز کی کمی تھی ان کے ہاں؟ کون سی نعمت تھی جو انہیں حاصل نہیں تھی؟ دادا اُردو کا بہت بڑا مصنّف تھا۔ اس نے جو کچھ چھوڑا مادّی یا غیر مادّی، شاہد احمد اس کے جائز حقدار تھے، لیکن انہوں نے خاندانی عزّو شرف کی متاعِ بے بہا کو تو سینے سے لگالیا اور جو کچھ مادّی طور پر ملا اُسے اُردو ادب کی ترقی و توسیع میں صرف کرنے لگے۔ آخر انہیں اس تگ ودَو کی ضرورت کیا تھی؟ کیا فرض تھا کہ وہ باپ دادا کی کمائی کو رسالہ "ساقی" کے لیے خرچ کرتے؟ نہیں ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی، ایسا کوئی فرض نہیں تھا، مگر معاملہ یہ تھا کہ وہ زندگی میں بے سلیقگی برداشت نہیں کرسکتے تھے! جب سلیقے سے زندگی بسر کرنی چاہی تو وہی کچھ ہوا جو اصولاً ہونا چاہیے تھا۔

آغازِ کار میں تو یہ سلیقہ ان پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈال سکا۔ جائداد کافی تھی۔ ساقی کی محفل جمی رہی اور مکتبۂ ساقی کی مطبوعات بھی رواں دواں رہیں۔ شاہد احمد خوش حالی سے دُور ہوگئے، تاہم توازن قائم تھا۔ انہوں نے جس سلیقے کو اپنایا تھا وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ابھی کسی وادیٔ پُرخار میں نہیں لایا تھا۔ روپیہ آتا کم تھا جاتا زیادہ تھا، مگر اس میں انہیں کسی دِقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس سلیقے نے اپنے چھپے ہوئے پنجے تو اس وقت نکالے جب وہ تقسیمِ برّصغیر کے بعد اپنا سب کچھ دہلی میں چھوڑ کر پاکستان آگئے!

قلندرانہ آزمائش اب شروع ہوتی ہے۔

اب اُنہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک وادیٔ پُرخار میں آ گئے ہیں۔

اب اُنہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس سلیقے کی چھاؤں میں انہوں نے زندگی کا سفر شروع کیا تھا وہ چلچلاتی ہوئی بے رحم دُھوپ میں تبدیل ہو چکا ہے!

پُرانے سلیقے کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس میں بڑی سہولت کے ساتھ تغیر و تبدّل کیا جا سکتا تھا، لیکن وہ جو میؔر نے کہا ہے "ہر سے سلیقے سے میری نبھی محبّت میں" یہ بات تو لازماً ختم ہو جاتی!

شاہد احمد کی تو زندگی ہی یہ سلیقہ تھی، وہ یہ سلیقہ کس طرح چھوڑ سکتے تھے! یہ سلیقہ تو جاں کے عوض ان کے ہر رگ و پے میں ساری تھا۔

دہلی میں ڈپٹی نذیر احمد کی شان دار حویلی کے اندر جب 'ساقی' نے ادب کی پیمانہ برداری کا فرض اپنے ذمّے لیا تو رونقِ محفل کا سب سامان موجود تھا۔ اس کے برعکس جب وہ پاکستان میں آئے تو وہ اپنی جمی جمائی محفل اور سامانِ محفل سب کچھ دِلّی میں چھوڑ آئے تھے۔ اب تو اُن کے لیے خود زندہ رہنا بھی کارِ دارد کا سا معاملہ تھا۔ ساقی کا ساتھ نبھانا بہت مشکل تھا، مگر ساقی کے بغیر زندہ رہنا انہیں پسند نہیں تھا اور پسند کیوں کر ہوتا۔ ساقی تو ان کے لیے رُوحِ رواں تھا۔ نفسِ ناطقہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ اُن کی زندگی کا سلیقہ تھا۔

اُن کی سلیقہ شعاری کا تقاضا یہ تھا کہ ساقی کو ہر قیمت پر، ہر حال میں زندہ رکھتے، اور انہوں نے عہد کر لیا کہ وہ اسے زندہ رکھیں گے اور انہوں نے ہر قربانی پر اسے زندہ رکھا! شاہد احمد صرف صاحبِ طرز ادیب ہی نہیں تھے، بہت اچھے ایڈیٹر بھی تھے اور صرف اعلیٰ پائے کے مترجم ہی نہیں تھے، کلاسیکی موسیقی میں بھی انہیں اُستادی کا درجہ حاصل تھا، چناں چہ انہوں نے ریڈیو پاکستان میں ملازمت کر لی۔ جو

جو کچھ کماتے تھے اس سے اپنے اور اپنے کُنبے کے لیے قوّتِ لایموت حاصل کرنے کے بعد ساری رقم 'ساقی' پر صرف کر دیتے تھے۔

مجھے ذاتی طور پر اس زمانے کا علم ہے کہ اُس زمانے میں ان کے کئی بڑے مخلص احباب نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ 'ساقی' بند کر دیں۔ اب اس کی اشاعت آپ کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکی ہے۔ شاہد احمد نے جواب دیا تھا:

"جب اور اتنے مسئلے پیدا ہو گئے ہیں تو ایک مسئلہ یہ بھی سہی۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ مسکرا رہے تھے۔ مجھے یہ مسکراہٹ کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ مسکراہٹ اس شمع دان کی بلّوریں دیواروں سے نکلتی رہی۔ شفّاف روشنی نہیں تھی جو کسی محل کی چھت سے آویزاں ہو —— یہ مسکراہٹ تو مٹی کے اس چراغ کی لَو تھی جو آندھیوں کے طوفانی جھونکوں سے نبرد آزما ہو اور پُوری ہمت سے مقابلہ کر رہا ہو۔

مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ مَیں ان کے اس سلیقے کی کس طرح تشریح کر سکتا ہوں۔ اگر میں عام مفہوم کے سہارے اپنی بات کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ ان کا یہ سلیقہ عبارت تھا اہلِ دل کی وضع داری سے، بالکل اہلِ دِلّی کی وضع داری سے۔ میر نے دل کو دِلّی بنا دیا تھا اور شاہد احمد نے دِلّی کو دِل!

"ساقی کو انہوں نے زندہ رکھا کہ یہ ان کی وضع داری تھی اور اس وضع داری کے اندر بھی ان کی ایک اور نوع کی وضع داری قائم تھی۔

اپنے اس پرچے میں اُنہوں نے جن لوگوں کو اہمیت دی پھر کیا مجال جو ان کی وضع داری میں ذرّہ برابر بھی فرق آیا ہو۔ 'ساقی' کے ابتدائی زمانے میں انہوں نے جن لوگوں کی تخلیقات کو خاص اہتمام سے شائع کرنا شروع کیا تھا، آخر تک ان کا یہ انداز

عملاً قائم و برقرار رہا ان کے احباب نے بارہا ان کی توجہ اس امر کی طرف دلائی کہ شاہد صاحب آپ جن اہلِ قلم کی کاوشوں کو اس قدر نمایاں طور پر چھاپتے ہیں وہ وقت سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کی مقبولیت میں بہت فرق آگیا ہے۔ اب آپ ان کا دامن چھوڑ دیں، مگر شاہد احمد صاحب کا جواب صرف ایک مسکراہٹ ہوتا تھا۔ وہ مسکراہٹ جو ان کی وضع داری کی علامت بن گئی تھی اور آخری سانس تک بنی رہی۔

انہیں اُردو ادب کی خدمت کی لگن تھی۔ وراثت میں انہیں علمی اور ادبی ذوق ملا تھا، مگر یہ لگن ان کی اپنی تھی، یہ ان کی انفرادی خصوصیت تھی، اکتسابی امتیاز تھا۔ وہ صرف مدیر نہیں تھے، خود صاحبِ قلم بھی تھے۔ ان کی ذہنی تگ و دو صرف ادارتی شذرات تک محدود نہیں تھی۔ صاحبِ طرز ادیب بھی تھے۔ شخصیت نگاری میں ان کا جواب نہیں تھا جن لوگوں کے خاکے انہوں نے لکھے ہیں، انہیں ان کے خارجی نقوش اور داخلی کوائف کے ساتھ تحریر کی دنیا میں لے آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں بڑی وسعت تھی۔ جو شخص بھی ایک بار ان کے قریب آتا تھا وہ اسے چُپ چاپ اُٹھا کر دل کی گہرائیوں میں لے جاتے تھے۔ پھر وہ اعلیٰ درجے کے مترجم بھی تھے، مورس میٹرلنک کے ڈرامے کا جو ترجمہ ان کے قلم سے نکلا ہے، وہ ان کا ترجمے کے باب میں خاص قدرت و مہارت کی نشان دہی کرتا ہے۔

مَیں ان کی تحریر کو جب بھی پڑھتا تھا تو یہ احساس ہوتا تھا کہ کچھ سیکھ رہا ہوں اور شروع شروع میں انہوں نے ہی تو میری ہمت افزائی کی تھی۔ میری پہلی تخلیق 'ساقی' میں اشاعت پذیر نہیں ہوئی تھی، مگر حق یہ ہے کہ ساقی کے شاہد احمد نے مجھے جس محبت، جس خلوص اور کشادہ دلی سے نوازا تھا، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایڈیٹر تو پیدا ہوتے رہتے ہیں، ہوتے رہیں گے، مگر شاہد احمد کا جواب مشکل ہی سے ملے گا۔ وہ

ایڈیٹر نہیں تھے۔ سچے ہمدرد، سچے دوست بھی تھے۔ انہیں اُردو ادب سے بے پناہ محبت تھی۔ اس لیے وہ ہر اس شخص کے لیے دل کا دروازہ کھول دیتے تھے جسے اُردو ادب سے کچھ تعلق ہوتا تھا۔ کچھ بننے کے لیے انسان کو اپنی ذاتی صلاحیتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ بغیر ذاتی صلاحیتوں کے کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں دیا جاسکتا، مگر اس معاملے میں ——— ہمت افزائی بہت ضروری ہے۔ شاہد احمد ہمت افزائی میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیتے تھے۔ آج اُردو ادب میں جو نام بڑے نمایاں نظر آتے ہیں، ان کی بیشتر تعداد ساقی کے صفحات سے اُبھری تھی۔ ساقی کے ہر مضمون نگار کے خط کا التزاماً جواب دیتے تھے اور کسی کے مطالبے کو بھی حتی الامکان رد نہیں کرتے تھے۔ مجھے وہ واقعہ خوب یاد ہے کہ جب مَیں نے ساقی کو پہلا مضمون بھیجا تھا تو ساقی کا وہ خاص نمبر بھی طلب کیا تھا جسے شائع ہوئے کچھ مُدت گزری تھی۔ شاہد احمد نے جواباً لکھا تھا کہ اس وقت خاص نمبر کی کوئی کاپی دفتر میں نہیں ہے۔ کوشش کرکے کہیں سے حاصل کروں گا اور ارسالِ خدمت کردوں گا اور چند روز بعد مجھے ایک پیکٹ وصول ہوگیا۔ یہ ساقی کا خاص نمبر تھا۔ مجلد۔ انہیں کہیں سے پھٹا ہوا پرچہ ملا تھا جسے اُنہوں نے خوبصورت جلد بندھوا کر مجھے بھیج دیا تھا۔

واقعہ زیادہ اہم نہیں ہے، مگر مَیں جانتا ہوں کہ ان کے اس برتاؤ نے مجھے کتنی خوشی بخشی تھی!

شاہد احمد کا وجود ادب اور ادیبوں کے لیے وقف تھا۔ کراچی پہنچ کر ان کو کبھی معاشی آسودگی نہیں مل سکی۔ اس پر بھی ان کا اندازِ خاص کسی طور متاثر نہ ہوا۔ سعادت حسن منٹو کے انتقال پر ان کے بھانجے جناب حامد جلال نے اُردو کے ناشرین سے کہا کہ وہ منٹو مرحوم کی تصانیف کے اشاعتی حقوق وہ رقوم وصول کرکے

واپس کر دیں جو اُنہوں نے مصنّف کو دی تھیں۔ شاید چند ایک ناشرین نے حامد جلال سے اس قسم کا معاہدہ کر لیا تھا، چناں چہ انہیں کچھ کتابیں واپس مل گئی تھیں۔ شاہد احمد نے منٹو کے دو افسانوی مجموعے شائع کیے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کتابوں کا حقِ اشاعت ایک پیسہ لیے بغیر بیگم منٹو کو دے دیا۔ ایک طرف ناشرین کا رویّہ دیکھیے کہ وسیع کاروبار کے مالک ہیں، مگر ایک مصنّف کو دی ہوئی رقم میں کوئی رعایت نہیں کرتے اور دوسری طرف شاہد احمد صاحب کہ اقتصادی اُلجھنوں میں مبتلا ہیں۔ اس کے باوجود اپنی دو بہت بکنے والی مطبوعات کو چھوڑ رہے ہیں!

یہ ان کی وضع داری نہیں تو اور کیا تھا ——— یہ ان کا خاص سلیقہ نہیں تھا تو کیا تھا۔

مَیں شاہد احمد دہلوی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے فی المغفور جہاں آباد کی وہ روایات یاد آجاتی ہیں جنہوں نے اپنی گود میں شرافت، وضع داری، ایثار، خلوص اور محبّت کے احساسات کی پرورش کی تھی۔ ان سب کا نام دہلویت ہے دہلویت، جس میں جہاں دہلی کے لال قلعے کی عظمت و تجمّل پر توانگن ہے، وہاں دہلی کی جامع مسجد کی وسعت و پاکیزگی بھی کار فرما ہے۔ اسی دہلویت کی تخلیق میں مغلوں کی قلبی وسعت، فطری لطافت، میر اور درد کے سوز و گداز اور غالب کی انسان دوستی نے حصّہ لیا تھا۔ یہ دہلویت کوثر و تسنیم کی موجوں میں نہا کر نکلی تھی۔ یہ دہلویت جو ہماری ثقافتی متاع تھی۔ یہ دہلویت تھی جو شاہد احمد تھی! ——— شاہد احمد دہلوی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں۔ ہم نے شاہد احمد کو کھو کر کیا چیز کھو دی ہے۔ کس چیز سے محروم ہو گئے ہیں۔ سوچیے، ذرا سوچیے۔

دلّی کا البیلا ادیب

عبدالمجید قریشی

پیاروں کی موت نے مری دُنیا اُجاڑ دی
یاروں نے کتنی دُور بسائی ہیں بستیاں

دل کا مرض خدا کسی دشمن کو بھی نہ لگائے۔ اپنی کہی نہ دوسروں کی سُنی اچھا بھلا انسان دم بھر میں چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ اس سال بارہ فروری کا ذکر ہے اخبار "جنگ" کراچی میں یہ خبر میری نظر سے گزری کہ "ساقی" کے ایڈیٹر جناب شاہد صاحب دہلوی پر دل کا شدید دورہ پڑا اور اب وہ جناح سنٹرل ہسپتال میں داخل ہیں۔ اس خبر کو پڑھ کر جی دھک سے رہ گیا۔ دل میں وہم سا اُٹھنے لگا اللہ نہ کرے کہیں شاہد صاحب کو کچھ ہو جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مرحلے پر مجھے "نوائے وقت" لاہور کے جواں مرگ ایڈیٹر جناب حمید نظامی مرحوم یاد آ گئے جو اب سے کوئی پانچ ساڑھے پانچ برس پیشتر اسی مرض میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ شاہد احمد تو پھر بھی ساٹھ سے نکل چکے تھے وہ بیچارے تو ابھی پچاس کے بھی نہ ہونے پائے تھے، لیکن

میرا یہ وہم غلط ثابت ہوا۔ دُنیا میں شاہد صاحب کا آب و دانہ ابھی کچھ عرصے باقی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ تندرست ہوتے چلے گئے اور کوئی تین ہفتوں بعد خیر سے گھر واپس آ گئے۔ ان کی علالت کے دوران میں مَیں نے ان کو مزاج پُرسی کا جو خط لکھا تھا، اس کا جواب مارچ کے آخر میں موصول ہوا۔ انھوں نے مزاج پُرسی کا شکریہ ادا کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اب وہ ماشاء اللہ تندرست اور صحت مند ہیں۔ اُن کا یہ خط ملنے پر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ ان کی جان بچ گئی، لیکن کسے خبر تھی کہ اسی برس ستائیس مئی کو ایک بار پھر اُن پر دل کا دَورہ پڑے گا اور اس مرتبہ یہ دَورہ اس قدر شدید ہو گا کہ نہ دوا دینے کی نوبت آئے گی اور نہ دُعا کرنے کا لمحہ نصیب ہو گا اور وہ خاموشی سے سوئے عدم روانہ ہو جائیں گے۔

شاہد احمد صاحب سے میری مُلاقات کبھی نہ ہوئی، تاہم علم و ادب سے گہری دلچسپی اور دلی وابستگی کی بنا پر مُلک کے جن ادیب اور اہلِ قلم حضرات سے خط و کتابت اور مُراسلت کا شرف حاصل ہوا، اُن میں جناب ضیاء الدّین احمد برنی، حضرت ملّا واحدی، خاں بہادر نقی محمد خاں اور جناب مشفق خواجہ کے علاوہ جناب شاہد احمد دہلوی بھی تھے۔ شاہد احمد صاحب سے غائبانہ تعارف بہت عرصے سے حاصل تھا۔ قیامِ پاکستان سے قبل ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۰ء کے قیامِ دِلّی کے زمانے میں جب مَیں وہاں عربک کالج میں تعلیم پاتا تھا، کالج کی لائبریری میں اُن کا "ساقی" ہر مہینے نظر سے گزرتا جو اس زمانے کے ادبی رسائل میں اپنی ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ دِلّی میں کھاری باؤلی کے بازار سے گزرتے ہوئے ایک گلی کی نکّڑ پر لگے ہوئے "دفترِ ساقی" کے سائن بورڈ کو بھی بارہا دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ دراصل پڑھنے لکھنے کا چسکا مجھے اُسی زمانے سے تھا، حالاں کہ شاہد صاحب کی

طرح مَیں بھی بجائے ادب کے سائنس کا طالب علم تھا۔ مجھے ادبی رسائل کے ایڈیٹر صاحبان سے مُلاقات کا بڑا اشتیاق تھا، چناں چہ اپنے اسی شوق کے پیشِ نظر ایک روز ان کے دفتر تک بھی جا پہنچا، لیکن خواہش کے باوجود ملنے کا حوصلہ نہ ہُوا اور واپس چلا آیا۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ عربک کالج دِلّی کے طلبائے قدیم میں سے ہیں۔ کالج کی ادبی محفلوں میں شمولیّت کے مجھے بڑے مواقع ملے۔ بہت سی ادبی شخصیّتوں کو وہاں دیکھا، لیکن سُوئے اتّفاق سے کالج کے کسی ایسے اجتماع میں بھی اُن کو کبھی نہ دیکھا۔ کراچی جانے کے لیے مدّتوں پَر تولتا رہا، لیکن بُرا ہو میری تہی دامنی کا کہ یہ آرزو بھی دَم توڑ کر رہ گئی۔ بہر حال اُن کی زیارت اور اُن سے مُلاقات نہ ہونے کا ہمیشہ ہمیشہ ملال رہے گا۔

"ساقی" کے "عمرِ رفتہ نمبر" میں "عمرِ رفتہ" کے خالق خان بہادر نقی محمد خاں کی باغ و بہار شخصیّت کے متعلّق اُنھوں نے اپنے پیش لفظ میں جن تاثّرات کا اظہار کیا تھا، وہ مختصر ہونے کے باوجود بڑے دِلچسپ اور پُر لُطف تھے۔ اُنھوں نے اپنے اس پیش لفظ کی ابتداء حضرت میر تقی مِیرؔ دہلوی کے اس خوبصورت شعر سے کی تھی ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر ایسی باتیں نہ سُنیے گا
کرتے کسی کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

مَیں نے اس شعر کا بہت لُطف اُٹھایا۔ اُس وقت خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک روز شاہد احمد صاحب بھی اچانک ہم سے جُدا ہو جائیں گے اور مَیں اُن کا لکھّا ہوُا یہ شعر انہی کو یاد کرتے ہوئے بہ چشمِ نم بار بار پڑھنے پر مجبور رہوں گا۔ اس شعر میں جو درد اور کرب پوشیدہ ہے اس کی شدّت کا احساس مجھے پہلی مرتبہ

شاہد احمد صاحب کی وفات پر ہوا۔ شاہد صاحب دُنیا کی محفلوں سے رخصت ہو گئے، لیکن میرے دل کی دنیا میں وہ ہمیشہ آباد رہیں گے۔ اُن کی باتیں میں بھلا کیسے بُھلا سکوں گا۔ جی ہاں "یہ ساقی کے شمارے، یہ "گنجینۂ گوہر" یہ "دلی کی بپتا" اور یہ "انجام" میں اُن کا سلسلۂ مضامین "دِلّی جو ایک شہر تھا" یہ سب اُن کی باتیں ہی تو ہیں اور یہی تو وہ باتیں ہیں جن کو پڑھ کر دیر تلک سر دُھننے کو جی چاہے گا۔ شاہد احمد دہلوی یقیناً کاروانِ دلّیِ مرحوم کے آخری نقیب تھے۔ اب کون ہے جو دلّیِ مرحوم کی باتیں کرے گا اور کون اُس اُجڑے دیار کی یادوں کو گلے لگائے گا۔ وہ شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کے پوتے اور مولوی بشیر الدّین احمد صاحب کلکٹر حیدرآباد کے بیٹے تھے۔ یہ دونوں حضرات نہ صرف بلند پایہ ادیب اور مصنّف تھے، بلکہ دُنیوی حیثیّت سے بھی ان کا شمار دِلّی کے رُوسا میں ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے شاہد صاحب نہ صرف ادیب ابنِ ادیب ابنِ ادیب تھے، بلکہ رئیس ابنِ رئیس ابنِ رئیس بھی تھے۔ جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلّق تھا، وہ ہاتھ کے سخی اور دل کے غنی تھے۔ جن لوگوں نے دلّی کا مشہور تجارتی مرکز کھاری باؤلی دیکھا ہے' وہ خوب جانتے ہیں کہ دِلّی کے اس علاقے میں غیر منقولہ جائداد کی کیا قدر و قیمت تھی۔ وہ ڈپٹی صاحب اور مولوی صاحب کی چھوڑی ہوئی لاکھوں کی جائداد کے وارث تھے اور دلّی میں ہزاروں میں کھیلتے تھے۔ اُس زمانے میں انہوں نے ماہ نامہ "ساقی" اور "مکتبہ ساقی" کی بنیاد رکھ کر ادبی دُنیا میں نہ جانے کس کس کی مدد کی تھی۔ دِلّی چھوڑ کر وہ کراچی آئے تو ظاہر ہے کہ ان کی بات بگڑ چکی تھی، لیکن اس کے باوجود اُن کی عالی ظرفی اور بے نیازی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ یہاں بھی وہ اپنی انہی روایات کو اپنائے ہوئے تھے۔ بات بہت چھوٹی سی ہے' لیکن اس زمانے میں اس کی

مثال شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ مِل سکے گی۔ چند سال ہوئے میرے دوست جناب رُستم علی خاں نے "ساقی" میں اشاعت کی غرض سے اپنا پہلا افسانہ اُن کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس افسانہ کے ساتھ انہوں نے ایک روپے کے ڈاک کے ٹکٹ بھی ارسال کیے تاکہ ناقابلِ اشاعت قرار دیے جانے کی صورت میں وہ ان ٹکٹوں کو اس افسانے کی واپسی کے سلسلے میں استعمال کرسکیں۔ شاہد احمد صاحب نے اس افسانے کو قابلِ اشاعت قرار دیا اور وہ ٹکٹ ان کو واپس کر دیے، نہ صرف یہ بلکہ ان ٹکٹوں کی واپسی کے لیے جو لفافہ اُنہوں نے استعمال کیا، وہ ادارۂ ساقی کا اپنا تھا۔

مَیں اُن سے گاہ بہ گاہ مکتبۂ ساقی کی شائع کردہ پُرانی کتابیں اور ساقی کے مختلف شمارے طلب کرتا رہتا تھا۔ میری گزارش پر وہ مجھے نہ صرف محصولِ ڈاک کی رعایت سے نوازتے رہتے، بلکہ کتابوں اور رسائل کی قیمتوں میں بھی مناسب تخفیف فرمادیتے تھے۔ لیکن ایک مرتبہ مَیں نے اُن پر یہ ظلم کیا کہ صرف ایک پرچے پر ۳۳ فی صد کمیشن اور محصول ڈاک کی رعایت کے لیے لکھ دیا۔ اس سلسلے میں ان کا جو گرامی نامہ آیا وہ حسب ذیل تھا:۔

> "عمرِ رفتہ" کا ایک پرچہ بذریعہ رجسٹری حاجی محمد زبیر صاحب کو علی گڑھ بھیج دیا ہے۔
>
> ایک پرچے پر ۳۳ فی صد کمیشن اور سات آنے محصول ڈاک اگر دیا جائے تو دو روپے کا پرچہ چودہ آنے کا رہ جاتا ہے، بہر حال آپ کا حکم تھا اسی لیے بھیج دیا۔"

ظاہر ہے ان کے اس خط کو پڑھنے کے بعد مجھے کس قدر شرم دامن گیر ہوئی ہو گی۔

"ساقی" سے اُنہیں غیر معمولی محبّت اور والہانہ اُنس تھا۔ اس رسالے کو انہوں نے خونِ جگر پلایا تھا اور اپنے بچّوں کی طرح پالا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دِلّی میں تباہ و برباد ہونے کے بعد جب وہ کراچی میں آباد ہوئے اور انہیں اطمینان سے چند لمحات میسّر آئے تو انہوں نے فوراً "ساقی" کو جاری کرنے کی ٹھان لی اور نہایت نامساعد حالات میں وہ اسے بیس برس تک نکالتے رہے، حالاں کہ جہاں تک مجھے علم ہے "ساقی" جاری رکھنے میں انہیں کسی قسم کی مالی منفعت یا مادّی فائدے کے بجائے نقصان ہی نقصان تھا، تاہم وہ وضع داری نبھاتے چلے جارہے تھے۔ دراصل ہم میں سے کچھ لوگ جانتے بُوجھتے ہوئے اپنی زندگی میں خسارے کا سودا کرتے ہیں۔ شاہد احمد صاحب بھی انہی میں سے ایک تھے۔ اُنہوں نے زندگی بھر "ساقی" کو مرنے نہ دیا۔ وہ جب تک جیے "ساقی" بھی جِیا اور اب جب کہ وہ اپنے مَولا کے حضور میں حاضر ہو گئے "ساقی" ان کی یادگار کے طور پر خدا کرے زندہ رہے، تاہم ان کا مشن ختم ہُوا۔ "ساقی" کے مخدوش حالات کے پیشِ نظر کئی مرتبہ احباب نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ "ساقی" کو ایک ادبی ڈائجسٹ کی حیثیت سے نکالیں، لیکن انہیں "ساقی" کے انداز میں تبدیلی گوارا نہ تھی۔ انہوں نے ہمیشہ اس تجویز کی مخالفت کی اور یہی فرماتے رہے کہ "ساقی" اگر زندہ رہے گا تو اسی صورت میں ورنہ اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہوگا۔ وہ "ساقی" کے مُدیرِ اعلیٰ تھے، لیکن انہیں اس کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینے میں کوئی عار نہ تھا۔ "ساقی" کے خریداروں کے پتے وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ صرف مارچ ۶۷ء کے "ساقی" کا شمارہ ہی ایسا شمارہ تھا جس کی چِٹوں پر پتے اُن کے قلم سے لکھے ہوئے نہ تھے، کیوں کہ اُن دنوں وہ بہ عارضۂ قلب صاحبِ فراش تھے اور جناح سنٹرل ہسپتال میں زیرِ علاج۔

مَیں نے اُنہیں پہلا خط ۱۹۵۱ء میں لکھّا تھا۔ اُن دنوں "قندیل" لاہور میں ایک مضمون شائع ہُوا تھا جس میں ۱۹۴۷ء کے خوں آشام فسادات کے موضوع پر پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں اور مضامین کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس مضمون میں جناب شاہد احمد دہلوی کے رپورتاژ "دِلّی کی بِپتا" کا تذکرہ بڑے تعریفی انداز میں کیا گیا تھا۔ چوں کہ اس مضمون میں "دِلّی کی بِپتا" کے ناشر کا کوئی پتہ تحریر نہیں کیا گیا تھا، اس لیے مَیں نے براہِ راست شاہد صاحب کو لکھّا کہ وہ "دِلّی کی بِپتا" کی ایک جلد مجھے بذریعہ وی پی بھجوا دیں۔ خط لکھنے کے چند دنوں بعد معمولی ڈاک سے ایک پیکٹ میرے نام موصول ہُوا۔ کھولا تو اس میں سے "دلّی کی بِپتا" برآمد ہوئی۔ اس چھوٹی سی کتاب کو پا کر میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے حال پر اُن کی یہ پہلی مہربانی تھی کہ انہوں نے مجھے نہ صرف "دِلّی کی بِپتا" سے نوازا، بلکہ اس کا محصول ڈاک بھی خود ہی برداشت کیا۔ وہ اسے بہ صیغۂ بیرنگ بھی بھیج سکتے تھے، لیکن یہ چیز اُن کی فطرت میں شامل نہ تھی اور وہ ان باتوں سے بہت بلند تھے۔ "دِلّی کی بِپتا" اُس وقت تک کتابی صورت میں شائع نہ ہوئی تھی، بلکہ وہ رسالہ "نیا دور" کراچی کے "فسادات نمبر" میں ایک طویل مضمون کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ شاہد صاحب نے اپنے اس مضمون کی کچھ جلدیں "نیا دور" سے حاصل کی تھیں جن میں سے ایک انہوں نے بہ کمال شفقت مجھے عنایت فرمائی۔ مَیں نے اس کتاب کو اُنہی دنوں مجلّد کرا لیا تھا اور وہ اب شاہد احمد صاحب کے گراں قدر عطیے کی حیثیت سے میرے کُتب خانے میں موجود ہے۔ مَیں "دلّی کی بِپتا" کا شمار اپنی ان کتابوں میں کرتا ہوں جو مجھے بہت زیادہ عزیز ہیں۔ "دِلّی کی بِپتا" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں "حلقۂ اربابِ فکر" کراچی نے بڑے خوبصورت انداز میں شائع کیا تھا۔ مَیں نے اسے بھی منگا ڈالا، لیکن شاہد احمد صاحب کا وہ لُطف و کرم

مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ فسادات، ۱۹۴۷ء کے موضوع پر مجھے بہت سی کتابیں اور مضامین پڑھنے کا اتّفاق ہوا، لیکن شاہد احمد صاحب کی "دِلّی کی بپتا" سے بہتر کوئی چیز اَب تک نہ مِل سکی۔

شاہد احمد صاحب خطوط کا جواب بڑی باقاعدگی سے دیتے تھے۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ خطوں کے جواب اسی روز لکھ دیے جائیں جس روز وہ اُنہیں موصول ہوں اور اس کوشش میں وہ بڑے کامیاب رہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خطوط کے معاملے میں کسی کو یاد دہانی کا ناخوش گوار فریضہ ادا کرنا پڑے مجھے جب کبھی اُن کی جانب سے اپنے خط کا جواب حسبِ اُمّید نہ ملتا تھا تو میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ اِن دنوں کراچی سے کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں یا پھر ان کی طبیعت زیادہ ناساز ہے۔ جواب طلب اُمور کے لیے میں ان کو لفافہ یا جوابی خط بھیجتا تھا، لیکن بعض مرتبہ نادانستہ یا کسی مجبوری کے پیشِ نظر میں ایسا نہ بھی کرتا تب بھی وہ فوراً جواب عنایت فرماتے اور خط یا لفافے کی قیمت بھی اپنی جیب سے ادا کرتے۔ شاہد احمد صاحب کے اس وصف نے مجھے بہت متاثّر کیا۔ مَیں نے یہ خوبی "فاران" کراچی کے ایڈیٹر مولانا ماہر القادری کے سوا کسی اور صاحب میں نہیں پائی۔ ہمارے ادبی رسائل کے مُدیر حضرات سے مجھے عموماً یہی شکایت رہتی ہے کہ وہ ایک چھوڑ دو دو اور تین تین خط لکھنے کے باوجود جواب دینے کی تکلیف گوارا نہیں فرماتے حتّٰی کہ مضامین کی دو سطری رسید بھیجتے ہوئے بھی انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ چار پانچ خط لکھنے کے بعد اگر اُن کا جواب آیا بھی تو یہی کہ وہ بہت زیادہ مصروف تھے۔ اُن کی یہ "غیر معمولی مصروفیت"، محض ایک بہانہ ہوتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا۔ "تجاہلِ عارفانہ" کی ترکیب آپ نے سُنی ہو گی۔ مَیں اِن حضرات کی اس عادت کو "تساہلِ عارفانہ" سے

تعبیر کردوں گا ورنہ جہاں تک مصروفیت کا تعلق ہے، شاہد احمد صاحب سے زیادہ مصروف اور کون ہوگا۔ ریڈیو پاکستان سے تعلق "ساقی" اور "نقش" کی ادارت اور میوزک اکاڈمی کی صدارت کے ساتھ ساتھ وہ مُلک کے متعدّد علمی و ادبی اداروں سے مختلف حیثیتوں سے منسلک تھے اور اُن کے وقت کا بیشتر حصّہ گوناگوں مصروفیت کی نذر ہوتا تھا، لیکن کیا مجال جو اُن کے اس معمول میں فرق آجاتے۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور اُن کی تحریر قطع و برید سے ہمیشہ پاک ہوتی تھی۔ مَیں نے کوئی خط ان کا ایسا نہیں دیکھا جس میں انہوں نے کسی مقام پر تصحیح کی ہو۔ وہ فاؤنٹین پن کے بجائے عام قسم کے قلم سے لکھتے تھے اور اُن کی سیاہی کا رنگ بھی ہمیشہ یکساں ہوتا تھا۔ خط کی ابتدا وہ "جناب مکرم سلام مسنون" سے کرتے تھے، لیکن بعض اوقات "حضرت مکرم سلام مسنون" اور مکرمی سلام مسنون بھی تحریر فرماتے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ "خاکسار" لکھتے تھے۔ پتہ لکھتے وقت "بخدمت جناب" یا "بگرامی خدمت جناب" کا استعمال کرتے تھے۔ وہ عموماً کارڈ لکھنے کے عادی تھے۔ میں ایک زمانہ میں جوابی خطوط پر اپنا پتہ عموماً انگریزی میں لکھتا تھا۔ وہ جواب ارسال فرماتے وقت میرے نام سے پہلے "مسٹر" لکھ دیتے تھے یا کبھی میرے نام کے بعد "اسکوائر" بڑھا دیتے تھے۔ یہ باتیں دیکھنے میں معمولی نظر آتی ہیں، لیکن اپنے اندر وزن رکھتی ہیں۔

فروری ۵۳ء میں کراچی سے ایک خوبصورت سا ادبی ماہ نامہ آرٹ پیپر پر نکلا تھا "سیّارہ" نام تھا اور عزیز احمد صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ پرچہ نہ صرف ظاہری حُسن و نفاست کے لحاظ سے جاذبِ نگاہ تھا بلکہ رنگا رنگ ادبی مضامین سے بھی مالا مال تھا۔ قیمت بھی مناسب تھی اس لیے خیال تھا کہ وہ دُنیائے ادب میں اپنا ایک خاص مقام متعیّن کرے گا، لیکن نہ جانے اُسے کس کی نظرِ بد لگی کہ جلد ہی فنا کی گود میں چلا گیا۔ "سیّارہ"

کراچی کے اس پہلے شمارہ میں مَیں نے شاہد احمد صاحب کا مضمون "خواجہ حسن نظامی ایک مرقّع" بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ "دِلّی کی بپتا" کے بعد شاہد احمد صاحب کا یہ دُوسرا مضمون تھا جو میری نظر سے گزرا تھا۔ مَیں بیشتر ازیں شخصیات کے موضوع پر رئیس احمد جعفری کی "دید و شُنید"، چراغ حسن حسرت کی "مردم دیدہ" سعادت حسن منٹو کی "گنجے فرشتے" اور رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گراں مایہ" جیسی کتابیں پڑھ چکا تھا، لیکن شاہد احمد صاحب کے اس مضمون میں حُسنِ بیان اور لُطفِ زبان کا کچھ اور ہی انداز ملا۔ میرا خیال ہے کہ شخصیّت کے موضوع پر اُن کا یہ پہلا مضمون تھا اور اس میں وہ بڑے کامیاب تھے۔ جنوری ۵۵ء "نقوش" لاہور کا "شخصیات نمبر" (جلد اول) شائع ہوا۔ اِس میں مشہور مزاح نگار مرزا عظیم بیگ چغتائی کے متعلّق ان کا ایک طویل مضمون شامل تھا جسے مَیں نے بہت ہی پسند کیا اس کے بعد "نقوش" ہی کے ایک عام شمارہ میں انھوں نے اپنے جدِّ امجد شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کے بارے میں ایک طویل مضمون لکھا۔ انہی دنوں "نیا دَور" میں خان بہادر میر ناصر علی مُدیر "صلائے عام" دلّی کی شخصیّت پر بھی ان کا ایک مضمون نکلا تھا۔ شاہد احمد صاحب کے یہ تمام مضامین پڑھنا میرے لیے قیامت ہو گیا۔ میری یہ بہت بُری عادت ہے کہ نادر شاہ کی طرح "حلوائے خوب است دیگر بیارد" کا قائل ہوں۔ مَیں نے شاہد احمد صاحب سے گزارش کی کہ ان مضامین کو کم از کم بیس کی تعداد تک ضرور پہنچا ڈالیے اور پھر انہیں کتاب کی صورت میں مرتّب فرما دیجیے۔ انہی دنوں وہ خان بہادر نقی محمد خاں صاحب ریٹائرڈ ڈی۔ آئی۔ جی پولیس کی خود نوشت داستانِ حیات "عمرِ رفتہ" کو "ساقی" کے ایک خاص نمبر کی صورت میں پیش کر رہے تھے "ساقی" میں جو اشتہار اس موضوع پر نکل رہا تھا اس میں خان بہادر صاحب کا نام کسی مصلحت سے

پوشیدہ رکھا گیا تھا بلکہ یہ کہا گیا تھا کہ "ساقی" کا یہ خاص شمارہ تمام کا تمام ایک اسی سالہ پولیس افسر کے تاثرات و مشاہداتِ زندگی پر مشتمل ہوگا۔ مَیں چوں کہ "ساقی" میں خان بہادر صاحب کے مضامین بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا تھا اس لیے مجھے معلوم تھا کہ یہ اسی سالہ بزرگ پولیس افسر کون صاحب ہیں۔ مَیں نے اپنے اس خط میں اس "راز" کو بھی فاش کیا تھا۔ میرے اس خط کا جو جواب اُن کی جانب سے موصول ہوا وہ حسبِ ذیل تھا:

دفتر ماہنامہ ساقی کراچی ۵

۵۸-۳-۳

حضرت مکرم سلام مسنون

گرامی نامہ ملا شکریہ "طاقِ نسیاں" (یہ وہی کتاب ہے جو بعدازاں گنجینۂ گوہر کے نام سے شائع ہوئی) کے نام سے "نیا دَور" کا مکتبہ میرے اس قسم کے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ چھاپنا چاہتا ہے، مگر مجھے اپنی پریشانیوں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ دو تین شخصیتوں پر مضامین لکھ کر ان کا مجموعہ پُورا کر دوں۔ زندگی بخیر لکھ دُوں گا۔

آپ نے خوب پہچانا مفتی محمد خاں صاحب ہی کی دِل چسپ سوانح عمری اپریل کے ساقی میں شائع ہو رہی ہے۔ ۱۵؍اپریل تک پرچہ مکمل ہو کر آجانا چاہیے۔ پرچہ چھپ جانے پر مَیں آپ کو حسبِ ارشاد پرچے بھیج دُوں گا۔ توجّہ کا شکریہ۔

خاکسار شاہد احمد

شاہد احمد صاحب نے میرا وہ خط خاں بہادر صاحب کو بھی دکھلایا تھا چُناں چہ

انہوں نے بھی مجھے یہ خط تحریر فرمایا:

مکرمی قریشی صاحب

آپ کی ذہانت قابلِ داد ہے میں نے شاہد صاحب سے کہہ کر اپنے آپ کو گم نامی میں رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اسّی سال عمر کے بڈھے کا سراغ لگا کر آپ نے پہچان ہی لیا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرے مضامین پسند آتے ہیں "عمرِ رفتہ" میں فی الحقیقت عجیب و غریب واقعات ہیں۔ شاہد صاحب نے مجھ گم نام اور معمولی شخص کے حالات یکجا چھاپنے کی ہمت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی زیادہ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوں تاکہ ان کو نقصان نہ ہو۔

بندہ نقی محمد خاں

"ساقی" کے "عمرِ رفتہ" نمبر کی اشاعت کے چند دنوں بعد خان بہادر صاحب کا پھر ایک خط آیا جس میں انہوں نے اپنی اس خود نوشت داستانِ حیات کے متعلق میری رائے دریافت کی تھی میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل میں "عمرِ رفتہ" نمبر پر مفصّل تبصرہ کر کے ان کو بھیج دیا جس میں میں نے اس خاص شمارہ کی جی بھر کے تعریف کی تھی۔ ساتھ ہی چند ایسے واقعات کی نشان دہی اور توضیح بھی کی تھی جو میری رائے میں درست نہ تھے۔ میری گزارشات کا خاں بہادر صاحب نے اپنے مفصلۂ ذیل مکتوب کے ذریعہ جواب عنایت فرمایا یہ خط میں صرف اس وجہ سے نقل کر رہا ہوں کہ اس میں شاہد احمد صاحب کا ذکر بھی موجود ہے۔

بندہ نواز السّلام علیکم

عنایت نامہ ملا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس ذرّہ ناچیز کو

آفتاب بنا دیا۔ ان متواتر تعریفوں سے جو عمرِ رفتہ کے سلسلہ میں زبانی تحریری اور ٹیلی فون سے مجھ تک پہنچی ہیں، نوابوں اور رئیسوں کی طرح دماغ پر بُرا اثر ہوا ہے، لیکن ہندوستان کے ایک اخبار کے ریویو نے اس اثر کو زائل کر دیا، کیوں کہ انہوں نے ایمان داری کی بات لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ مُصنّف کو لکھنے کی مشق نہیں ہے۔

بعض واقعات بھی غیر مصدقہ ہیں اور وہی بات اس کتاب میں بھی ہے جو خود نوشتہ کتابوں میں ہوا کرتی ہے؛ تاہم تجربہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مَیں خوش ہوا کہ قدرت نے میرا دماغی علاج کر دیا ہے۔ مَیں نے اُن کو شکریہ کا خط لکھ دیا ہے وہ بھی خوش مَیں بھی خوش ''عمرِ رفتہ'' پر ہمارے اخبارات اور رسائل نے بڑے حوصلہ افزا انداز میں تبصرے کیے ہیں۔ تبصرہ نگاروں میں بڑے بڑے ادیب حضرات بھی شامل ہیں۔ جولائی ۵۰ء کے رسالہ الشجاع کراچی کے تبصرہ کی نقل ارسال خدمت ہے۔ انگریزی اخبار ڈان (۶ر جولائی ۵۰ء) کا ریویو بھی خوب ہے اور تفصیل سے لکھا ہے۔ آپ کا قابلِ قدر ریویو بھی مَیں نے مشہور ادیبوں کے خطوط میں شامل کر دیا ہے اور اس کی نقل شاہد احمد صاحب کو بھیج دی ہے اصلیت یہ ہے کہ کتاب کا مسوّدہ لکھ کر اس پر نظرِ ثانی بھی نہیں کی۔ بطور یادگار شاہد صاحب کو دے دیا تھا۔ جب اُن کا ارادہ شائع کرنے کا ہوا تو اُس زمانے میں طبیعت خراب تھی۔ چار سو صفحات کے مسوّدہ کو دوبارہ پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس میں کتابت،

طباعت، عبارت میں بہ کثرت غلطیاں موجود ہیں، لیکن اچھوں کی نظر ہمیشہ اچھائی پر جاتی ہے، اس لیے اُنہوں نے فروعات کو پسِ پُشت ڈال کر نفسِ مضمون پر زیادہ توجّہ کی ہے۔ ایک بزرگ نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ گدڑی میں لال ہے۔ مَیں اس کتاب کے ابواب قائم کر کے کتابی شکل دے رہا ہوں اور نظرِ ثانی کے ساتھ عبارت پر پالش اور واقعات کی تصحیح کی جا رہی ہے۔ کتابی شکل میں چھپوانے کے واسطے عام رائے ہے، لیکن شاید مجھ سے یہ نہ ہو سکے۔ خدا شاہد صاحب کو ہزاری عمر (کاش ایسا ہوتا) دے اُن کے حوالے کر دوں گا۔ مَیں کیا اور میری حیات کیا ؎

تاریخ واقعاتِ شہاں نے نوشتہ ماند
افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شُد

بندہ نقی محمد خاں

"الشجاع"، کراچی نے "عُمرِ رفتہ نمبر" پر جو تبصرہ کیا تھا اُس میں شاہد احمد صاحب کا ذکر اِن الفاظ میں کیا گیا تھا:

"اُردو ادب کے لیے نہ ساقی کا نام نیا ہے نہ شاہد احمد دہلوی کا۔ بہت کم لوگوں کو یاد ہو گا کہ ساقی کب سے نکل رہا ہے اور شاہد صاحب کب سے اس مُوقّر رسالہ کے ذریعہ سے اُردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بات اتنی پُرانی ہے کہ جب اُن کا ذکر چھڑتا ہے تو جدید اردو ادب اور خصوصاً افسانہ نگاری کے ایّام طفولیّت تک پہنچتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہد صاحب اور "ساقی" اس

پورے دَور کی ادبی تاریخ سے کسی طرح علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔ جن صاحبان کو میدانِ صحافت کی دُشواریوں کا کچھ علم ہوگا یا جو حضرات ادبی رسائل کی اشاعت سے ذرا سا بھی واسطہ رکھتے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ایک سطحی اور گھٹیا درجہ کا رسالہ بھی مسلسل نکالتے رہنا کتنا کٹھن کام ہے چہ جائیکہ اس کا ایک اعلیٰ ادبی معیار بھی ہو اور اس معیار کو برقرار رکھا جائے۔ شاہد صاحب نے جس ہمت اور استقلال سے ساقی کو زندہ رکھا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کی زد میں معلوم نہیں کیا کیا گیا، لیکن شاہد صاحب نے پھر بھی ساقی گری کی شرم رکھ ہی لی۔ خاص نمبر نکالنے کے سلسلے میں شاہد صاحب جس جدّت، نُدرت، سلیقے اور ذوقِ ترتیب کو کام میں لاتے ہیں، اس پر حیرت ہوتی ہے۔ زیرِ نظر سالنامہ بھی ان کی سدا بہار تنوّع کی ایک اچھّی مثال ہے۔"

ہاں تو ذکر تھا شاہد صاحب کے مجموعۂ مضامین "گنجینۂ گوہر" کا اور ضمناً تذکرہ آ گیا درمیان میں "عمرِ رفتہ" نمبر کا بہرحال اُنہی دنوں میں نے کراچی کے ایک ادارہ "مشتاق اکاڈمی" (مشتاق بُک ڈپو نہیں) کی شائع کردہ فہرست کتب میں شاہد احمد صاحب کی دو کتابوں کے نام دیکھے جن میں سے ایک تو وہی "طاقِ نسیاں" تھی جس کا ذکر شاہد احمد صاحب اپنے خط میں کر چکے تھے، دوسری کتاب کا نام "اُجڑا دیار" تھا۔ کتاب کے عنوان سے مَیں نے اندازہ لگایا اور میرا یہ اندازہ بعد ازاں دُرست ہی نکلا کہ یہ کتاب ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو دِلّی مرحوم کے متعلّق اُن کے قلم سے وقتاً فوقتاً نکلے تھے۔ ان میں سے کچھ مضامین مثلاً "چوک کی بہار"

"دِلّی کی بپتا" "دلّی کی عید" اور "سترھویں کی سَیر" کے بارے میں مجھے اس مضمون سے معلوم ہوا تھا جو "نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر جلد اوّل میں شاہد احمد صاحب کے متعلق جمیل جالبی صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔ مجھے شاہد احمد صاحب کے یہ مضامین دیکھنے کا اُس وقت تک اتفاق نہ ہوا تھا۔ مَیں نے اُردو ادب میں جن جن موضوعات کو بہت ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھا اُن میں سے ایک "دِلّی" تھا دلّی نہ صرف متحدہ ہندوستان کا دِل اور عروس البلاد تھی بلکہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور شوکتِ گم گشتہ کا جگمگاتا ہوا نشان بھی تھی۔ حالی نے دِلّیٔ مرحوم کے متعلق سچ فرمایا تھا کہ

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اُدھر اقبال کو سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دِلّی ہی یاد آئی تھی۔ جن لوگوں نے عُمرِ عزیز کا کچھ حصّہ بھی دِلّی کی فضاؤں میں بسر کیا ہے ان کے ذہن سے دِلّی کبھی فراموش نہیں ہوگی۔ یہ دِلّی وہ نہیں جو آج ہندوستان کا دار الحکومت ہے۔ مَیں اُس دِلّی کی بات کر رہا ہوں جو ۱۹۴۷ء سے پیشتر مسلمانوں کی دِلّی تھی، مسلمانوں کی عزّت تھی اور ان کی آبرو تھی۔ مَیں نے بھی کبھی اس دِلّی میں اپنے شب و روز گزارے تھے۔ اس کے کُوچہ و بازار کی جی بھر کے سَیر کی تھی اور اس کے لال قلعہ، پُرانا قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، مقبرۂ ہمایوں، مقبرہ صفدر جنگ اور شاہ نظام الدّین کو بارہا گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ ارضِ پاک میں وہ دِلّی مجھے یاد آئی اور بے اختیار یاد آئی۔ دِلّی کے موضوع پر مَیں اُس وقت تک منشی فیض الدّین کی "بزمِ آخر" سیّد ناصر نذیر فراق کی "دِلّی کا اُجڑا ہوا لال قلعہ اور "لال قلعہ کی ایک جھلک" سیّد وزیر حسن کی "دِلّی کا آخری دیدار" خواجہ محمد شفیع کی "دلّی کا سنبھالا" اور "دلّی کی آوازیں" سیّد یوسف بخاری کی "یہ دلّی ہے"

اور "بازگشت" عرش تیموری کی "قلعۂ معلّیٰ کی جھلکیاں" سیّد اشرف صبوحی کی "دِلّی کی چند عجیب ہستیاں" میر باقر علی داستان گو کی "مولا بخش ہاتھی" علّامہ راشد الخیری کی "نوبت پنج روزہ" "دِلّی کی آخری بہار" "داستانِ پارینہ اور "غدر کی ماری شہزادیاں" ملّا واحدی کی "میرے زمانے کی دِلّی" مرزا فرحت اللہ بیگ کی "دِلّی کی آخری شمع" اور "پھول والوں کی سیر" اور خواجہ حسن نظامی کی "غدرِ دہلی کے افسانے" جیسی کتابیں دیکھ چکا تھا اب دِلّی مرحوم پر شاہد احمد دہلوی کے مضامین پڑھنے کا اشتیاق تھا۔

اب جو مَیں نے "اُجڑا دیار" کا نام سُنا تو مَیں نے فوراً ہی شاہد صاحب سے دریافت کیا کہ کیا ان کی کتابیں "طاق نسیاں" اور "اُجڑا دیار" مشتاق اکاڈمی شائع کر رہی ہے۔ شاہد احمد صاحب نے جواباً تحریر فرمایا کہ میری دونوں کتابیں اگر چھپیں گی تو مکتبہ نیا دَور ہی سے چھپیں گی مشتاق اکاڈمی کو مَیں نہیں جانتا، اس کے بعد میں ــــ انہیں مختلف وقفوں سے ان کتابوں کی اشاعت کے متعلّق لکھتا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں جو خطوط میرے پاس آئے، ان کے اقتباس پیش کرتا ہوں یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ موضوع ایک ہونے کے باوجود ان کے جواب ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ اِدھر یہ بھی ظاہر ہے کہ شاہد صاحب اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کس قدر بے نیاز واقع ہوئے ہیں۔

۱۔ میری کتابیں نہیں چھپیں اور خُدا جانے کب چھپ سکیں گی۔

۲۔ میری کتابیں مکتبہ نیا دَور نے اب تک نہیں چھاپیں اور یہ بھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کب چھاپیں گے۔

۳۔ شاید ابھی میری کتابیں چھپنے کا وقت نہیں آیا، جب ان کی ضرورت ہوگی تو چھپ جائیں گی۔

۴۔ میری کتابوں کا کچھ بھی نہیں بنا۔ ہنوز روزِ اوّل است۔

"دِلّی کی بپتا" کے بعد "دلّی جو ایک شہر تھا عالم انتخاب" دِلّی مرحوم کے متعلق شاہد احمد صاحب کا دُوسرا مضمون تھا جو میری نظر سے گزرا۔ یہ مضمون اخبار "انجام" کراچی کی اشاعت مورخہ ۲۰؍۱؍ ۶۰ میں شائع ہوا تھا اور "لطیف بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق جس قدر ضخیم تھا اُتنا ہی دلچسپ —— اور اُس میں دِلّی مرحوم کی تہذیب و معاشرت اور دِلّی والوں کی زندگی اور زندہ دلی کی پُوری عکاسی کی گئی تھی۔

اللہ اللہ کر کے ۱۹۶۲ء کے آخر میں "گنجینۂ گوہر" بڑی آن بان کے ساتھ منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولوی بشیر الدّین احمد دہلوی، میر ناصر علی ایڈیٹر "صلائے عام"، حضرت بیخود دہلوی، خواجہ حسن نظامی، مولوی عنایت اللہ، مرزا عظیم بیگ چغتائی، حضرت جگر مُراد آبادی، حضرت جوش ملیح آبادی، جناب ایم اسلم، جناب سعادت حسن منٹو اور جناب میرا جی پر مضامین کے علاوہ شاہد احمد صاحب کا اپنے متعلّق بھی ایک مضمون شامل تھا۔ "گنجینۂ گوہر" کو ہمارے علمی و ادبی حلقوں نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اُسے "ادارۂ مصنّفین پاکستان" (پاکستان رائٹرز گلڈ) اور "مجلسِ ترقّیٔ ادب" دونوں نے گرانقدر انعامات سے نوازا۔ دِلّی مرحوم کے متعلّق شاہد احمد صاحب کے مضامین کا ایک سلسلہ کوئی دو سال بعد اکتوبر ۱۹۶۳ء میں اخبار "انجام" کراچی میں پھر جاری ہوا اور اِس مرتبہ اُس میں "جامع مسجد" "چاوڑی کے بالاخانے" "آٹھ دن نو میلوں کی بستی" "چاندنی چوک" "دِلّی کے گیت" "دِلّی کا خونیں غسل" "دِلّی کا آخری تاجدار" اور "بسنت پنچھی" جیسے پندرہ کے قریب مضامین شائع ہوئے۔ دِلّی مرحوم کے متعلّق شاہد احمد صاحب کے یہ تمام مضامین اور اُن کا مشہور رپورتاژ "دِلّی کی بپتا" اب اُن کی کتاب "اُجڑا دیار" کی شکل

میں شائع ہو رہے ہیں۔ یہ کتاب زیرِ طبع ہے اور اُمید ہے کہ ان کی برسی پر شائع ہو جائے گی (اب شائع ہو چکی ہے)۔ اس کتاب کا پیش لفظ بھی شاہد احمد صاحب کے قلم سے ہے جسے اُن کی آخری ادبی تحریر بتایا گیا ہے۔ (اس میں "دِلّی کی بپتا" شامل نہیں ہے)

مَیں کتاب کے موضوع پر اب تک دس بارہ مضامین قلم بند کر چکا ہوں اور میرے یہ تمام مضامین ہمارے مُلک کے مختلف مقتدر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنے اِن مضامین کو ایک کتاب کی صورت میں پیش کروں، چناں چہ میں نے شاہد احمد صاحب کو ایک طویل خط تحریر کیا اور اس معاملے میں اُن کا مشورہ طلب کیا۔ میرے اس عریضے کا جو جواب اُن کی جانب سے موصول ہؤا، وہ حسبِ ذیل تھا:

دفتر ماہنامہ ساقی کراچی نمبر ۵

۱۱ر جنوری ۶۶ء

جناب مکرّم سلام مسنون

۹ر جنوری کا نوازش نامہ مِلا، شکریہ

مَیں آپ سے اور آپ کے ذوقِ کُتب سے اچھّی طرح واقف ہوں۔ آپ کے بعض مضامین بھی پڑھتا رہا ہوں بالخصوص "نصُرت" میں۔ اب آپ کا گرامی نامہ پڑھ کر اور بھی زیادہ متاثّر ہؤا ہوُں۔ افسوس کہ پاکستان میں علمی اور سنجیدہ مضامین کو پبلشر عموماً قبول نہیں کرتے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ پبلشر اگر کوئی ایسی چیز شائع کرتا ہے تو اُسے خریدار نہیں مِلتے۔ یہی بات مَیں "ساقی" کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ اُس کا بار قحطِ خریداری کی وجہ سے میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ خبر نہیں کب کوئی آخری تنکا اُونٹ کی کمر توڑ دے؟ میں نے اب خاص

نمبر شائع کرنے بھی بند کر دیے اور سالانہ چندہ دس روپے سے گھٹا کر چھ روپے کر دیا ہے شاید اس طرح ۶۴ صفحے کا پرچہ ماہ بماہ شائع ہو سکے، مگر اس کے بھی لالے پڑے ہیں۔ اِن حالات میں آپ سے اپنی مجبوری ہی کا اظہار کر سکتا ہوں۔ برنی صاحب ایڈیٹر "کتابی دُنیا" کو لکھیے اُن کے سلسلے کی چیز ہے شاید وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔

توجّہ فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔ کتاب "اُجڑا دیار" اس لیے شائع نہیں ہوتی کہ اُس کے لیے پبلشر نہیں ملتا۔ کیا کروں؟

خاکسار

شاہد احمد

۲۷/۵/۶۷ کی شب کو اُن کا انتقال ہؤا۔ دن میں اُن کی طبیعت اچھّی تھی اور یہ توقّع بالکل نہ تھی کہ اجل تاک میں کھڑی ہے، اُنھوں نے اُس دن میرے دوست جناب رُستم علی خاں صاحب کو جن کے مضامین "ساقی" میں شائع ہوتے رہے ہیں، ایک خط لکھّا جسے بلاشبہ اُن کا آخری خط قرار دیا جا سکتا ہے۔ مَیں یہ خط اُن کی یادگار کے طور پر پیش کرتا ہوں:

دفتر ماہ نامہ ساقی کراچی ۵

۲۷-۵-۶۷

جناب مکرّم سلام مسنون

مجھے بہت افسوس اور ندامت ہے کہ مَیں آپ کا مضمون علیٰحدہ بذریعہ پیکیٹ واپس بھیج رہا ہوں۔ یہ اتنا طویل ہے کہ "ساقی" میں اُس کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ خاکسار، شاہد احمد

شاہد صاحب

محمد طفیل

شاہد احمد دہلوی اس دُنیا میں موجود نہیں، اِس لیے اُن پر مضمون لکھنے کا مزا کیا! دوستانہ چُھیں، زندوں ہی کے ساتھ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ مذہب بھی یہ کہتا ہے کہ مرنے والوں کو اچھّے نام سے یاد کرو۔ اِس اعتبار سے مَیں سمجھتا ہوں کہ شاہد صاحب نے مَر کر میرے ساتھ اچّھا سلوک نہیں کیا۔

ارے یہ کون چلا آ رہا ہے۔ شاہد صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ وہی سانولا رنگ، وہی قدرے چپٹی ناک، وہی آنکھوں پہ عینک، وہی سر پہ ٹوپی، وہی اچکن، وہی متوازن قد!

نہیں یہ وہ تو نہیں۔ کچھ پھبن ویسی ہی تھی۔ ناک نقشہ بھی ویسا ہی تھا۔ طنزیہ مسکراہٹ بھی اُنہی جیسی تھی۔ وہی ہوتے تو کیا اچّھا ہوتا۔

زندگی میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں، مگر ایسے کم ملتے ہیں جن کی ہم عزّت کرتے ہیں۔ شاہد صاحب ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

زمانہ ۱۹۴۶ء کا ہے۔ میٹھی زبان میں گفتگو ہو رہی ہے۔ کون کون ہیں، یہ مجھے کچھ معلوم نہیں، البتہ یہ یاد ہے کہ میں ایک کونے میں کھڑا ہو کر باتیں سننے لگ گیا تھا۔ موہنی باتیں!

۱۹۴۸ء میں وہی صاحب مجھے لاہور کے ایک ہوٹل میں ملے۔ کسی نے تعارف کرایا: "یہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔" مجھے فوراً جامع مسجد دلّی کے سامنے والی دُکان یاد آگئی جس میں یہ حضرت بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ 'ساقی' کے مُدیر اُس وقت بڑے معروف آدمی تھے۔

اتّفاق کی بات کہ جس ہوٹل میں جا کر ہم بیٹھا کرتے تھے، اُسی میں شاہد صاحب بھی باقاعدگی سے آنے لگے۔ تعلّقات صرف سلام دُعا تک رہے۔

کچھ عرصے کے بعد شاہد صاحب پھر اُس ہوٹل میں نظر نہ آئے۔ میں نے اُن کے ایک ساتھی سے جو ویسی ہی اچکن پہنتے تھے، پوچھا: "شاہد صاحب نظر نہیں آتے؟" جواب ملا: "کراچی چلے گئے ہیں۔ اب وہیں سے پرچہ نکالیں گے، کیونکہ پنجاب گورنمنٹ نے مسلسل آٹھ ماہ کی جدّوجہد کے بعد بھی اُنہیں یہاں سے پرچہ نکالنے کی اجازت نہیں دی۔"

۱۹۵۰ء میں مجھے بھی عُمرِ خاب کا پَر لگ گیا، یعنی نقوش کی ادارت میرے حصّے میں آئی۔ میں نے بھی اُنہیں اپنا رسالہ بھیجا۔ رسید کے طور پر جو اُن کا خط ملا تھا، اُس میں اُنہوں نے کچھ مبالغے ہی کے ساتھ رسالے کی تعریف کی تھی۔ ہمعصر جب کسی کے لیے کلمۂ خیر کہتا ہے تو اسے کم اہمیّت والی بات نہ جانیے۔ کسی کی تعریف کرنے کے لیے شرافت، دیانت اور حوصلہ چاہیے۔ اِس اعتبار سے شاہد صاحب اُونچے انسان تھے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اُنہوں نے میری کوئی فرمائش رَد کی ہو۔ میں نے اُنہیں

جب بھی پُکارا اُنہوں نے لبّیک ہی کہا۔ جتنے مضمون شاہد صاحب کے 'نقوش' میں چھپے ہوں گے، اُتنے شاید ہی کسی دُوسرے رسالے میں چھپے ہوں۔ لطیفہ یہ کہ اُنہوں نے اپنے ہی بعض مضمون نقوش سے ساقی میں نقل کیے۔ ایسے ایثار کی مثال شاذ ہی ملے گی جو اپنی صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے مقدّم اور اپنے لیے مؤخّر جانتے ہوں جب کہ زمانہ آپ کاج مہا کاج کا ہو۔

شاہد صاحب میرے ساتھ بڑا خلوص برتتے تھے۔ بڑی محبّت کرتے تھے، مگر ایک موقع پر یہ ہوا کہ اُن کا قلم میرے خلاف حرکت میں آ گیا، چنانچہ وہ فقرے بازی ہوئی اور وہ وہ طعن و تشنیع کے تیر برسائے گئے کہ توبہ ہی بھلی۔ مَیں اقرار کرتا ہوں کہ مَیں دُوسروں کو بُرا بھلا کہنے میں اُتنا ماہر نہیں جتنا کہ شاہد صاحب تھے۔

قصّہ یہ تھا کہ انتخابی پرچوں کے خلاف ادبی رسالوں نے ایک جائز قسم کی مہم چلائی تھی —— وہ یہ کہ انتخابی پرچے مصنّف اور مُدیر سے اجازت لیے بغیر کسی تخلیق کو اپنے رسالے میں نہ چھاپیں، چونکہ ایک انتخابی پرچے پر شاہد صاحب کا نام چھپتا تھا، اس لیے وہ میدان میں کُود پڑے۔ ہم دلیلیں دیتے تھے وہ فقرے بازی کرتے تھے۔ ہم اُصول اُصول پُکارتے تھے وہ ہمیں سمجھاتے تھے: میاں اُصول کیسا؟ یہ دَور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا ہے۔ غرض وہ اپنی زبان دانی اور فقرے بازی کے بل بوتے پر جھوٹا مقدّمہ بھی جیت گئے۔ ہاں! کچھ جیت ہی گئے تھے۔

آپ سوچ میں پڑ گئے ہوں گے کہ اتنے بھلے آدمی کا آخر یہ رُخ کیا ہے؟ تھا صاحب! یہ بھی اُن کی شخصیّت کا ایک رُخ۔ ادبی خلیفہ تو وہ تھے ہی تھوڑی سی ورِیائی میں ہوا سے باتیں کرنے لگ جاتے تھے۔ ویسے بھی معرکہ آرائی کو اُن

کے مزاج سے نسبت تھی بھی!

یہ باتیں وہ ہیں کہ جو میں نے شاہد صاحب کی زندگی میں بھی اُن سے کہی تھیں۔ میرے نزدیک کسی کا اس دنیا میں ہونا یا نہ ہونا صداقتوں کے سلسلے میں روک نہیں بن سکتا۔ شاہد صاحب کے ایسے جتنے بھی معرکے ہوئے وہ ہم "بے زبان" پنجابیوں کے ساتھ، مگر آخر میں وہ اس دھبّے کو دھو گئے۔ جوش ملیح آبادی کے خلاف نمبر نکال ڈالا۔

یہ طنطنہ اُن کا یُوں ہی نہ تھا۔ کسی بُنیاد پر استوار تھا۔ ۱۹۵۹ء میں رائٹرز گلڈ بنا، تو وہ اس کے کرتا دھرتا، ۱۹۲۶ء میں سجّاد ظہیر اور اختر حسین رائے پوری کے اشتراک سے انجمن ترقّی پسند مصنّفین کی دہلی میں شاخ قائم ہوئی تو وہ اس کے سیکرٹری، ۱۹۴۲ء میں کرشن چندر اور واتسیین کے ساتھ مل کر دلّی کی ہارڈنگ لائبریری میں آل انڈیا رائٹرز کانفرنس کا انعقاد، تو وہ اُن کی توجّہ سے، ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ادب میں تجدّد کا غلغلہ بلند ہوا تو شاہد صاحب پیش پیش۔ جو شخص اس حد تک ادبی چودھری ہو وہ کسی کی سُنے بھی کیوں؟ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے حق دار تھے کہ جدھر سے بھی گزریں، لوگ یہی کہیں باادب باملاحظہ ہوشیار، شہنشاہِ ادب کی سواری آتی ہے۔

پرکھ کا وقت آیا تو بھی اُن کے قدم پیچھے نہ ہٹے۔ عصمت چغتائی کی چوٹیں اور سعادت حسن منٹو کا دُھواں شائع کرنے پر لاہور میں مقدّمہ چلا۔ دہلی سے تیرہ مرتبہ لاہور آنا پڑا۔ وہ بھی پُورے اسٹاف کے ساتھ، مگر ان کے ماتھے پر تیوری نہ تھی۔ ہٹ کے پکّے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شوربے کو چپاتی چُوس نہ سکی۔

۲۲، مئی ۱۹۰۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدہ کا انتقال ہو

گیا۔ والد نے ان کی دیکھ بھال کے لیے یورپین گورنرس رکھی جس کی وجہ سے ان کی بنیادی انگریزی بہت اچھی ہو گئی اور یہ بھی کہ اُس زبان سے لگاؤ پیدا ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ قلم اُٹھاتے تھے اور انگریزی مضامین کا ترجمہ کر ڈالتے تھے۔ ترجمہ کرنا بھی خالہ جی کا گھر نہیں۔ بڑے بڑے مار کھا گئے، مگر اُنہوں نے درجنوں ہی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ وہ بھی اصل کی رُوح کو سمجھ کر، اپنی دل نشین اُردو میں۔ ترجموں میں یا تو عنایت اللہ دہلوی کا مزا آیا یا پھر ان کا، باقیوں نے تو وقت گزارنے کے لیے ترجمے کیے، مگر مولوی مدن والی بات پیدا نہ ہو سکی یا اگر کسی نے اچھا ترجمہ کیا بھی، تو وہ بھی اکّا دُکّا جیسے مولوی ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر عابد حسین اور پطرس بخاری نے۔ یہاں بحث معیار اور مقدار دونوں سے ہے۔

ہاں تو ذکر اُن کے بچپن اور اُن کی تعلیم کا ہو رہا تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد دکن میں پائی۔ پھر علی گڑھ میں، میٹرک عربک اسکول دلّی سے کیا۔ لاہور کے ایف سی کالج سے، ایف ایس، سی کیا۔ آخر میں مشن کالج سے بی اے آنرز کی ڈگری لی۔

شاہد صاحب کے بہنوئی ڈاکٹر اجمل حسین صاحب کنگ ایڈورڈ کالج (لاہور) میں پروفیسر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شاہد میاں ڈاکٹر بنیں۔ تھوڑا عرصہ پڑھا بھی۔ چونکہ یہ بنیادی طور پر بڑے رقیق القلب تھے، اس لیے مُردوں کی چیر پھاڑ سے بھاگے۔ بھاگے بھی ایسے کہ دِلّی جا کر دم لیا۔

جن دنوں یہ دہلی کے مشن کالج سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے دَرپے تھے، اُنہی دنوں اُنہوں نے اپنا رسالہ ساقی جاری کیا۔ غالباً ۱۹۳۰ء میں ــــــ جب سے آخری دَم تک ادب کے ساتھ اپنا رشتہ نبھایا۔ نہ صرف

نبھایا، بلکہ حق ادا کیا۔

رسالہ نکالنے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ "مالی خُدائی مار"۔ چنانچہ جیسے جیسے ساقی لوگوں کی نظروں میں چڑھتا گیا، تُوں تُوں جمع جتھا ختم ہوتا گیا۔ ایک دن شاہد صاحب کے ماموں (جن کے پاس ساقی کے مالی امور تھے) سیّد اشتیاق حسین چشتی نے بتایا: برخوردار، تم نے باوا کی جان کی اتنی دولت۔ اب تک برباد کردی ہے ——— سنبھل جاؤ ——— ورنہ ہوا کھاؤ۔

تب شاہد صاحب کے دوستوں کی کابینہ بیٹھی۔ غور و خوض ہوا۔ طے یہ پایا کہ رسالے کے ساتھ پبلشنگ ہاؤس کا بھی کام کیا جائے۔ بڑے بڑے ادیب گھر کے تھے۔ پھر نئے اور اچھے لکھنے والوں سے شاہد صاحب کے مراسم تھے، بلکہ جن نئے لکھنے والوں کا سکّہ رواں تھا، اُن میں سے بیشتر کو ساقی نے اُجالا تھا۔

یُوں کہیں جا کر رسالے کے سنبھلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ کتابیں بھی چھپتی رہیں۔ رسالہ بھی چھپتا رہا۔ اُن دنوں ترقّی پسند ادب کا طُوطی بول رہا تھا۔ شاہد صاحب ایسے لٹریچر کے مُربّیوں میں سے تھے، لہذا خوب کاروبار چمکا۔ ادیبوں کی بھی خدمت ہوئی، ادب کی بھی!

پاکستان بنا تو یہ صرف اپنا قلم اُٹھا کر چلے آئے۔ بنی تو دال روٹی کے چکّر میں اُسی قلم کو گھساتے رہے۔ آخری دم تک اُسی سے روٹی کھائی۔

سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے جب اِدھر پبلشنگ ہاؤس کا کام نہ چلا تو اُنہوں نے سوچا مستحق ادیبوں کو یا اُن کے ورثا کو کتابوں کے حقوق لوٹا دیے جائیں تاکہ اُنہیں کچھ مالی فائدہ ہو جائے اور کتابیں بھی بازار میں آ جائیں۔

یہ حوصلہ بھی کسی کسی کا ہوتا ہے کہ اپنی خریدی ہوتی چیز کو کوئی یُوں بغیر

داموں واپس کر دے ۔ اس موضوع پر کسی نے اُن سے بات کی بھی تھی ۔ جواب میں اُنھوں نے کہا تھا کہ پاکستان آ کر مجھے معلوم ہوا ہے کہ غُربت کیا چیز ہوتی ہے ۔ میرے پاس اور تو کچھ ہے نہیں یہی کتابوں کے حقوق ہیں ۔ سوچا یہی ساتھیوں کو واپس کر دوں ۔

اُنھیں ادبی ذوق ورثے میں ملا تھا ۔ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے ۔ جغادری ادیب کے پوتے ، پھر بشیر الدّین احمد کے صاحبزادے : جن کی ادبی حیثیت نہ صرف مُسلّم تھی بلکہ حد درجہ واجبُ التعظیم بھی ۔ اُنھوں نے " واقعات دارالحکومت دہلی " ایک ایسی کتاب (تین جلدوں میں) لکھ دی ہے کہ کیا کوئی اس سے بہتر کتاب لکھ سکے گا ۔ یہ اکیلی کتاب ہی اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ ایسا کارنامہ جو بڑی لمبی زندگی پائے گا ۔ دلّی پر کچھ لکھنے کے لیے اِس کتاب کو بھُولنے والا ٹھوکر کھائیگا ۔ موتی نہ رولے گا ۔

پھر اسی نوعیّت کی ایک اور کتاب " تاریخ بیجاپور " لکھّی ۔ اس کا بھی حق ادا کیا ، مگر یہ کوشش واقعات دارالحکومت دہلی سے بالاتر نہیں فروتر ہے ، مگر اِس فروتر کا بھی مرتبہ یہ ہے کہ اُس سے بڑھ کر ، کوئی کچھ کہنے والا پیدا ہو گا تو وہ لوہے کے چنے ہی چبائے گا ۔ اسی طرح کا اُن کا ایک اور کارنامہ " فرامین سلاطین " ہے جو مغل بادشاہوں کے فرامین پر مشتمل ایک قیمتی دستاویز ہے ۔

باپ نے (ڈپٹی نذیر احمد نے) مراۃُ العرُوس لکھّی تو بیٹے نے (بشیر الدّین احمد نے) بھی اُسی طرز پر " اقبال دُلہن " لکھّی ۔ بشیر الدّین جو کچھ بھی تھے اپنی جگہ بھاری پتّھر تھے ، مگر ڈپٹی نذیر احمد نہ تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ " اقبال دلہن " کو زیادہ شہرت کے پَر نہ لگے ۔

بشیرالدّین احمد نے اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ چند ایک کے نام لکھتا ہوں۔ میرا موضوع ریسرچ بگھارنا نہیں، اس لیے زیادہ گہرا غوطہ لگانے کا ارادہ نہیں، مگر پس منظر کے طور پر کچھ عرض کرنا ہی تھا تاکہ شاہد صاحب کی پُشت پر ذہانتوں اور کاوشوں کا جو بوجھ لدا ہوا تھا وہ تو نظر آتا۔

ہاں تو مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ بشیرالدّین احمد نے اور بھی کتابیں لکھّیں۔ ایک خاص پروگرام کو ذہن میں رکھ کر، محض معاشرے کی اصلاح کی خاطر، ذہنوں کی جلا کی خاطر، بچّوں کے لیے جو کتاب لکھّی اُس کا نام تھا "حرزِ طفلاں"۔ جوانوں کے لیے جو کتاب لکھّی وہ تھی "نشاطِ عمر" بُوڑھوں کے لیے جو کچھ لکھا وہ تھا "عصائے پیری" کے نام سے۔

اور ہاں یہ بات تو بھُول ہی گیا کہ بشیرالدّین احمد باپ کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ دیوانِ بشیران کی منظومات کا مجموعہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ جب دیوانِ بشیر چھپ کر آیا تو گھر میں باتیں ہونے لگیں۔ دیوانِ بشیر آگیا تو اُن کی چھوٹی بچّی نے (شاہد صاحب کی بہن نے) کہا: "ہمارے ابّا دیوانے کیوں ہونے لگے۔ کہنے والا ہی دیوانہ ہو گا۔"

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہد احمد ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے جنہوں نے درجنوں زندہ کتابیں لکھّیں۔ جب تک اُردو زندہ ہے، ڈپٹی نذیر احمد کی تحریریں روشنی دیتی ہی رہیں گی۔ لوگ فیض پاتے ہی رہیں گے۔ ان کے بیٹے نے جو کچھ لکھّا، وہ باپ سے کم تر درجے کی تحریریں ہیں، مگر زندہ وہ بھی رہیں گی۔ کم از کم تاریخی نوعیّت کے کام ——— اصلاحی سلسلے کی تحریریں مار کھا جائیں تو کھا جائیں۔ پوتے نے جو کچھ لکھّا نہ وہ باپ کی ٹکّر کا ہے اور نہ دادا کی ٹکّر کا، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِس دَور میں

اُن کی تحریروں کی قیمت پڑ رہی ہے۔

ستم کی بات یہ بھی ہے کہ شاہد صاحب پر، اُس خاندان کی عِلم وفن والی برتری بھی ختم ہے۔ شاہد صاحب کی اولاد میں مجھے تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو قلم تھام کے کہہ دے 'میں ابھی زندہ ہوں۔

مَیں نے سُنا ہے کہ شاہد صاحب موسیقی میں بھی بڑا ادرک رکھتے تھے۔ مجھے نہ تو اِس فن کی شُد بُد اُس وقت تھی اور نہ آج ہے، اِس لیے مَیں اُن کے اس مرتبے کو نہیں جان سکتا۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں فنِّ موسیقی پر مذاکرہ ہوا تھا۔ شاہد صاحب کو خاص طور سے کراچی سے بُلایا گیا تھا۔ جس سہ پہر کو اُنہوں نے مقالہ پڑھنا تھا، اُس کی صبح شاہد صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا: 'میں مقالہ پڑھ رہا ہوں، پاکستان کونسل پہنچنا۔ اُس وقت مَیں نے اُن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے کوئی سمجھا رہا ہو میری جان بخش دیجیے۔ مجھے کوئی اور سزا دے دیجیے، مگر موسیقی پر مقالہ نہ سنوایئے، مگر وہ نہیں مانے تھے۔ وہاں ایک چھوڑ کئی مقالے سُننے پڑے تھے۔ مضمون نگار مقالہ پڑھتا تھا۔ سامعین سوالات کرتے تھے (سوالات نہیں اعتراضات) جن کا جواب دینا پڑتا تھا۔ شاہد صاحب پہلے تو اعتراضات کے جواب دیتے رہے۔ پھر قدرے "سُرخ رُو" ہو گئے۔ بعد میں مجھے کہا۔ سب ------- اکٹّھے ہو گئے تھے۔ وہ کیا جانیں موسیقی کس چڑیا کا نام ہے۔

اُن کے اِس شوق کے متعلق معلوم یہ ہوا کہ اُنہوں نے مذاق ہی مذاق میں گانا سیکھا تھا۔ وہ یُوں کہ چند دوست بیٹھے تھے۔ ایک دم ترنگ میں آ گئے۔ انصار ناصری نے کہا: مَیں طبلہ بجاتا ہوں۔ شاہد احمد دہلوی نے کہا: مَیں ہارمونیم بجاتا ہوں۔ کسی نے کہا: مَیں گاتا ہوں۔ یُوں چوکی پُوری ہو گئی۔ سارے گاما پا دانی سا

شروع! ٹک دِیا ٹک دِیا چالو!

کیا معلوم تھا کہ وقتی اُبال رنگ لائے گا۔ جوں جوں مذاق بڑھتا گیا، یہ گویا بنتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ آیا کہ لوگوں نے محسوس کیا کہ شاہد صاحب تو مذاق کی حدیں پھاند کر فن کار بن گئے ہیں۔ تب اُنھوں نے اُستاد پکڑا جو قریب ہی مل گئے۔ چار پیسے ڈولی پر گھر والی بات ہو گئی۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، وہ بھی پوری ہو گئی۔ خوب ریاض ہوتے۔ غرض خوب غریب گلے کی شامت آئی۔

شاہد صاحب کی آواز تو اچھی نہ تھی، مگر فن سے پوری طرح آگاہ تھے۔ تال سُر کے اُستاد۔ جب پاکستان بنا تو اُنھیں بھی مجبوراً اِدھر آنا پڑا۔ جو کچھ گزری وہ کچھ اہلِ معاملہ ہی جانتے ہوں گے۔ معاش کی تنگی نے مجبور کیا تو ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا گویّا بن کر پیٹ کے لیے ایندھن مہیّا کرتا رہا۔ شوق روزگار بن گیا۔ پھر تو یہاں تک ہوا کہ پاکستان کی نمائندگی بیرونِ ممالک بھی جا کر کی۔ پاکستان میوزک اکیڈیمی کے صدر جو تھے۔

موسیقی کے اُستاد عام طور پر گانے کے فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں، مگر وہ سب راگ راگنیوں کو تحریر میں نہیں لا سکتے۔ چونکہ یہ پڑھے لکھے تھے، اس لیے بڑے ہی دل نشین انداز میں اُنھوں نے فن کے بارے میں لکھا بھی۔ اگر کوئی صاحب اُن کے موسیقی پر مضامین اکٹھا کرنا چاہیں گے تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ ایک کتاب کا مواد اکٹھا کر لیں گے۔ اِس فن پر نہ ان کے باپ نے کتاب لکھی نہ دادا نے — بزرگوں پر فضیلت پائی بھی تو کس فن میں!

موسیقی میں مبتلا ہونے یا اسے آمدنی کا ذریعہ بنانے کی مجبوری وہ حالات تھے جن سے دوچار ہو کر انھیں پاکستان آنا پڑا۔ پاکستان کیسے پہنچے، یہ انھی کی زبانی

سُنیئے ۔ مرثیوں میں جس طرح مرثیہ انیسؔ کا ہے ، اُسی طرح فسادانی نوحوں میں نوحہ شاہد احمد کا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

" اگست ، ۴۷ء میں کٹی ہوئی ریلیں دِلّی آنے لگیں ۔ مسلمان مسافر چُن چُن کر قتل کیے جانے لگے ۔ ۱۲ اگست سے لاہور کی حالت بگڑی اور ایسی بگڑی کہ تین دن میں لاہور میں سکھ اور ہندو نام کو نہیں رہا ۔ نہ امرتسر مسلمانوں سے خالی کرایا جاتا ، نہ لاہور پر آفت آتی ۔ لاہور کے بعد سارے مشرقی پنجاب میں قتل و غارت گری وبا کی طرح پھیل گئی ۔ اس کا اثر مغربی پنجاب پر پڑنا ضروری تھا ۔ وہاں بھی کُشت و خون شروع ہو گیا ۔ ریلوں اور ہوائی جہازوں سے لاکھوں آدمی اِدھر کے اُدھر اور اُدھر کے اِدھر آنے لگے ۔ دِلّی میں شرنارتھیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ دَم گھٹنے لگا ۔ خنجر زنی کے واقعات شروع ہو گئے اور ریلوں میں خون ہی خون دکھائی دینے لگا ۔ مہینوں سے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہو گیا تھا ۔ اب سخت سے سخت کرفیو لگائے جانے لگے ۔ بیس بیس گھنٹے کے کرفیو تو لگا ہی کرتے تھے ۔ اب چھیاسی چھیاسی گھنٹے کے کرفیو لگنے لگے ۔ ہر محلّے پر مضبوط دروازے محلّے والوں نے چندہ جمع کر کے چڑھوا لیے تھے ۔ راتوں کو محلّے والے باری باری پہرہ دیتے ۔ شہر پر عجب بد رونقی چھا گئی اور جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگنے لگے ۔ جب کرفیو کھُلتا ، تو لوگ بدحواس ہو کر ضروری سامان خریدنے بازاروں میں نکلتے اور دکانوں پر وہ ریل پیل ہوتی کہ کمزور آدمی تو دُکاندار تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا ۔ حد یہ کہ راشن ملنا بھی دُشوار ہو گیا ۔

دو ہفتے میں ایک ہفتے کا راشن بمشکل ملا، وہ بھی اس خوبی کا کہ آٹا نہیں ہے گیہوں لو۔ آٹا پیسنے کی چکیاں اوّل تو کُھلتی نہیں اور جو کبھی کوئی کھل گئی، تو اس پر ایک میل لمبی قطار کھڑی ہوتی۔ کرفیو صرف چار گھنٹوں کے لیے کُھلتا اور کرفیو کے بعد کوئی باہر ٹھہرا، تو اُسے گولی مار دینے کا حکم۔ ناچار لوگوں نے چکیاں خود پیسیں۔ جنہیں چکّی میسّر نہ آئی، انہوں نے سِل بٹّے پر گیہوں پیسا اور پھر اُبال اُبال کر کھانے لگے۔"

ایک اور اقتباس:

"مسلمانوں میں اس قدر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی کہ ذرا سے کھٹکے پر سب کے کان کھڑے ہو جاتے۔ ہمارا محلّہ مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی کے قلب میں تھا اور خود ہمارے محلّے میں ساڑھے تین ہزار آدمی بستے تھے جن میں ایک بھی ہندو نہیں تھا۔ محلّے میں داخل ہونے کے صرف دو راستے تھے جن پر ہم نے چندہ جمع کر کے لوہے کے دروازے چڑھوا دیے تھے۔ یہاں بندوق والوں کو مامور کیا۔ جدھر جدھر سے حملے کا اندیشہ تھا، اُدھر اُدھر دس دس بیس بیس کے دستے بٹھا دیے اور ایک ایک بندوق والا۔ دُور دُور تک کے مسلمانوں نے صلاح کر کے اُوپر کوٹھوں پر لال اور سبز بتّیاں بجلی کی لگائی تھیں کہ اگر حملے کا اندیشہ ہو، تو اسی سمت کی لال بتّیاں روشن کر دیں اور سب تیار ہو جائیں۔ یہ انتظام بہت عمدگی سے کیا گیا تھا، لیکن خوف اور افواہوں کی وجہ سے بتّیوں کا استعمال بڑا غلط ہوتا رہا اور اس سے خواہ مخواہ ہراس بڑھتا رہا۔

۵ر ستمبر کے بعد دِلّی میں شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہوگا جو آرام کی نیند سویا۔ اوّل تو ہر گھر کی چھت پر دو دو چار چار آدمی جاگتے رہتے، پھر کوئی بتّی سُرخ ہو جاتی اور ہوشیار ہوشیار کی آوازیں آنے لگتیں۔ مردگھروں سے ہتھیار لے کر نکل آتے اور مورچوں کی طرف دوڑتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد لال بتّیاں بُجھنی شروع ہو جاتیں اور سبز روشن ہونے لگتیں۔ رات بھر یہی ہوتا رہتا۔ ان ہُوکوں نے سب کالہو پی لیا۔ عورتیں اور بچے رونا شروع کر دیتے۔ یہ بے چینی دیکھی نہ جاتی تھی اور ہم سب سوچتے تھے کہ ایک دفعہ جی کھول کر مقابلہ ہو جائے، مگر دشمن تو اعصاب کی لڑائی لڑ رہا تھا۔"

چند سطریں اور:

"۱۳ر ستمبر کو اعلان کیا گیا کہ جامع مسجد خالی کر دی جائے اور مہاجرین پُرانے قلعے میں چلے جائیں۔ عبادت گاہوں میں رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ پُرانے قلعے میں راشن بھی ملے گا، چنانچہ جامع مسجد خالی ہو گئی اور مینہ میں بھیگتے بھاگتے یہ مسلمان پُرانے قلعے میں پہنچ گئے۔ پُرانا قلعہ کیا کُھلا، دِلّی والوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ قلعے کے اندر اس قدر تکلیفیں تھیں کہ اکثر آدمی وہاں سے لوٹ آئے کہ اپنے گھر ہی میں مر جانا اچھا۔ بہر حال ہم بھی قلعے میں پہنچ گئے اور خُدا کا شُکر ادا کیا کہ دِلّی کے بھاڑ سے تو نکلے۔ اب پُرانے قلعے کے جہنّم کو بُھگتا جائے گا۔ پُرانا قلعہ حشر کا میدان بنا ہُوا تھا۔ جب ہم پہنچے ہیں، تو اس میں اسّی ہزار آدمی تھے۔ فصیلوں اور بُرجیوں میں بھی آدمی بھرے

ہوئے تھے۔ قلعہ اتنا بھر گیا کہ ایک اور کیمپ مقبرے میں کھول دیا گیا۔ یہ وہی مقبرہ تھا جہاں دِلّی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے پناہ لی تھی۔ بارش نے سب کو اُلٹا رکھا تھا۔ روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سارے قلعے میں صرف ایک نل تھا جس کی دھار بھی پتلی تھی اور اس پر چوبیس گھنٹے دو لمبی لمبی قطاریں لگی رہتیں۔ ایک مردوں کی، ایک عورتوں کی۔ آٹھ آٹھ گھنٹے قطار میں کھڑے ہونے کے بعد ایک بالٹی پانی لینے کا نمبر آتا۔ اس سے زیادہ پانی کوئی نہیں لے سکتا تھا۔ ہر وقت سر پھٹول ہوتی۔ عورتوں میں بھی وہ مار پیٹ ہوتی کہ خُونم خُون ہو جاتیں۔ قلعے کے دُوسرے سِرے پر کچھ جھاڑیاں تھیں جن میں رفعِ حاجت کے لیے قلعے کے اسّی ہزار آدمی جاتے تھے۔ یہ ایک بڑا عبرت کا مقام تھا۔ پیچش کا مرض عام تھا اور ہیضہ بھی پھیل رہا تھا۔ قدم قدم پر نجاست تھی اور اس درجہ مجبوری کہ ستر اور پردے کا کسی کو ہوش نہیں رہا۔ دِلّی کے شریف گھروں کی عورتیں جو بارہ برس کے لڑکے سے بھی پردہ کرتی تھیں، بدحواس پھرتی تھیں اور رات کو کسی وقت انہی غلیظ جھاڑیوں میں جاتیں۔ پہلے تو قلعے کے باہر قبریں بنائی جاتی تھیں، پھر اندر ہی بننے لگیں۔ شاید ہی کسی مُردے کو پُورا کفن مِلا ہو۔ کسی چادر یا دری میں لپیٹا اور قبر میں اُتار دیا اور بعض لوگوں کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی اور اُن کے مُردے بے گور و کفن پڑے رہے رہے۔"

شاہد صاحب میں دوسروں کی خدمت کا جذبہ بڑا وافر تھا۔ وہ ہر ملنے والے کی خدمت ہی کرنا چاہتے تھے۔ وہ سب کی بھلائی کے لیے سوچتے تھے۔ ایک دو

نہیں، درجنوں ہی ملنے والوں کی زندگی سنوار دی۔ مثال کے طور پر فضل حق قریشی دلّی میونسپلٹی میں ملازم تھے معمولی تنخواہ پر۔ اُنہوں نے قریشی صاحب میں "ادبی جراثیم" دیکھے تو اُنہیں وہاں سے اُچکا۔ ساقی میں جگہ دے دی۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب قریشی صاحب کا مذاقِ ادب سنور گیا تو ان کی مانگ بھی بڑھی۔ آغا داداشی نے انہیں "آج کل" کے لیے چاہا۔ تنخواہ کے بڑھاوے کی چھوٹ دی۔

فضل حق قریشی نے سہمتے ڈرتے شاہد صاحب سے ذکر کیا کہ "آغا صاحب مجھے لینا چاہتے ہیں۔ تنخواہ بھی زیادہ دینے کے لیے کہتے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟"

شاہد صاحب نے کہا، "میں تو تمہاری ترقّی چاہتا تھا۔ اسی لیے میونسپلٹی چھڑائی تھی۔ شوق سے اس پیشکش کو قبول کرلو۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

یہ تو ایک قصّہ ہے اور نہ جانے ایسے کتنے قصّے ہوں گے۔ آوارہ حیدر آبادی، تابش دہلوی، انصار ناصری، اخلاق احمد دہلوی، خمار دہلوی، شمس زبیری یہ سب کے سب اُنہی کے لگائے ہوئے پودے ہیں۔ انہیں شاہد صاحب پر ناز تھا۔ شاہد صاحب کو ان پر ناز تھا۔ اِس ضمن میں المیہ یہ ہے کہ اپنے بچوّں کے لیے کچھ نہ کیا۔ دس بچّے، جن میں تین لڑکے اور سات لڑکیاں، یہ سب کے سب اُس چیز کی بھینٹ چڑھ گئے جسے اگلے وقتوں کے لوگ خودداری کہتے تھے اور آج کے لوگ بیوقوفی!

شاہد صاحب وضع دار اتنے تھے کہ زندگی میں جو معمول بنا لیا۔ بس بنا لیا۔ اُس کی ایک مثال یہ بھی ہے:

شاہد صاحب روزانہ چار، پانچ بجے کے درمیان کُتب خانۂ علم و ادب (دہلی) میں پہنچ جایا کرتے تھے اور رات کے سات آٹھ بجے تک رہا کرتے تھے۔ آندھی آئے یا طوفان، شاہد صاحب پہنچتے ضرور تھے۔ حتّٰی کہ عید بقرعید کا بھی ناغہ نہ ہوتا۔

کُتب خانہ پر اور لوگ بھی آیا کرتے تھے۔ چار بجے سے پہلے کُتب خانہ، کُتب خانہ ہوتا تھا۔ چار بجے کے بعد "ادبی اڈّا" بن جاتا تھا۔ باقاعدہ پہنچنے والوں میں انصار ناصری، فضل حق قریشی، ظفر قریشی، اخلاق احمد دہلوی، صادق الخیری اور نہال سیوہاروی تھے۔

باہر سے کوئی ادیب آتا تھا تو وہ بھی شام کے وقت کُتب خانۂ علم و ادب میں پہنچ جایا کرتا تھا، کیونکہ اُسے معلوم تھا وہاں ایک ساتھ بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ یُوں اُس دکان پر، شاہد صاحب کی وجہ سے، ہندوستان بھر کے ادیب اور شاعر اکٹھّے ہوتے رہے۔ اپنی کہتے رہے۔ دوسروں کی سُنتے رہے۔ دلچسپ صحبتیں تھیں وہ!

شاہد صاحب شاعروں سے بہت بھاگتے تھے۔ مگر یہ لوگ اُس دن کی طرح آج بھی خوش مذاق لوگوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اپنا کہا سُناتے ہیں۔ کوئی خوش دلی سے سُن لے تو، بے دِلی سے سُنے تو، سُناتے ضرور ہیں۔ اِس صورتِ حال سے بچنے کے لیے شاہد صاحب نے ایک اصول نافذ کر رکھا تھا۔

اگر کوئی شاعر اپنے شعر سُنانا چاہتا ہے تو وہ بے شک سُنائے مگر شرط یہ ہے کہ سامعین کو ایک ایک چائے کا کپ پلائے اور اگر کوئی شاعر اپنے شعر ترنّم سے سُنانا چاہتا ہے تو وہ چائے کے ساتھ کچھ کھلائے بھی، یہی وجہ تھی کہ کُتب خانۂ علم و ادب پر کوئی شخص جرمانہ ادا کیے بغیر شعر نہیں سُنا سکتا تھا۔

کبھی کبھی کوئی شاعر چالاکی سے سادہ چائے منگوا کر تحت اللفظ پڑھنا شروع کر دیتا تو شاہد صاحب کہتے۔ اماں یار! تحت اللفظ کیوں پڑھ رہے ہو۔ ہمیں تو بھوک لگی ہے۔ پڑھنا ہے تو ترنم سے پڑھو۔ ورنہ ہماری اشتہا میں اضافہ نہ کرو۔

شاہد صاحب کے یوں تو کئی ادیبوں اور شاعروں سے مراسم تھے، مگر دو کے ساتھ بڑی خصوصیت تھی۔ ایک مولوی عنایت اللہ دہلوی سے دوسرے عظیم بیگ چغتائی سے!

مولوی عنایت اللہ، شمس العلما مولوی ذکا اللہ کے بیٹے تھے۔ مترجم اس بلا کے تھے کہ ہزاروں صفحات ترجمہ کر ڈالے۔ فاضل اتنے تھے چاہتے تو متعدد طبع زاد کتابیں لکھ ڈالتے، مگر انہوں نے کیے تو صرف ترجمے ہی کیے۔ وہ بھی زیادہ تر شاہد صاحب کے لیے۔

عظیم بیگ چغتائی کو بھی شاہد صاحب سے بڑی محبت تھی۔ شاہد صاحب بھی ضرورت کے وقت مالی امداد سے ہاتھ نہ کھینچتے تھے۔ ایک مرتبہ عظیم بیگ بیمار ہوئے۔ شاہد صاحب کو اپنی دلبستگی کے لیے بلایا۔ اُن کے پہنچتے ہی وہ اپنی بیماری بھول گئے اور شاہد صاحب کی خوشی کے لیے افسانے لکھوانے شروع کر دیے (کیونکہ کمزوری کی وجہ سے خود لکھنے سے معذور تھے) جس دن شاہد صاحب چلنے کے لیے کہتے وہ اُنہیں ایک اور مضمون لکھوا دینے کا لالچ دے دیتے۔ یوں اُن کی محبت اور ان کے "لالچ" کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے چغتائی نمبر کا مواد اکٹھا ہو گیا۔ چنانچہ چھپا "ساقی" کا "چغتائی نمبر"۔

شاہد صاحب، جوش ملیح آبادی کے خلاف ایک نمبر نکالنا چاہتے تھے۔ میں اُنہیں منع کرتا تھا، مگر وہ مان نہیں رہے تھے۔ اِس سلسلے میں میری اُن سے

خاصی لمبی چوڑی خط و کتابت ہوئی تھی۔ شاہد صاحب مجھ سے بھی جوشؔ صاحب کے بارے میں مضمون چاہتے تھے۔ مَیں اُن سے کہتا تھا۔ میرے مضمون لکھنے کا کیا سوال! آپ بھی جو کچھ کر رہے ہیں، زیادتی کر رہے ہیں۔ کچّا دُودھ کس نے نہیں پیا؟ لہٰذا اس مسئلے پر مٹی ڈالیے، مگر شاہد صاحب تھے کہ وہ اِس مسئلے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔

جب شاہد صاحب کا مضمون کے سلسلے میں اصرار بڑھا تو مَیں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے اُن سے کہا۔ "اگر آپ پسند کریں تو یہ سلسلہ جوشؔ، میری اور اپنی خط و کتابت شائع کر دیں۔ انہوں نے ہامی بھر لی۔ مَیں حیران ہؤا۔ حیران اس لیے ہؤا تھا کہ اُس خط و کتابت میں شاہد صاحب کا پہلو دبتا تھا۔ پھر مَیں نے سوچا۔ شاہد صاحب وہ فقرے اور وہ باتیں حذف کر دیں گے جن میں اُن پر حرف آتا ہو گا۔

جب وہ نمبر چھپ گیا جس میں وہ خط و کتابت بھی تھی تو مَیں اور حیران ہؤا۔ وہ یُوں کہ شاہد صاحب نے اس میں سے کوئی فقرہ کاٹا نہ تھا۔ ساری خط و کتابت جوُں کی توُں چھاپی تھی۔ صاحب! یہ حوصلے اور کردار کی بات ہے جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں۔

انتقال سے کچھ دن پہلے، اُنہوں نے مجھے اپنا مضمون "عبدالسلام نیازی" بھجوایا تھا۔ توقع نہ تھی کہ وہ میری درخواست پر، اپنی طویل علالت کی وجہ سے کچھ لکھ سکیں گے، مگر اُنہوں نے لکّھا۔ مَیں حیران! اس سے یہ اندازہ ہؤا تھا کہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مضمون پڑھا تو وہ بھی قلم گھسیٹ نہ تھا۔ اچّھا خاصا تھا۔ جواب میں مَیں نے لکّھا کہ مَیں بھی ایک بار مولانا نیازی کی خدمت میں حاضر ہؤا تھا اور میری

اُن سے یہ گفتگو ہوئی تھی۔

"فارسی جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"عربی جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"علم معقول و منقول؟"

"جی نہیں۔"

"پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُمّی ہوں۔"

"میرے خط کے تین چار روز کے بعد شاہد صاحب کا جواب آیا۔ مولانا نیازی کے علم و فضل کا یہی عالم تھا کہ پڑھے لکھے سے پڑھا لکھّا آدمی بھی مولانا کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مَیں بھی کچھ پڑھا لکھّا ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایسے آدمی بھی اُن کے سامنے زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مَیں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ میرے مضمون میں یہ فقرے ایزاد کر دیں، خواہ اپنے نام سے، خواہ بغیر نام کے!

چنانچہ مَیں نے اپنا نام بتائے بغیر اُن کے حکم کی تعمیل کر دی تھی۔ اپنا نام اس لیے نہ بتایا تھا کہ مجھے اپنی سُبکی کا احساس ہوتا تھا، مگر آج اپنا نام ظاہر کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ یہ حوصلہ مجھے شاہد صاحب ہی نے دلایا ہے۔

ادبی رسائل کی حالت ہمیشہ سے خراب ہے۔ بڑے بڑے معرکے کے پرچے نکلے جن میں مخزن، ہمایوں، نیرنگِ خیال، ادبی دنیا اور ساقی مگر یہ رہے مالی اعتبار سے زیر بار ہی۔ جس کے پاس جتنا سرمایہ ہوتا ہے، وہ اُتنا پھُونک کے

بیٹھ جاتا ہے۔ نہ عوام اتنا ساتھ دیتے ہیں کہ کوئی رسالہ اپنا خرچ چلا سکے اور نہ حکومت ہی اس "غلط کام" میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے۔ حکومت فیملی پلاننگ پر کروڑوں روپے خرچ کر سکتی ہے مگر ادبی رسائل کے سلسلے میں اس کے پاس کسی قسم کی پلاننگ نہیں۔

میں بڑا حیران ہوتا ہوں کہ یہ ادبی رسالوں کے مدیر پاگل ہوتے ہیں یا کیا کہ وہ جانتے بوجھتے گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جدّوجہد، اپنا روپیہ اور اپنا خونِ جگر یوں اچھال دیتے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اور ہمارا یہ کرتب عوام بھی دیکھتے ہیں اور حکومت بھی، مگر کسی کو ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔

ادبی رسائل کی حالتِ زار پر شاہد صاحب بھی کُڑھا کرتے تھے۔ اُنہوں نے کراچی میں بیٹھ کر ایک پروگرام بنایا کہ ایک آل پاکستان ادبی رسائل کی انجمن بنائی جائے تاکہ رسائل کی حالت کو کسی طرح سنوارا جائے۔

جلسے ہوئے۔ ریزرویشن پاس ہوئے۔ بھاگ دوڑ کی۔ حکومت کی چوکھٹ پر ناک بھی رگڑی مگر معاملہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آج تک حکومت نے ادبی رسائل کے لیے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ ہم لوگ وزیر تعلیم سے بھی ملے تھے، وزیر خزانہ سے بھی، اگر یہ لوگ کچھ کر گزرتے تو ممکن تھا کہ شاہد صاحب اتنی کس مپرسی کی حالت میں نہ مرتے۔

انجمن کو فعّال بنانے کے لیے شاہد صاحب نے اتنی جدّوجہد کی کہ اُس کی کوئی حد نہیں۔ آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی اسی کی فکر۔ اس سلسلے میں شاہد صاحب نے مجھے بھی گھیرا۔ میں رسّیاں تڑاتا رہا۔ اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ "کچھ نہ ہوگا"۔ مگر شاہد صاحب کے خلوص اور اصرار کے سامنے میں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کئی سال تک ہم لوگ لکھتے لکھاتے اور بھاگتے دوڑتے رہے، مگر ہُوا وہی جس کا مجھے پہلے

دن خدشہ تھا۔

شاہد صاحب خدمتِ خلق کے سلسلے میں ہر لمحہ مستعد رہتے تھے۔ وقت ضائع کرتے تھے۔ روپیہ تھا نہیں ورنہ وہ بھی لٹاتے۔ انجمن ادبی رسائل کے لیے اُنہوں نے بڑا کام کیا، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ رائٹرز گلڈ کے بھی مخلص کارکنوں میں سے تھے، مگر سُنا ہے کہ جب شاہد صاحب کا انتقال ہوا تو رائٹرز گلڈ کے ممبران میں سے کوئی بھی جنازے میں شریک نہ تھا۔ یہ حشر ہوا شاہد صاحب کی اُن جدّوجہد کا جن میں تنہا اُن کی ذات کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر حکومت بے مہر ہے تو عوام بھی احسان فراموش ہیں۔ حکومت فیملی پلاننگ میں لگی ہوتی ہے اور قوم ایک دُوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں! نہ اِسے فرصت ہے نہ اُسے!

سُنا ہے کہ آدمی کی اچھّائیاں اور بُرائیاں سفر میں زیادہ اُبھرتی ہیں۔ مجھے یہ سعادت بھی نصیب ہوئی۔ ہم نے اکٹھّے پُورے مشرقی پاکستان کا دَورہ کیا۔ ہم پانچ افراد تھے۔ شاہد احمد دہلوی، مولانا رازق الخیری، حکیم یوسف حسن، عشرت رحمانی اور یہ خاکسار۔ مولانا رازق الخیری سارے سفر میں ہمیں یہی بتاتے رہے کہ مَیں بڑے کام کا آدمی ہوں۔ میری قدر کرو۔ حکیم یوسف حسن اپنی زندگی کے ایسے واقعات سے دل بہلاتے رہے کہ ہم میں سے بعضوں کو عُمرِ رفتہ کو آواز دینے کی ضرورت پڑ گئی۔ عشرت رحمانی یہ سمجھاتے رہے کہ تم سب بچّے ہو۔ اس ٹولی کا دماغ مَیں ہوں۔ ایک مَیں اور شاہد صاحب ایسے تھے جو اپنی کسی حیثیت پر نازاں نہ تھے۔ جب یہ سارے ساتھی ڈُون کی لیتے تو شاہد صاحب ہلکا سا قہقہہ لگاتے۔ پھر قہقہہ لگاتے، پھر قہقہہ لگاتے۔

انسان کا سفر ازل سے جاری ہے۔ ابد تک جاری رہے گا۔ دُنیا میں

آگہ ہر شخص اپنا اپنا کردار ادا کرکے نیک نامیوں اور حسرتوں کی گود میں سو جاتا ہے۔ اُن میں ایک شاہد صاحب بھی تھے۔ یہ اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ہم زیادہ تر اُن کی اچھائیوں سے واقف ہیں۔

لکھوں تو کیا لکھوں؟

نعیم صدیقی

ایک عزیز بھائی کا تقاضا ہے کہ مرحوم شاہد احمد دہلوی پر کچھ لکھو۔ اپنی عرضداشتیں دُوسروں سے منوانے میں مَیں عُمر بھر جتنا کوتاہ رہا ہوں، تقریباً اسی تناسب سے بزرگوں اور دوستوں کی فرمائشیں مان لینے کی کمزوری بھی رکھتا ہوں۔ اہلِ فرمائش کا مرحلہ تو بے حد سہل ہوتا ہے، مگر میرے لیے میرا مرحلۂ تعمیل بے حد کٹھن ثابت ہوتا ہے جسے اہلِ فرمائش جان نہیں سکتے، اور اگر مَیں اس کا کچھ تصوّر دلانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ لکھنے والے بڑے فنّی اندازِ انکسار سے نازبرداریاں کرِ دیا کرتے ہیں، لہٰذا وہ سُنی اَن سُنی کر دیتے ہیں اور مَیں اس لیے صبر کر لیتا ہوں کہ اپنی اس کوتاہی کی کچھ سزا اپنے آپ کو دینی ہی چاہیے کہ مَیں دوٹوک "نہ" کہنے کا مؤثر اسلوب کیوں نہ سیکھ سکا۔

کہنے کو یہ کہہ تو دیا کہ لکھوں گا اور جلد لکھوں گا، مگر وظیفہ یہ رہا کہ ہر صبح کچھ اور لکھنے بیٹھ جاتا ہوں اور سارا دن اسی طرح گزار دیتا ہوں، مگر بیچ بیچ میں باربار

کوئی آہستہ سے میرے کان میں کہتا ہے کہ ابھی تک تم نے شاہد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا، کب لکھو گے؟ ——— اور مَیں اس آواز کو سُن کر سوچ میں ڈوب جاتا ہوں کہ کیا لکھوں، کیسے لکھوں؟

ایک نامور ادیب کا تذکرہ چھیڑنے سے پہلے تمہیدی پس منظر بنانے کے لیے مجھے کچھ باتیں ادب کے متعلّق کہنی ہیں۔ غالباً اس میں کچھ ہرج نہیں کہ میرے اس مختصر سے مضمون کی تمہید اصل مبحث سے طولانی ہو جائے۔

مَیں نے خود ہی بارہا اپنا تجزیۂ نفس کر کے معلوم کیا ہے کہ مَیں ادب سے ڈرا سہما ہوا ایک نویسندہ ہوں۔ ادیبوں سے غائبانہ محبت کے باوجود ادیب گُریز سا ہو گیا ہوں۔ میری اس کیفیت کو بھانپ کر ایک بے تکلّف کرم فرما نے وہ سطحی سا فیشنی جملہ مجھ پر کسا تھا جسے فرائڈی نفسیات کے نئے نئے مرعوب شدہ طالبِ علم ایک لطیف اور فلسفیانہ گالی کے طور پر بکثرت استعمال کرتے ہیں کہ "تم کچھ احساسِ کہتری میں مبتلا معلوم ہوتے ہو" مَیں نے جواباً عرض کیا کہ دُنیائے ادب میں احساسِ برتری کے جو پست مظاہر مَیں نے دیکھے ہیں، ان کی بنا پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے ذرا سا احساسِ کہتری دے کر بہت سے خوفناک مقامات سے بچا لیا ہے۔

ادب سے متعلّق میری یہ اُلجھن پہلے نہ تھی۔ پہلے ادب کو مَیں حُسن و محبّت جیسی ارفع و اعلیٰ شے سمجھتا تھا (حُسن و محبّت کا مفہوم وہ نہیں جو فلموں، ناولوں اور افسانوں کے ساتھ مخصوص ہے) حُسن و ادب سے پہلے پہل اپنا تعارف ہوا تو ایسے ہوا جیسے کسی نگارِ خوش اطوار سے۔ وہ ادبِ غمِ جہاں کا ادب تھا۔ اس کے

پیچھے غم خوارِ زمانہ ادیب جلوہ گر تھا ـــــــ صاحبِ دل ! صاحبِ دماغ ! صاحبِ کردار ! صاحبِ مقصد اور صاحبِ پیغام ! ادب میں عظمتِ انسانی کی جھلک تھی، اور ادیب حافظ کے اس شعر کے مقام بلند پر فائز تھا ؎

اے صاحبِ کرامت ! شکرانۂ سلامت

روزے تفقّدے کن، درویشِ بے نوا را

اربابِ ادب کچھ صاحبِ کرامت قسم کے لوگ ہوتے تھے اور وہ عالم گیر قسم کے دردِ بے پایاں کا کاس الکرام گردش میں لاکر اپنے تلخابۂ شیریں سے سارے زمانے کو شاد کام کرتے تھے ـــــــ اور ان نواگروں کے سامنے سارا زمانہ ایک درویشِ بے نوا لگتا تھا۔ سارا زمانہ تفقد اندوز ہوتا رہتا تھا۔ وہ ادب صحیح معنوں میں ایک خدمتِ خلق تھا۔ ادیب اپنی ہی بولی نہیں بولتا تھا بلکہ وہ ان ہزارہا بے زبانوں کی ترجمانی بھی کرتا تھا جو اوّل تو اپنے دُکھ درد کو سمجھ نہیں پاتے تھے اور سمجھ پاتے تھے تو اس کو بیان نہ کر سکتے تھے۔

پس ہم اربابِ ادب کے لیے بڑا ادب و احترام لے کے سنِ شعور میں داخل ہوئے۔ ساتھ ہی اپنی شامت آئی کہ امن اطمینان سے زندگی کی راہ چلتے چلتے قلم نے رہزنی کی۔ اس کم بخت قلم کی فتنہ سامانیوں کی بھی کیا بات ہے۔ بڑے بڑوں کے دلوں میں یہ تیر نیم کش بن کر ترازو ہوتا رہا ہے۔ ہمارا حال تو وہی حالی والا ہوا کہ ؎

اک دسترس سے تیری حالیؔ بچا ہوا تھا

آخر اسے بھی تُو نے چرکا لگا کے چھوڑا

تو اِن حضرتِ قلم نے ہمیں ورغلایا کہ چلو تمہیں انسانیت کی محفلِ عظمت تک لے چلتے

ہیں۔ ہم نے سوچا کہ خیر عظمت وظمت اپنے بس کی چیز نہیں، مگر کم سے کم کسی ورروئے دیر تلے سے جھانک کر اُن ہستیوں کے دیدار کا شرف تو حاصل کریں گے جو اُڑتے خیالوں کو پکڑتے، اُن کو حُسن کے سانچے میں ڈھالتے اور ایسے معنی سے آراستہ کرتے ہیں جو ناسازگار حالات کے گڑھوں میں پڑے انسانوں کے لیے سامانِ ترفیع بنتے ہیں ان کے عزائم کو بالیدگی دیتے ہیں اور ان کے کردار کا سرمایۂ تعمیر بنتے ہیں۔

تقدیر کا لکھا پُورا ہونا تھا کہ ہم قلم کے بھرّے میں آگئے اور ایک طفلِ ناداں کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ مطالعہ وکاوش کے وسیع صحرائے صدہا پیچ وخم طے کر کے جنّتِ اُمّید تک پہنچے تو دنیا بدل چکی تھی، اور ایسی بدل چکی تھی کہ بے ارادہ یہ مصرعہ زباں پر آگیا ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

ادب کی محفل میں ایک طوفانِ بے ادبی بپا تھا۔ کوئی شراب کے جام اُچھال رہا ہے، کوئی کسی بدرو میں پڑا مارکسزم کا قصیدہ اُگلے دے رہا ہے، کوئی سماج کے لتّے لے رہا ہے۔ کوئی فرطِ نشّۂ تعلّی سے اُچھل رہا ہے، کوئی مجذوبانہ شان کی ادبی شطیعات فضا میں بکھیر رہا ہے۔ کوئی کپڑے پھاڑ کر جسم کو رہائی دلا رہا ہے، کوئی اپنے جسم کو بھی نوچ کر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے درپے ہے، کوئی اپنی بھولی بھالی محبوبہ کو بھی ساتھ لے آیا ہے اور اس کے بال اور گال اور کھال دکھا دکھا کر خراجِ تحسین حاصل کرنے کے لیے غزل پہ غزل الاپ رہا ہے، کوئی مذہب کا مذاق اُڑا رہا ہے، کوئی خدا کے نام سے ایسے کھیل رہا ہے جیسے کسی بچّے کے ہاتھ میں جُھنجھنا ہو اور وہ پہلے اسے بجاتے اور پھر اسے توڑ ڈالے، کوئی اخلاقی قدروں کے آبگینے توڑ توڑ کر ایک نئے طرز کی

موسیقی پیدا کر رہا ہے، کوئی اخروٹ جلنے دماغ کا غبارہ پھول جانے پر کون و مکان کا سودا ایسے لاأبالی پن میں کر رہا ہے کہ ؏

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

پھر آپس کی تقسیمیں اور تصادم! —— کھینچا تانی کی وجہ سے کتابِ ادب کا شیرازہ درہم برہم، دو دو ورق اُس کے ہاتھ، چار ورق اِس کے پیروں تلے پائمال، کوئی کسی سطر کو چُوم رہا ہے اور کوئی کسی دیوان کو تُوم رہا ہے۔

کاہے کی انسانیت، اور کیسی عظمت! ہر ایک اپنی دُنیا آپ ہو کے رہ گیا ہے۔ اپنے اپنے غم، اپنی اپنی اُلجھنیں، اپنی اپنی نفسیاتی بیماریاں، اپنی اپنی لایعنیت! غرضیکہ ؏

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

اندازہ یہ ہُوا کہ اِس جدید محفلِ ادب کے قرب سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے کچھ نہ کچھ ذہنی و اخلاقی ٹیڑھ ہونا ضروری ہے۔ جتنی بڑی ٹیڑھ ہو گی، اُتنا عظیم ادب پیدا ہو گا۔ سوچا کہ اگر ایسا ہی ہے تو خدائے رحیم و کریم میرے جیسے سیدھے سادے آدمی کو ادیب ہونے سے بچالے اور خوش قسمت تھا کہ بچا لیا گیا۔ شوقِ ادب کو چھوڑ کر "لاادبیّت" کا نیا مسلک پیدا کر لیا۔ وقت کے اجارہ دارانِ ادب نے بھی رحم کھا کر اس ناچیز کو تہمتِ ادبیّت کے قابل نہیں گردانا۔ اِس لحاظ سے کتنے اچھے ہیں یہ لوگ!

سو قصّہ مختصر یہ کہ یہ ناقابلِ فہم دَور جب کہ ادب ایک نغمۂ محبّت کے بجائے نوائے اضطراب بن گیا ہے اور ادیب زمانہ گیر وسعتِ ذہن کے ساتھ زندگی کی گُتھیاں سُلجھانے کے بجائے، خود اپنی ذات میں مرتکز ہو کر اپنی ہی گُتھیوں کو ژولیدہ تر بنا کے

دکھانے کو کمالِ ہُنر سمجھتا ہے، ایسے تمام لوگ بہت یاد آتے ہیں جیسے شاہد احمد دہلوی تھے۔ ورنہ جدید ادبیات پڑھتا ہوں تو کبھی یُوں محسوس ہوتا ہے کہ سخت گدلے پانی میں مستقل غوطے کھا رہا ہوں، اور کبھی یُوں لگتا ہے کہ جیتے جی منوں مٹّی کے انبار میں دبتا جا رہا ہوں۔

وہ جو نرم طبعی ادب کا ذوق ابتدا میں ودیعت ہوا تھا، وہ نوائے محبت انسانیت کی تشنگی، اور کسی صدائے رُوح پرور کے لیے طلبِ مسلسل، اُس نے ادیبوں کی اُس صف سے میرا رشتۂ یگانگت (خواہ وہ غائبانہ ہو) قائم کیا۔ ایک گونہ یہ رشتہ شاہد احمد دہلوی مرحوم سے بھی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ حسبِ عادت مَیں نے نہ انہیں اس سے کبھی آگاہ کیا، اور نہ اپنی کیفیتِ دل کو کسی اور کے سامنے رکھّا۔ میرا یہ رشتۂ یگانگت نامعلوم نہ جانے اور کن کن اصحاب سے تھا اور ہے۔

شاہد صاحب کو مَیں نے جس حد تک بھی جانا دُور ہی دُور سے جانا۔ حافظے کی گواہی کے مطابق ہماری کبھی کوئی مُلاقات نہیں ہوئی۔ ہمارا دوستانہ یا حریفانہ معاصرت کا کوئی باب وجود ہی میں نہیں آیا۔ کوئی معاملاتِ تلخ وشیریں چلے ہوتے، کچھ بحثا بحثی رہی ہوتی، کوئی سلسلۂ خط وکتابت جاری رہا ہوتا، مَیں کراچی جانے پر اُن سے مِلتا یا وہ لاہور آنے پر مجھ سے مِلتے تو آج میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہوتا۔ مگر اب بار بار سوچتا ہوں کہ کیا لکھّوں؟

ہمارے تعلقات بس اتنے تھے کہ "ساقی" اور "سیارہ" دونوں میں تبادلہ مستقلاً جاری رہا (اور اب بھی ہے) ۔ اور عین آخری دَور میں صرف ایک بار تبادلہ خطوط

ہٹوا - ایک خط میں نے ایک خاص ضرورت سے اپنے ایک ادارئیے کے بارے میں بہ طور استفسار لکھا (کہ چند سوالات کی روشنی میں اس کے متعلق آپ بترتیب ادیب رائے دیں!) اور اُنہوں نے محض غائبانہ تعلّق کا اتنا پاس کیا کہ نصف مُلاقات کے جواب میں کُھلے دل سے نصف ملاقات کر ڈالی - سچّی بات یہ ہے کہ اُنہوں نے میرے سوالوں کے جواب پُورے خلوص سے دیے جن میں نہ تو کسی طرح کے تعصّب کا کوئی شائبہ تھا، اور نہ میرے لیے کوئی خصوصی رعایت وحمایت برتی گئی تھی - مرحوم کے اس خط نے مجھے ان کی شخصیّت کی تصویر بنانے میں بڑی مدد دی -

میرے نزدیک شاہد صاحب فی الحقیقت ہمارے اسی اساسی ادب کے سانچے میں ڈھلے تھے جس میں ہماری تہذیبی رُوح بولتی تھی اور یہی دہلوی ادب ان کے ہاں آخر دم تک ظہور کرتا رہا - وہ اس لحاظ سے برزخی آدمی تھے کہ بنائے ہوئے وہ کسی اور ماحول کے تھے اور آ گھرے تھے کسی اور ماحول میں - اُن کی ہجرت محض جغرافیائی ہجرت نہ تھی، بلکہ انہیں اپنی ذہنی و تہذیبی دُنیا کی تبدیلی سے بھی سابقہ پیش آیا - اس دوہرے سانحہ کو انہوں نے جس صبر سے برداشت کیا ہے، اور دوسروں کو اپنے اس دردِ نہاں سے حصّہ دینے میں جس "بُخل" سے کام لیا ہے وہ ان کے کردار کا ایک روشن پہلو سامنے لاتا ہے - شاہد صاحب نے (جہاں تک میں ان کی تحریروں سے اندازہ کر سکا ہوں) کراچی میں بھی "دہلوی" رہنے کی پُوری پوری کوشش کی —— اور پچھلے دو چار سال ہمارے ساقی کے فائل میں ایسی تحریریں موجود ہیں جو دہلی (دہلی کی زبان و تہذیب) کو ہمارے سامنے لاتی ہیں - میرا خیال ہے کہ اپنی ان تحریروں کو شاہد صاحب اپنے ان زخموں کا مرہم بھی بناتے ہوں گے جنہیں انہوں نے دُوسروں سے یُوں چھپایا ہے جیسے وہ کسی

معشوق کا رازِ عشق ہوں۔

دِلّی کی یاد اور دلّی کی تہذیبی مصوّری ہی وہ صہبائے لطیف تھی جس کے سہارے شاہد دہلوی نے ۲۴ء سے ۷۶ء تک کا دَور گزار دیا۔ ذرا یہ عبارتیں دیکھیے اور لُطف لیجیے۔

"کوچۂ نواب مرزا میں نواب آغا مرزا کی حویلی کون نہیں جانتا، کھڑی آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ اس حویلی نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ شہر آبادی کے زمانہ میں اس حویلی کی ڈیوڑھی پر بھی ہاتھی جھُولتے تھے۔ صبح شام نوبت جھڑتی تھی۔ نواب مرزا پونڑوں کے رئیس تھے۔ اُن کے پُرکھے صدیوں پہلے ایران سے آئے تھے ——— تلوار کے دھنی تھے، کبھی شکست کا مُنہ نہ دیکھا۔ بھلا جو شخص ہتھیلی پر سر لیے پھرتا ہو، اُس سے کون جیت سکتا ہے؟ ——— آخر میں جب شاہی بے جان ہو گئی تھی تو ان کے آباؤ اجداد کی تلواریں بھی لہُو چاٹنا بھُول گئی تھیں۔"

"دِلّی پر جب یہ غضب ٹوٹا تو آغا مرزا کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ باپ تو میدانِ کارزار میں کام آ ہی چکے تھے۔ آغا مرزا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دِلّی کے بُرے دن آ گئے ہیں۔ لہذا وہ اپنے سارے خاندان کو لے کر کسی نہ کسی طرح باہر پہنچ گئے۔ شہر سے نکلتے ہی رات کے اندھیرے میں ایک طرف سے کراہنے کی آواز سُنائی

دی۔ آغا مرزا نے شکرمیں رُکوائیں۔ عورتیں ہائیں ہائیں کہتی رہیں، اور یہ کُود کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک پلندہ اُٹھائے آگئے اور اپنی شکرم میں اس پلندے کو ڈال کر پھر روانہ ہو گئے۔ یہ دراصل ایک زخمی میم تھی جسے اس کے ساتھیوں سمیت باڑھ مار دی گئی تھی ——— مرزا کی والدہ اور بہنوں نے میم کے زخموں کو پانی سے صاف کر کے پٹّی باندھ دی اور اسے دلاسا دیا کہ ہم تمہیں تمہارے آدمیوں میں پہنچا دیں گے۔"

"لو صاحب، یا تو مرزا توپ دم ہو رہے تھے یا اعزاز کے ساتھ اپنے آبائی گھر پہنچا دیے گئے۔ حویلی ڈھنڈار پڑی تھی — فوجیوں نے اسے ایسا لُوٹا تھا کہ اس میں تنکا تک نہیں چھوڑا تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ یہ وہی حویلی تھی جہاں چپّے چپّے پر رونق رہتی تھی یا اب در و دیوار سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ ایک ٹھگّی صاف کر کے یہ لُٹا ہوا قافلہ بیٹھ گیا۔"

اب اس کہانی کا وہ ٹکڑا آتا ہے جہاں صاحب کے دل اور دِلّی میں کوئی فاصلہ نہیں رہ جاتا:۔

"دِلّی بھی عجیب شہر ہے کہ اس کے ہر بگاڑ میں ایک بناؤ ہے۔ بیسیوں دفعہ لُٹی اور ایسی لُٹی کہ کھکھ ہو گئی۔ مگر پھر آباد ہو گئی، اور ایسی ہوئی کہ پہلے سے بھی اس کی رونق بڑھ گئی ——— باہر والوں کو دِلّی ہمیشہ راس آئی۔ یہ اس شہر کی خصوصیت ہے۔ ڈپٹی بہاؤالدّین مرحوم کے صاحبزادے سُلطان الدّین صاحب نے

اِس خصوص میں ایک بڑی دلچسپ بات بتائی۔ انہوں نے کہا کہ میری دادی صاحبہ فرماتی تھیں کہ دِلّی دِلّی والوں کی بیوی ہے اور باہر والوں کی ماں۔ مَیں نے دادی صاحبہ سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: بیوی کی نگاہ شوہر کی جیب پر رہتی ہے اور ماں کی نگاہ اولاد کے پیٹ پر رہتی ہے۔"

(اقتباسات از "دِلّی کی ایک پُرانی حویلی" ـــ ساقی اگست ۵۸ء)

اس ایک پیرے میں نہ جانے کیا کچھ ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے شاہد کی نگاہ سے دیکھیے۔ اچھا تو بس ایک مثال اور۔

"ایک بوُڑھا آدمی آپ ہی آپ باتیں کرتا چلا جا رہا ہے۔ سر پر ایک میلی سی کپڑے کی ٹوپی ہے۔ چہرہ کتابی، رنگ شہابی، کُشادہ پیشانی، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں جن سے ذہانت کا نُور ٹپک رہا ہے۔ سُتواں ناک، بڑی بڑی سفید مُونچھیں، پتلے پتلے ہونٹ، گول سفید ڈاڑھی، بھاری ڈیل، بُوٹا سا قد، سر میں بدرنگ عبا، بسیریاں لگی ہوئی، اُٹنگا پاجامہ، پاؤں میں لیتڑے ہلگائے، یہ بڑے میاں شپڑ شپڑ چلے جا رہے ہیں۔"

(ساقی ـــ فروری ۶۷ء)

معلوم ہے یہ کس کا ذکر ہے؟ ـــ مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے اُس دَور کا جب کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھے تھے۔

چیزیں بہت سی سامنے ہیں، مگر سب کچھ کیسے یہاں جمع کر دوں۔ آخری بات

یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ شاہد دہلوی کا دل مُسلمان کا دل تھا، اور اس دل کی ایک عجیب دردمندانہ جھلک "میراجی" والے مضمون میں ملتی ہے اور اس کی ایک جھلک "ساقی" کے جنگ نمبر کے آخری طویل مقالے میں (ستمبر ۶۶ء) جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے:-

"ہم بے دین نہیں ہیں، ہم مسلمان ہیں، ہمارے سینوں میں ایمان کی حرارت ہے اور خُدا ہمارے ساتھ ہے۔ ہم جان لینا اور جان دینا جانتے ہیں۔ ہم یا تو غازی بنتے ہیں یا شہید۔ ہم دونوں جہاں میں سُرخ رُو ہوتے ہیں۔"

ہاں! اِس مسلمان شاہد کی بیماری کی اطّلاع جب شائع ہوئی تو ایک گونہ ذاتی سا احساس ہوا اور ارادہ کیا کہ خط لکھوں گا۔ میرے خط لکھتے لکھتے اُدھر قاصد اجل آپہنچا۔ پھر ارادہ کیا کہ پس ماندگان کو تعزیّت نامہ لکھوں، لیکن خیال آیا کہ میرا جاننے والا تو کوئی ہے نہیں، خطوط کے ڈھیر میں ایک پُرزے کا اور اضافہ ہوجائے گا ——— شاہد تو اب پلٹ کے آنے کے نہیں۔ اب سوائے دُعائے مغفرت کے اور کچھ بس میں نہیں! "آخر سیّارہ" میں ایک نوٹ لکھنے پر اکتفا کیا، تاکہ ذاتی تاثرات کا بوجھ کم ہوجائے۔

مہمانِ خصوصی

پروین سرور

جون ۱۹۶۵ء کی ایک صبر آزما دوپہر تھی اور سولہ تاریخ۔

میرے گھر میں رنگ روغن کا کام ہو رہا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتے سنسان کمروں میں اپنے ہی قدموں کی چاپ گونج اُٹھتی تو عجیب وحشت سی ہونے لگتی۔

گرمی کا سولھواں سن تھا اور گھر کی ویرانی بھی جوبن پر تھی۔ سارا دن اُداسیوں میں گزرتا۔ ویسے بھی عام دنوں میں اِردگرد کی فضا کچھ اتنی پُرسکوت مانتنی خاموش ہوتی ہے کہ اچھّے خاصے ہوش مند گریبان چاک کر ڈالیں، مگر اُن دنوں تو شاید آسمان سے بے سروسامانی کا احساس برستا تھا۔ حالات یہ تھے کہ گھر میں مرد کی صورت نہیں تھی۔ امّاں اور مَیں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے حصولِ تعلیم اور روزگار کی فکر نے مَردوں کو پردیس سونپا تھا اور ہم دونوں کو بکھیڑے۔

اُس دن گرمی نے کچھ زیادہ ہی زور باندھ رکھّا تھا۔ کھانے کے کمرے میں کھڑکیوں پر بھاری پردے گرائے ہم دونوں زمین پر ایک پرانا سا کھیس بچھائے

بیٹھے تھے۔ چاروں طرف کے دروازے بند تھے۔ سارے گھر میں مزدور دندناتے پھر رہے تھے۔ اُٹھا دھری کے دھماکوں سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ کام کم اور گڑبڑ زیادہ ———

اندھیرے کمرے میں گھٹن ہو رہی تھی۔ اماں مزدوروں کی ڈھٹائی اور سست رفتاری پر جھنجلائی ہوئی تھیں اور میں اُنگلیاں چٹخا چٹخا کر یہ سوچ رہی تھی کہ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے پریشانی مول لے لی۔ گھر میں اگر سفیدی نہ کروائی جاتی تو ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی اور پھر اس جنگل میں آتا بھی کون ہے۔

اتنے میں باہر بڑے زوروں میں گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر مردانے برآمدے میں سے ڈاک اُٹھائی۔ میرے نام پاکستان میوزک اکیڈیمی کراچی کی طرف سے ایک لفافہ آیا تھا۔ پتے کی تحریر شاہد احمد صاحب دہلوی کے ہاتھ کی تھی۔

میں نے اُلٹ پلٹ کر حیرت سے دیکھا۔ وہ عموماً کارڈ لکھا کرتے تھے۔ آج لفافہ بھیجا تھا۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی۔ پتہ دوبارہ پڑھا ——— اُنہی کا خط تھا۔

شاہد صاحب کا خط میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ گزشتہ آٹھ دس برس سے شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہوگا جب اُن کا خط یا ساقی میرے نام نہ پہنچا ہو۔ جواب دینے میں اُن کی طرف سے کبھی تاخیر نہ ہوتی تھی۔ میرا خط ہاتھ میں لیتے ہی جواب لکھ دیا کرتے۔ ان خطوں میں کبھی افسانہ بھیجنے کی فرمائش ہوتی، کبھی ناولٹ لکھنے کی تلقین، کبھی رپورتاژ کے متعلق ہدایات، اور اگر کبھی خامہ فرسائی سے متعلق کوئی بات نہ ہوتی اور مجھے خط لکھے کچھ دن گزر جاتے تو وہ میری خیریت اور شغل دریافت کر لیتے تھے۔

اپنی دُھن کے پکّے تھے۔ ایک مرتبہ اگر افسانہ یا ناولٹ لکھنے کے لیے کہتے اور میں ٹال مٹول، حیلے بہانے کا سہارا لیتی تو مارے خطوں کے ناطقہ بند کر دیتے۔ اگر مَیں یہ کہوں کہ اُنہوں نے مجھ سے کہانیاں لکھوائی نہیں، اُگلوائی ہیں تو یہ جھوٹ نہ ہوگا۔

عجب اتفاق تھا۔ مَیں نے اُن کے خط پڑھے تھے۔ ادبی رسائل میں اُن کے بے شمار خاکے اور مقالے میری نظر سے گزرے تھے۔ اُن کی تصاویر دیکھی تھیں —— گزشتہ کئی برس سے ساقی میرے نام اعزازی طور پر بڑی باقاعدگی سے آ رہا تھا، مگر مَیں نے اُنہیں کبھی دیکھا نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ ہیں کیسے ——

مَیں نے خوشی خوشی لفافہ اُٹھایا اور گیلری میں گھسیٹ کر بے ترتیب انداز میں رکھّے ہوئے پلنگ سے ٹھوکر کھا کر سِسکتی سنبھلتی ہوئی واپس کھانے کے کمرے میں آ گئی۔

امّاں ابھی تک جھنجلائی بیٹھی تھیں۔ اُنہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گویا پُوچھ رہی ہوں —— "کس کا خط ہے؟"

مَیں نے زمین پر بیٹھتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ اُن کی طرف دیکھے بغیر زیرِ لب کہا:

"شاہد صاحب کا ہے۔"

جھٹ پٹ خط کھولا۔ کاغذ میں لپٹی ہوئی اُن کی ایک تصویر پھسل کر نیچے گِری۔ مَیں نے بڑے شوق سے تصویر اُٹھا کر دیکھی۔ سیاہ شیروانی اور جناح کیپ پہنے ہوئے۔ مَیں نے رسالوں میں بارہا دیکھی تھی۔

خط پڑھا۔ دو لائنیں لکھی تھیں:

محترمہ۔ سلام مسنون۔

۱۷ جون کی شام کو مغرب کے لگ بھگ یا ۱۸ کی صبح کو آٹھ بجے کے قریب اگر اس شکل کے کوئی صاحب آپ سے ملنے آئیں تو مِل لیجیے گا۔

خاکسار

شاہد احمد

خط پڑھتے ہی ایک لمحہ کے لیے یُوں محسوس ہوا جیسے نبض رُکنے لگی۔ مَیں نے مقالے اور خاکے پڑھ پڑھ کر شاہد صاحب کی ایک خیالی تصویر بنا رکھی تھی۔ اِس تصویر کا ہر رُخ بے حد تیکھا اور جلالی تھا۔ مجھے معلوم تھا اُن کا قلم بڑے دھڑلّے سے چلتا ہے۔ اِس سے نہ صرف دِلّی کی ٹکسالی زبان ڈھلتی ہے، بلکہ دو دھاری کاٹ بھی مارتا ہے۔ ایک ہی وار میں کھال تک اُدھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اُن کے کیے ہوئے ترجموں پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔ اپنے ہم عصر ادیبوں کی شخصیات کے اُنہوں نے خاکے کیا لکھے مُنہ بولتی تصویریں اُتاری تھیں۔ ناک کے بال تک گِنوا دیے تھے۔ کوئی شہرۂ آفاق مصوّر اپنے بُرش سے کینوس پر کیا رنگ بھرے گا جو اُن کے الفاظ نے بھرے تھے۔ اِس پر سِتم جوشِ نمبر تھا۔ آج تک ایسا ایٹم بم کبھی کسی نے نہ دے مارا ہوگا جس کے دھماکے سے اچھے اچھوں کی رُوح بلبلا اُٹھی تھی۔ بھلا کوئی زلزلے سا زلزلہ تھا؟

ایک تو بہت بڑے صاحبِ طرز ادیب۔ دُوسرے مانے گردانے موسیقار اور تیسرے دِلّی والے —— لاکھ اپنے خطوط میں میرے لیے فرشتۂ رحمت

ثابت ہوتے ہوں، مگر بہ نفسِ نفیس خود سوا لاکھ سے کیا کم ہوں گے جب کہ مَیں نے خود اُن ہی کے ایک مضمون میں پڑھا تھا کہ جب اُنہیں کسی کا افسانہ پسند نہیں آتا تو وہ نوگرفتار ادیبوں کو چراندی سی باتیں کر کے بھگا دیتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ پہلی مرتبہ ملنے والا اُنہیں مغرور اور خشک مزاج سمجھ لیتا ہے۔

مَیں اُن کی صاف گوئی اور خشک مزاجی کے تذکرے پڑھ پڑھ کر پہاڑ تلے دب کر رہ گئی تھی۔ اپنی تہی دامنی پر آنسو اُبلنے لگے۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ مَیں آخر اُن سے کیا باتیں کروں گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک وقت انگریزی اخبار پڑھ کر اماں پر تو رُعب جمایا جا سکتا ہے، مگر شاہد صاحب سے کسی سیاسی مسئلے پر بحث کروں تو دو ہی قدم چل کر ہانپ جاؤں گی۔ ادب چھانٹوں تو بُری طرح زبان کٹتی ہے۔ کسی اُونچی شخصیت کا تذکرہ لے بیٹھوں تو یقیناً ہکلا کر رہ جاؤں گی۔

نئے لوگوں سے ملنا تو میرے لیے بھی جان جوکھوں کا کام ہے۔ اپنی بے نیازی کا بھی کچھ ایسا ہی عالم ہے کہ دیوار اوٹ کی خبر نہیں ہوتی، اور شاہد صاحب تو پہلی مرتبہ میرے گھر آ رہے تھے۔ گویا چیونٹی کے گھر شیر کی آمد تھی۔

جیسے جیسے سوچ کا سمندر گہرا ہوتا جاتا تھا، میری گھبراہٹ اور وحشت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اِس وحشت اور سوچ نے مجھے ہزار بار رُسوا کیا ہے۔ میرے سیدھے سنبھلے کام بھی اِس کی نذر ہو چکے ہیں۔ کئی خوب صورت کہانیوں کے پلاٹ اِسی نے بدشکل کر رکھے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ عین وقت پر ضرور کوئی نہ کوئی ایسی حماقت سرزد ہو جائے گی جو شاہد صاحب کی طبع نازک پر گراں گزرے

گی اور وہ عمر بھر کے لیے ایک بہت بڑا سا نقش لے کر یہاں سے واپس جائیں گے۔

پھر ——— میرا خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا اور میں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ جاؤں گی۔

شاہد صاحب کے ساتھ پُر سکون انداز میں باتیں کرنا قطعی ناممکن تھا ———

"اماں" ——— میں نے بجھے ہوئے دل سے کہا۔ "شاہد صاحب آ رہے ہیں۔"

"کہاں؟"

"ہمارے گھر۔"

"کب؟" وہ چونک اُٹھیں۔

"کل شام کو۔"

"اچھا ———؟" انہوں نے انتہائی کس مپرسی کے عالم میں کہا اور میں آبلہ پا ہو کر بے اختیار کمرے سے باہر چلی آئی۔

در و دیوار سے خانہ بدوشی کا احساس ٹپک رہا تھا۔ پھاٹک سے لے کر پورچ تک مختلف سائز کی رنگ بھری غلیظ بالٹیاں، ادھ کٹے کنستر، چونے کے دیو قامت ڈرم، چھوٹی بڑی ہلتی لچکتی سیڑھیاں اور سیمنٹ اور ریت کی جھڑتی ہوئی بوریاں کھلی پڑی تھیں۔

پورچ سے آگے گیلری میں ایک بڑا سا نواڑی پلنگ گھسیٹ کر چھوڑ دیا گیا تھا جس پر گھر بھر کا کاٹھ کباڑ ڈھیر تھا۔ اِس سے آگے کھانے کے کمرے میں بڑی میز پر ڈرائنگ روم کا قالین، پردے، لحاف، بستر اور تکیے انبار تھے۔ سائڈ

بورڈ پر نہ صرف الماریوں اور سٹور کے تمام برتن اُلٹ پڑے تھے، بلکہ چھت سے جھڑنے والے چُونے کا ملمّع بھی ہو رہا تھا۔ قریب ہی تخت پر ردّی اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے چیتھڑے اُڑ رہے تھے۔ اِردگِرد کُرسیاں اور پُرانے جُوتے بکھرے پڑے تھے۔

اِس سے آگے ——— حالت ناگفتہ بہ تھی ——— مجھ سے دیکھا نہ گیا۔

"وہ کہاں بیٹھیں گے؟" مَیں نے رو کر پُوچھا ———

"معلوم نہیں" اماں میرے پیچھے پیچھے ہی سر جھکائے چلی آ رہی تھیں ——— سوچوں میں اُلجھ رہی تھیں۔

مجھے اپنے گھر کے چکنے فرش، ہموار ستون، بل کھائی سیڑھیاں، بڑے بڑے لان، سایہ دار درخت سب ہیچ معلوم ہو رہے تھے۔

"بیڈ روم کو ڈرائنگ روم بنا لینا" ——— اماں نے ڈوبے لہجے میں کہا۔

"چہ۔ حد ہے۔ بیڈ روم؟ اماں، آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" مَیں نے چکرا کر بحث کی۔ "بھلا بیڈ روم کو بھی ڈرائنگ روم بنایا جاتا ہے؟"

"مجبوری جو ہوئی"

"مگر ——— شاہد صاحب بیڈ روم میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ وہ یہ نہ کہیں گے کہ عجیب بدذوق لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ اپنے مہمانوں کو غسل خانے میں بٹھلاتے ہیں۔"

"غسل خانہ کہاں ہے؟" اماں تِنک اُٹھیں۔

"ہے کیوں نہیں۔ کمرے کے ساتھ ہی تو غسل خانہ ہے۔"

"توبہ ہے ——— اُنہیں کیا معلوم کہ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں یا بیڈروم میں؟"

"جناب" ——— میں نے اماں کو بالکل شاہد صاحب کی طرح اپنے الفاظ میں جھنجوڑتے ہوئے کہا: "بڑے بڑے ادیبوں سے کچھ بھی چھپا نہیں رہتا۔ وہ ایک نظر میں گہرائیوں تک اُتر جاتے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم"

اماں، ڈرائنگ روم، بیڈروم اور ایک صاحبِ طرز ادیب کی نظر کی گہرائیوں کا فارمولا نہ سمجھ سکیں اِس لیے ڈری سہمی چپکی سی چلی گئیں۔

ہم دونوں پر کڑا وقت پڑا تھا۔ شاہد صاحب اگر میرے گھر موسم بہار میں آتے تو میں اُنہیں ہرے بھرے لان میں گلاب کی خوب صورت کیاریوں کے قریب بٹھاتی۔ اُنہیں گرما گرم بھاپ اُڑاتی خوشبو دار چائے پلاتی۔ اگر وہ سردیوں کے موسم میں آتے تو اُنہیں صاف ستھرے برآمدے کی جھلمل کرتی سُنہری دھوپ میں بٹھاتی۔ برسات کے موسم میں آتے تو میں اُنہیں اُودی گھٹاؤں کے حسین پس منظر میں بالکنی پر بٹھاتی ——— اُنہیں بہترین سگریٹ پیش کرتی۔ چاندی کی ایش ٹرے رکھتی۔

وہ فطرت کے حسین نظّاروں میں اتنے محو ہو جاتے کہ اُنہیں اپنا قلم بھی یاد نہ رہتا۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ آ رہے تھے اور گرمیوں کی ایسی سڑی رُت تھی جب کہ گھر کا ایک کمرہ بھی سلامت نہیں تھا۔ کوئی اُن کا ہم خیال ہم عُمر بے تکلفی سے باتیں کرنے والا بھی نہ تھا۔

رات بھر ہولتے بِدکتے گزری۔ شاہد صاحب کا ہوّا بُرے بُرے خواب

دکھاتا رہا۔

صبح ہوئی تو گویا مشقت اور آزمائش کا دور شروع ہوا۔ آدھا دن تو اماں کو یہ سمجھانے گزرا کہ شاہد صاحب کا یہاں آنا کوئی معمولی سی بات نہیں ہے۔ وہ ایک قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کے اُٹھنے بیٹھنے کے انداز میں ایک رکھ رکھاؤ ہوگا۔ اُن کے اندازِ گفتگو میں ایک بھولی بسری باوقار معاشرت کی جھلک ہوگی۔ اُن کے الفاظ میں اُردوئے معلیٰ کی مہک ہوگی۔ وہ تو بذاتِ خود ایک تہذیب، ایک دنیا سمیٹے ہوں گے۔

دن کا باقی حصہ سٹور میں تاک تاک کر کاٹھ کباڑ کے نشانے لگاتے اور چھان بناتے گزرا۔ خالی کمروں میں ہلچل مچ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے مزدوروں کی ناطقہ بندی ہو چکی تھی۔ ہر کام میزانِ عدل پر پُورا اُترنے کے مترادف تھا۔

لڑ لڑ کر اور جھگڑ جھگڑ کر دیواروں پر تین تین مرتبہ ڈسٹمپر کروایا گیا۔ رگڑ رگڑ کر فرش دھویا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے داغ دھبے چھڑاتے انگلیاں گھسائیں۔ گھسیٹ گھسیٹ صوفہ رکھا۔ جھاڑ جھاڑ قالین کی دُھول سر میں بھری۔ بھاگ بھاگ گل دانوں میں موتیا اور چنبیلی کے پتے سجائے۔

چین کیسا —— آرام کہاں —— شام ہوئی تو سیدھا کھڑا ہونا دشوار تھا۔ کمر چیخ کو دوہری ہو رہی تھی۔ مارے تھکان کے آنکھوں میں اندھیرے کی لہریں گھوم رہی تھیں —— گھٹنوں ٹخنوں میں سے پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔

وحشت کی گھڑیاں —— الامان —— بیٹھنے کا سامان تو جیسے تیسے ہو گیا، مگر یہ بات پھر بھی بھوت بن کر منڈلاتی رہی کہ اُن کے ساتھ باتیں کون کرے گا

اور موضوع کیا ہو گا۔ موسم کی بات تو تین جملوں ہی میں ختم ہو جاتی ہے — پھر؟

ٹھیک شام کے سات بجے ایک رکشا پھاٹک پر آن رُکا۔

دل بے قابو ہو کر ایک دم اُچھلا۔ حلق میں آ کر دھڑ دھڑایا اور تھرتھری چھوٹ رہی تھی جیسے بجلی کے تار پر غلطی سے ہاتھ پڑ گیا ہو۔

ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ دو درویش صفت حضرات ایک دس گیارہ برس کے بچے کو ساتھ لیے پھاٹک میں سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

اپنی تمام وحشتوں کو بھول کر میں ایک ہی جست میں لپک کر پورچ میں اس خیال سے جا کھڑی ہوئی کہ بزرگوں کو گھنٹی بجانے اور انتظار کی زحمت ہرگز گوارا نہ ہو گی۔ وہ تینوں خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے دُور ہی سے شاہد صاحب کو پہچان لیا۔ وہ اپنی تصویر سے مختلف نہیں تھے۔

فراخ پیشانی، چوڑی کمانیوں کی عینک، خضاب لگے چھدرے سیاہ بال، ٹھوڑی میں گول بڑا سا گڑھا، کلف لگا چھوٹی موری کا پاجامہ اور بیل دار کُرتہ۔ پاؤں میں پالش کیے ہوئے چمک دار پمپ۔

مکھی اُڑانے کے انداز میں جھکتے ہوئے سلام کیا۔ مجھے گھبراہٹ میں اپنا تعارف کروانا یاد ہی نہ رہا۔ اُنھوں نے تجسس سے دیکھا۔ پھر گرمی کی شکایت کرتے ہوئے اندر چلے آئے۔

اماں کمرے میں گُم سُم سی کھڑی تھیں۔ علیک سلیک کے بعد شاہد صاحب نے خوش ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ پھر بڑے اطمینان سے جُوتے اُتارے اور ایک خاص انداز میں پالتی مار کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

میں نے گھبرا کر اماں کی طرف دیکھا اور اُنھوں نے میری طرف۔ ہم دونوں کا مُنہ

مارے حیرت کے کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ نظروں کا تصادم ہوا تو زبانِ خاموشی نے بیک وقت استفسار کیا —— "یہی شاہد صاحب ہیں؟"

ایک ہلکی سی نیکیلی مسکراہٹ ہمارے لبوں پر چُپکے سے پھیل گئی۔ میرے دل کو بڑی سرور آمیز ڈھارس بندھ گئی۔ کھنچے ہوئے اعصاب کا تناؤ چیخ کر ایک دم سے نرم پڑ گیا۔ مَیں نے گردن جھٹک کر اماں کی طرف سے بے نیازی کا اظہار کیا۔ ایک منٹ کے لیے ایسا سماں بندھ گیا گویا شاہد صاحب نے اپنے گھر میں تخت پر بیٹھ کر میزبانی کے تمام فرائض سمیٹ لیے اور ہمیں مہمان بنا دیا۔

"سب سے پہلے یہ بتایئے آپ لوگ کہاں کے ہیں؟" اُنہوں نے خود ہی باتوں کی رسمِ افتتاح کر ڈالی۔

"نہ یہاں کے —— نہ وہاں کے ——" اماں نے جھٹ خوش ہو کر کہا۔

اِس کے بعد ایک انتہائی پُرسکون ماحول میں موضوعات کا ایک ریلا خود بخود بہتا چلا آیا۔ بہاؤ اتنا تیز تھا کہ بچنا ناممکن تھا۔ دُور دُور تک کنارے کا کہیں نشان نہیں مِل رہا تھا۔

ہم نے سر جوڑ کر اتنی باتیں کیں —— اتنی باتیں —— اتنی باتیں کہ حد نہیں۔

جوڑوں کے درد کی باتیں، ڈنڈے مار مار کر کپڑے دھونے اور بچے سنوارنے کی باتیں۔ فیشن کی باتیں۔ ٹیڈی لڑکوں کی باتیں۔ ناخلف اولادوں کے تذکرے۔ گھٹیا قسم کے فلمی گانوں کی باتیں۔ پان سگریٹ کی باتیں —— دِلّی اور علی گڑھ کی باتیں —— بس اچار چٹنی کی ترکیبوں کی کسر رہ گئی۔

مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کراچی سے خالہ اماں آئی ہیں۔

"رندِ شاہد باز"

اخلاق احمد دہلوی

"اوراق" لاہور کے شمارۂ خاص ۳۔ ۱۹۶۷ء کے صفحات پر میرزا ادیب صاحب رقمطراز ہیں کہ :-

"میں شاہد احمد دہلوی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، تو مجھے فی الفور جہاں آباد کی وہ روایات یاد آجاتی ہیں جنہوں نے اپنی گود میں شرافت، وضعداری، ایثار، خلوص اور محبت کے احساسات کی پرورش کی تھی۔ اِن سب کا نام دہلویت ہے، دہلویت، جس میں، جہاں دہلی کے لال قلعے کی عظمت و تجمّل پرتَو افگن ہے، وہاں دہلی کی جامع مسجد کی وسعت اور پاکیزگی بھی کار فرما ہے۔ اسی دہلویت کی تخلیق میں مُغلوں کی قلبی وُسعت، فطری لطافت میرؔ اور دردؔ کے سوز و گداز اور غالبؔ کی انسان دوستی نے حصّہ لیا تھا۔ یہ دہلویت کوثر و تسنیم کی موجوں میں نہا کر نکلی تھی۔ یہ دہلویت جو ہماری ثقافتی متاع تھی ـــــ یہ دہلویت تھی جو شاہد احمد تھی۔"

عارف المتین صاحب نے مذکورہ اوراق کے صفحات پر شاہد صاحب کے بارے

میں اِن خیالات کا اظہار کیا ہے کہ :

"شاہد احمد دہلوی ایک صاحبِ نظر خاکہ نگار، بلند پایہ مُترجم اور کلاسیکی موسیقی کے گِنے چُنے ماہرین میں سے ایک تھے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ایسے صاحبِ نظر مدیر تھے، جنہوں نے اپنے جریدے "ساقی" کے ذریعے اَن گنت ہونہار اُدبا کو دُنیائے اَدب سے روشناس کرایا، اور ان کے فن کو نشو و نما کے وافر موقعے فراہم کر کے بالآخر دُنیا سے اُن کی اَدبی عظمت کا لوہا منوایا اور یوں سالہا سال اُردو اَدب کے کشتِ زار کی آبیاری کی ـــــــ"

میرزا ادیب صاحب، عارف عبدالمتین صاحب اور شاہد صاحب کے اور مدّاحوں، پرستاروں اور نقّادوں نے جیسا اُنہیں پایا، شاید اُن میں سے کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو کہ مدیرِ ساقی کی شخصیّت کی تعمیر میں اُن کے گھرانے کی خاص اَدبی فضا اور ماحول کو جتنا دخل ہے، اُس سے کہیں زیادہ مرحوم اِشتیاق احمد چشتی کا یہ کارنامہ ہے جو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تمام مطبوعات، منقولہ اور غیر منقولہ املاک اور اولاد کے مولوی بشیر الدین احمد ہی کے زمانے سے نگران اور اتالیق تھے ـــــــــــ اصل میں ایک طرح سے یہ "اشتیاق احمد چشتیت تھی" جسے مرزا ادیب صاحب نے یوں رقم کیا ہے کہ: "یہ دہلویت تھی جو شاہد احمد تھی"۔ آصف علی بیرسٹر اگر زندہ ہوتے اور عارف عبدالمتین صاحب کا یہ فقرہ پڑھتے کہ "شاہد صاحب ایک ایسے صاحبِ نظر مُدیر تھے جنہوں نے اپنے جریدے "ساقی" کے ذریعے اَن گنت ہونہار اُدبا، کو دُنیا ادب سے رُوشناس کرایا اور اُن کے فن کو نشو و نما کے وافر موقعے فراہم کر کے بالآخر دُنیا سے اُن کی اَدبی عظمت کا لوہا منوایا"۔ تو آصف علی صاحب، عارف عبدالمتین صاحب سے شاید کہتے کہ جن صاحب نے شاہد صاحب کی اَدبی عظمت کا لوہا منوایا، اُن کا بھی کچھ ذکر چاہیے تھا کہ کم سنی سے پروان چڑھنے تک

"ساقی" اور مدیرِ ساقی کی سالہا سال اشتیاق احمد چشتی صاحب نے جس طرح تالیف اور تربیت کی اور جیسا جیسا خون پسینہ اِن دونوں کے لیے ایک کیا، یعنی "ساقی" کے لیے اور مُدیرِ ساقی کے لیے، اُس کے بعد شاہد صاحب کے ضمن میں اشتیاق احمد چشتی صاحب کا ذکر نہ کرنا انصاف نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ جس طرح ع اصلِ شہود و شاہد و مشہود — ایک ہیں — اُسی طرح ایک طریقے سے اشتیاق احمد چشتی "ساقی" اور شاہد احمد دہلوی بھی، — ایک ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس "تثلیث" کا علم لوگوں کو اس لیے نہ ہو سکا کہ چشتی صاحب نے زندگی بھر جتنے بھی کام کیے، وہ یُوں سمجھے جاتے رہے جیسے کوئی اور یہ سب کام کر دیتا — اور چشتی صاحب کا صرف نام ہو جاتا — اور "ساقی" پر برسوں چشتی صاحب کا نام بحیثیت مُہتمم گویا برائے نام چھپتا رہا۔ اور پیرزادہ سیّد پیر ولایت حسین خُمار دہلوی جیسے شاہد صاحب کے عزیز چشتی صاحب کو مدِّ فاضل گردانتے رہے۔

ایک اُدبی محفل میں ایک دفعہ اشتیاق احمد چشتی صاحب سے جب آصف علی صاحب بیرسٹر نے کہا کہ صاحب، یہ بڑی ہمّت کی بات ہے کہ شاہد صاحب اپنے نام کے ساتھ "دہلوی" لکھتے ہیں۔ ہماری اور آپ کی سات سات پُشتیں دِلّی میں گزر گئیں ہم میں یہ ہمّت پیدا نہ ہو سکی، تو چشتی صاحب نے کہا کہ اس گھرانے میں مولوی عبدالحق مُحدّث دہلوی کے گھرانے کی مٹّی گُندھنے سے وہ بات تیسری ہی پُشت میں پیدا ہو گئی جو اور لوگوں میں سات سات پُشتیں گزرنے پر پیدا نہیں ہوتی — اور مثال دی خواجہ حسن نظامی دہلوی کی جن کا خاندان سُلطان نظامُ الدّین اولیا کے وقت سے دلّی ہی میں آباد تھا، لیکن جو دہی کو مؤنث سات پُشتیں گزرنے کے بعد بھی سمجھتے تھے۔ شاہد صاحب نجیب الطّرفین ادیب تھے۔ ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے انہیں علم و ادب ورثے میں ملا۔

اس لیے اُنہیں اشتیاق احمد چشتی صاحب نے مجبور کیا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ "دہلوی" لکھیں اور اطمینان دلایا کہ اگر کوئی اعتراض کرے گا، تو جواب اس کا میں دوں گا؛ چنانچہ "شدّو میاں" کو شاہد احمد دہلوی بنانے والے اصل میں ایک طرح سے اشتیاق احمد چشتی تھے۔

شروع شروع میں "شدّو میاں" اپنے نام کے ساتھ اپنے قلم سے "دہلوی" نہیں لکھتے تھے، لیکن چشتی صاحب نے بحیثیت مہتمم ساقی، ساقی پر اِن کے نام کے ساتھ 'دہلوی' چھپوانا شروع کر دیا —— اِس ہیچمداں کا جب پہلا مضمون ۴۴-۴۳ء میں "معاملہ بندی" کے عنوان سے ساقی میں چھپا تو ایڈیٹر پیشوا مولوی عزیز حسن بقائی نے سرِ بازار اس خاکسار کو ٹوک کر کہا کہ میاں، ماموں کے کانوں میں اُنٹیاں اور بھانجے اُنٹھے اُنٹھے پھریں —— ہمارا بھی کوئی اشتیاق احمد چشتی جیسا ماموں ہوتا، تو ہم بھی تمہیں اور تمہارے رشتے کے خالہ زاد بھائی سیّد ولی اشرف المعروف بہ اشرف صبُوحی کی طرح اپنے نام کے ساتھ "دہلوی" لکھ کر دکھاتے —— "شدّو میاں" کو تو اشتیاق صاحب نے تیسری ہی پُشت میں "دہلوی" بنا دیا۔ اَب کون نہیں جانتا کہ "ڈپٹی صاحب" (مولوی نذیر احمد) بجنور کے تھے، لیکن زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ اَب چشتی صاحب کے سامنے کس کی چل سکتی ہے!

جب "ساقی" قُطب مینار کا عکس لے کر اَدب کے اُفق پر قطب صاحب کی لاٹھ کی طرح طلُوع ہُوا، اس وقت شاہد صاحب اَدب اور موسیقی کے سنگم پر کھڑے تھے۔ یا —— بیٹھے تھے۔ اصل میں شاہد صاحب کے لیے بیٹھنے کا لفظ زیادہ مُناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کھڑے رہنے کے وہ ذرا کم ہی قائل تھے۔ شاید اُن کے بیٹھے رہنے ہی کی عادت تھی کہ اُنہیں اَدب کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی سے بھی شغف ہو گیا، کیونکہ اَدب اور موسیقی دونوں کی ریاضت کے لیے پتّہ مار کر بیٹھنا ازبس ضرُوری سمجھا جاتا ہے، اور پھر

جب شاہد صاحب کہیں بیٹھتے تھے، تو یوں بیٹھتے تھے کہ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے — اگر کہیں بیٹھنے کی کوئی چیز نہ ہوتی تو اُکڑوں ہی بیٹھ جاتے۔ شاہد صاحب چلنے پھرنے کے بھی کم قائل تھے — ہاں، البتہ سواری میں بیٹھ کر وہ دُنیا کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک جا سکتے تھے، لیکن پیدل اگر وہ ایک فرلانگ بھی چلتے تو پاؤں میں چھالے پڑ جاتے۔ پندرہ منٹ پیدل چل کر اگر کوئی مُسافت طے ہو سکتی تو وہ سواری کے انتظار میں اُس پندرہ منٹ کی مُسافت کے لیے ایک گھنٹہ اکڑوں سڑک پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے، اور بھرے بازار میں کسی فٹ پاتھ پر کسی سواری کے انتظار میں اکڑوں بیٹھنے میں کوئی عار کبھی محسوس نہ کرتے —

مرحوم اشتیاق احمد چشتی، جو اُن سے بھی پُرانے لوگوں کو نئی وضع قطع کے آدمی معلوم ہوتے، پُرانی قدروں کے اس شدّت سے قائل تھے کہ قوّالی کے علاوہ یا شادی بیاہ کے طوائفوں کے مُجروں سے قطعِ نظر، وہ فنِّ موسیقی کو صرف "میراثیوں" ہی کی میراث سمجھتے تھے اور یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ شاہد صاحب مولوی بشیرالدین احمد کے صاحبزادے اور ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہو کر اس فنِّ لطیف سے اتنا اشتیاق رکھیں کہ خود یہ فن سیکھیں۔ یہ شاہد صاحب اور چشتی صاحب دونوں کی وضعداری تھی کہ دونوں نے ایک دُوسرے کے جذبات کا محض اخلاقاً احترام کیا۔ چشتی صاحب کے جیتے جی شاہد صاحب نے اس فنِ لطیف کو صِرف شوق کی حد تک رکھا۔ اور اَدب، جو اُن کی جدّی میراث تصوّر کیا جاتا تھا، اُس میں زیادہ انہماک سے کام لیا، لیکن چشتی صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی گویا "ساقی" کے قطب مینار کا ایک کھنڈ (منزل) گر پڑا اور جہاں "ڈپٹی صاحب" (مولوی نذیر احمد) کے باقی پوتے، پوتیوں اور نواسی نواسوں نے اپنی اپنی منشاء کے مُطابق اپنی اپنی الگ دُنیا بسانی شروع کی، وہاں شاہد صاحب بعض لوگوں کے نزدیک گانے بجانے

ہی کی دُنیا میں گُم ہو کر رہ گئے۔

چشتی صاحب اِس برِّصغیر کی ہر درگاہ، خانقاہ، مزار کے عرس اور ثقافتی محفل میں ہمیشہ مدعو کیے جاتے ہیں اور مولوی عبدالسلام صاحب کی طرح ہر محفلِ سماع، محفلِ ثقافت اور عرس میں مرکزی حیثیت کے حامل سمجھے جاتے، لیکن جس طرح مولوی عبدالسلام صاحب نے اَپنے بعد اَپنے علم و فضل اور فلسفے اور فکر کی کوئی نشانی نہ چھوڑی، اسی طرح چشتی صاحب نے بھی اپنے پیچھے سوائے اُس خلا کے، جو اُن کے بعد دلّی کی تہذیب میں پیدا ہوا، کوئی علامت نہ چھوڑی۔ اُن کے اُٹھتے ہی دلّی کی تہذیب کی گویا ایک منزل بیٹھ گئی۔ جس کی تعمیر از سرِ نو اب ممکن نہیں، بالکل اُسی طرح جیسے قطب مینار کی اُس سب سے اُوپر کی منزل کی مرمّت اَب نہیں ہو سکتی جو گر چکی ہے۔" ساقی" کے سرورق کا قطب مینار بھی چشتی صاحب کے بعد رفتہ رفتہ بے رنگ اور مدّھم ہوتا چلا گیا اور ساقی کے سرورق کی قطب صاحب کی لاٹھ نے سُکڑتے سُکڑتے پہلے گوشہ نشینی اختیار کی اور پھر دلّی کے اس علامتی نشان کی جگہ جدید آرٹ نے سنبھال لی، اور ساقی نے بِنا کی روشِ لُطف و کرم اور —— یعنی —— آں قدح بشکست و آں ساقی نماند ——

ساقی کے سرورق سے قطب مینار کا علامتی نشان غائب ہوتے ہی اب گویا ساقی میں "کوثر و تسنیم" میں دُھلی ہوئی نتھری سُتھری زبان کی کوئی قید نہ رہی اور دلّی کے سیّد بادشاہ حسین، آغا حیدر حسن، علّامہ راشد الخیری، سید ناصر نذیر فراق، حضرتِ جالب، خاں بہادر میر ناصر علی، سیّد وحید الدّین بیخود، خواجہ عبدالمجید، پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی، پنڈت چندر بھان کیفی، پنڈت امرناتھ ساحر، مولانا احتشام الدّین حقی، میرزا لبیب گورگانی، مولوی عنایت اللہ، مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، آصف علی بیرسٹر، سیّد ابوالخیر مودودی، علامہ مضحک، محمد مرزا (جرنلسٹ) مرزا محمود بیگ اور مُلّاں واحدی جیسے بزرگانِ ادب، اور سیّد انصار ناصری،

صادقُ الخیری، ظفر قُریشی، فضلِ حق قُریشی، محمد میاں جاذب قریشی آفاقی، صلاحُ الدین قریشی
یُوسف بخاری، اشرف صبُوحی، الحاج حافظ سید وصی اشرف (ایڈیٹر "شاہجہان" اور مالک
کُتب خانہ علم و ادب) احمد علی، شان الحق حقی، مسعُود الحسن تابش، پیر ولایت حسین خمار
ممتاز حُسین، حبیب اشعر، نوّاب خواجہ محمد شفیع، قاضی عباس حُسین ظریف اور عرش تیموری جیسے
جوانانِ ادب کے ساتھ ساتھ چشتی صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی مرزا عظیم بیگ چغتائی، میاں
ایم۔اسلم، مرزا فہیم بیگ چغتائی، سیّد آلِ عبا آوارہ مارہروی، ناکارہ حیدر آبادی، حجاب
اسمٰعیل (بیگم حجاب امتیاز علی تاج) عبدُالخالق نہال سیہواروی، اسرار الحق مجاز رُدولوی،
چودھری محمد علی رُدولوی، احسان دانش کاندھلوی (پہلے احسان دانش صاحب اپنے نام
کے ساتھ "بن دانش" لکھتے تھے) قیوم نظر، یُوسف ظفر، انور مختار صدیقی (اب صرف مختار
صدیقی)، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، اُپندر ناتھ اشک، دِشوا منز عادل، راجندر سنگھ بیدی
گوپال متّل، مہندر ناتھ، جاں نثار اختر، معین احسن جذبی، جوش ملیح آبادی، جگر مُرادآبادی
فراق گورکھپوری، فرید جعفری مچھلی شہری، سلام مچھلی شہری، سید سجّاد ظہیر، سیّد سبط حسن،
علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، نیاز فتحپوری، ل۔ احمد اکبرآبادی۔ ح۔ ب صاحبہ، سیماب
اکبرآبادی، ساغر نظامی، مُنشی پریم چند، علی عباس حُسینی، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، سیّد
وقارِ عظیم، عبادت بریلوی (ڈاکٹر)، ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)، آلِ احمد سرور (پروفیسر)
سیّد احتشام حُسین (پروفیسر)، حمید احمد خان (پروفیسر)، حامد علی خان، راجہ مہندی علی خان،
ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، اختر حُسین رائے پوری، اختر اُرینوی، اختر الایمان، اختر شیرانی،
حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیارپوری، میراجی، ن۔م۔ راشد، فیض احمد فیض، سیّد رفیق حُسین
سعادت حسن منٹو، ابن حزیں سیالکوٹی، ریاض رؤفی، شاد عارفی، ڈاکٹر رشید جہاں، پنڈت
گوپی ناتھ امن، ہاجرہ بیگم، سیّد سجاد حیدر یلدرم، خواجہ غلام السیّدین، شمشیر سنگھ نرولا، قرۃ العین

حیدر، شوکت تھانوی، مُلّا رموزی۔ مجنوں گورکھپوری، خمار بارہ بنکوی، بیڈھب بنارسی،
سیّد احمد شاہ بخاری، پطرس (پروفیسر)، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا تاجور نجیب آبادی،
مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسُول مہر جیسے مشاہیر بھی ساقی کی محفل میں بلا تکلف شریک
ہونے لگے ——— اِس طرح ساقی کے دامن میں اور وُسعت نظر آنے لگی اور
جب تک شاہد صاحب نے موسیقی کو دن رات کا اوڑھنا بچھونا نہ بنایا، ساقی کا معیار یہ
رہا کہ اُردو کے بڑے بڑے دیوزاد اَدیب ساقی کے پَری خانے میں شریک ہو کر فخر محسوس
کرتے، مگر جوں جوں شاہد صاحب کا موسیقی کا ذوق چشتی صاحب کا اُنکس نہ ہونے
کی وجہ سے بڑھتا گیا، ساقی کا معیار گِرتا چلا گیا اور نوبت بہ اینجا رسید کہ دلّی والے اُستاد
چاند خاں کی غزلیں تک ساقی میں چھپنی شروع ہو گئیں ——— ساقی کی باگ ڈور
شاہد صاحب نے محمد حسن عسکری صاحب کے سُپرد کر کے اپنی رَاسیں دلّی والے اُستاد
بُندو خاں سارنگی نواز، اُستاد اللہ دیے (کھاوجی) اور اُستاد چاند خاں وغیرہ ہم کو تھما دیں۔
اور موسیقی کے ایک اُستاد تو شاہد صاحب پر ایسے چھائے کہ اُنہیں نہ صرف موسیقی، بلکہ
شراب و شاہد کو بھی کچھ عرصے تک اپنی زندگی کا ایک جزو سمجھنا پڑا۔ یہ ایسے اُستاد تھے
جن کا قول تھا کہ جس طرح ع اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں۔ اُسی طرح شراب و
شاہد و ساقی کو بھی ایک ہونا چاہیے ——— اور صُوفیا کی سماع کی محفلوں میں "قول
قلبانے" پر چاہے کتنا ہی سَر دُھنا جائے، بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر ———
اِس لیے "بھائی شاہد"۔ جو "ماموں اشتیاق" کی زندگی میں اُن کے جگت ماموں سمجھے
جانے کے ساتھ ساتھ جگت بھائی کہلائے جانے لگے تھے، عارضی طور پر "رندِ شاہد باز"
بن گئے ——— اِن موسیقی کے اُستاد نے شاہد بھائی کو کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ "ش"
سے مُراد شراب اور "ق" کا مطلب قورمہ شاہد بھائی سمجھنے پر مجبور ہو گئے اور "ش"، "ق"

کی صحت اور دُرستی سے مطلب شاہد بھائی کی لغت میں اَب یہ نکلنے لگا، کہ پُرانی شراب اور تازہ تورمہ معہ جیتے جاگتے ساقی کے اگر ہے تو "س-ق" درست ہے، ورنہ سب حرفِ غلط ——————

لیکن وہ جو "ماموں اشتیاق" کی تربیت نے "بھائی شاہد" میں وضعداری اور ملنساری کی جڑ بوئی تھی، وہ جڑ اِن موسیقی کے اُستاد کے کاٹے کٹ نہ سکی اور ادب کا بیج جو اِن کی جدّی میراث تھا، ہر حالت میں شاہد صاحب میں پھلتا پھولتا رہا؛ حالانکہ موسیقی کے مذکورہ اُستاد نے اِس بیج کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی امکان بھر کوشش کی۔ ہاں، اتنا ضرور تھا کہ ایک طرف اب محمد حسن عسکری صاحب اِن کو اَدب کی طرف کھینچتے تھے اور دُوسری طرف یہ نئے موسیقی کے اُستاد، جو پُرانے موسیقی دان اور اپنے فن میں بڑے گُنی اور "فنافی الفن" تھے، اُنہیں راگ رنگ اور شراب و شاہد یعنی سچ مُچ کے ساقی کا رسیا بنانے پر تُلے ہُوئے تھے —— اور اس اَدب اور موسیقی کی ترازو کا پلڑا کبھی محمد حسن عسکری صاحب کی طرف جُھک جاتا اور کبھی اِن موسیقی کے اُستاد کی طرف —— لطیفہ یہ تھا کہ اِن دونوں فنونِ لطیفہ کے شیدائیوں کا ایک دُوسرے سے مُطلق کوئی تعارف نہ تھا۔ یعنی نہ محمد حسن عسکری صاحب اِن موسیقی کے اُستاد کے گُنوں سے واقف تھے اور نہ یہ موسیقی کے اُستاد محمد حسن عسکری صاحب کی اَدبی صلاحیتوں سے ——————

محمد حسن عسکری صاحب نے جب ساقی کی باگ ڈور سنبھالی، تو وہ اَدبی رسالوں کا ایسا دَور تھا جب عام رسالوں کو خاص نمبر شائع کرنے کا شوق نیا نیا پیدا ہُوا تھا لیکن محمد حسن عسکری صاحب نے ساقی کے ہر عام نمبر کو اپنی اور فراقؔ گورکھپوری کی باتوں سے ایسا خاص کر دیا تھا کہ عام طور پر اَدب کے شائقین ساقی کے عام نمبروں کو اور رسالوں

کے خاص نمبروں پر بھاری سمجھتے تھے ——— اور وہ لوگ جو محمد حسن عسکری صاحب سے اس بات پر کھنساتے تھے کہ مسٹر "کے۔ای۔بَیل" (ایک صاحب تھے کرم الٰہی جو ساقی کے لیے بیل کی طرح کام کرتے تھے ——— جن کا نام اِن کے محنتی ہونے کی وجہ سے 'بَیل صاحب' کرم الٰہی کی جگہ پڑ گیا تھا اور رفتہ رفتہ جن کا ترجمہ انگریزی میں شاہد صاحب نے MR: K.E.BELL کر دیا تھا) محنت ان کی۔ پیشہ شاہد صاحب کا، اور نام ہو عسکری صاحب کا ——— اور یہ کہ ماسٹر ممتاز حسین صاحب، سیّد انصار ناصری صاحب، فضلِ حق قریشی صاحب اور ظفر قریشی صاحب نے جس بیل کو اپنے خُون پسینے سے سینچا، اُس کے پھل اَب محمد حسن عسکری صاحب سمیٹیں گے ——— وہ بھی ساقی کو نئے سِرے سے محمد حسن عسکری کی ادارت میں سنبھلتے دیکھ کر اپنا سا مُنّہ لے کے رہ گئے ——— اور سب کو یہ یقین ہو گیا کہ جس طرح دلّی کی قطب کی لاٹھ اپنی اُوپر کی منزل سے سُبکدوش ہونے کے باوجود اپنی پائیداری کے باعث آسمان سے باتیں کرتی رہے گی، اُسی طرح ساقی کو بھی کوئی حادثہ زمین پر نہیں گرا سکتا، چاہے وہ اشتیاق احمد چشتی صاحب کے انتقال ہی کا حادثہ کیوں نہ ہو، لیکن وہ جو آیا ہے کہ

ع ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں ——— تو تغیّر آیا اور ایسا کہ باید و شاید ——— ایسا تغیّر کہ اس سے پہلے نہ کسی نے دیکھا نہ سُنا۔

۴۷ء کے فسادات کی آندھی نے جہاں بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیے اور قطب مینار اور تاج محل جیسی عمارتیں ہلا کر رکھ دیں، وہاں اس کوٹھڑی کے دھان اُس کوٹھڑی میں۔ اور اُس کوٹھڑی کے دھان اِس کوٹھڑی میں کچھ اس طرح کر دیے کہ کچھ عرصے تک تو یہی پتہ نہ چل سکا کہ کون سے دھان اصل میں کس کوٹھڑی کے ہیں اور دھان کون سے ہیں اور چاول کون سے ——— ؟ اس طوفان سے شاہد صاحب

جیسے دھان پان، جن کی اُلٹ پلٹ پانوں کی طرح اب تک ہوئی تھی اور جو والدین کا سایہ سر سے اُٹھنے پر اشتیاق احمد چشتی جیسے مشفق اتالیق کی نگہداشت اور ماسٹر ممتاز حسین، سیّد انصار ناصری، فضلِ حق قریشی اور ظفر قریشی جیسے مُحبّان و رفقائے کار کی صُحبت اور کرم الٰہی صاحب کی جانفشانی کے طفیل گویا ایک طرح سے بھنورے میں پل رہے تھے۔ اللہ میاں کے گُنبد سے نکل کر ایک دَم کھُلی زمین پر آ رہے ہے، اور وہ ساقی جس نے محمد حسن عسکری صاحب کی ادارت میں سنبھالا لیا تھا، داغ فراق صُحبتِ شب کی جلی ہوئی اِک شمع کی مانند نظر آنے لگا، اور گانا بجانا جو کسی زمانے میں شاہد صاحب کا شوق تھا، اب اُن کا ایک طرح سے پیشہ بنتا نظر آیا، شاہد احمد دہلوی، مُدیر ساقی ——— خاں بہادر شمسُ العلماء، ڈاکٹر حافظ مولانا مولوی نذیر احمد ایل۔ایل۔ڈی، ڈی۔او۔ایل، جو بمقام موضع ریہڑ، پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے تھے اور خاندانی تنازعات سے بیزار ہو کر اپنے والد صاحب مولوی سعادت علی مرحوم کو چھوڑ کر بجنور میں آ رہے تھے، جن کا شجرۂ نسب شاہ عبدالغفور اعظم پُوری سے ملتا ہے اور جو شاہ عبدالقدّوس گنگوہی کے نامور خلفا میں سے تھے، جن کے بارے میں شیخ عبدُالحق مُحدّث دہلویؒ نے ایک جگہ اپنے تذکرے میں فرمایا ہے کہ "شاہ عبدالغفور اعظم پوری از خلفائے شاہ عبدالقدوس گنگوہی صاحبِ کرامات و مقامات بُودہ اند" کے پوتے اور مولوی بشیر الدّین احمد کے صاحبزادے "ڈپٹی صاحب" کی تمام روایات اور چشتی صاحب کی ساری ہدایات کو بالائے طاق رکھ کر یوسفِ بے کارواں ہوتے ہی یوسف بُخاری کے سمجھانے بُجھانے کے باوجود گانے بجانے کو اپنا پیشہ بنانے پر مجبُور ہو گئے، اور ریڈیو پر ایس۔احمد کے نام سے گانے لگے۔ اور رفتہ رفتہ کھُلے طور پر بھائی شاہد سے استاد ایس۔احمد بن گئے۔ع "روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر" کے تحت ——— اور اسی روٹی کمانے کے پھیر

میں اُدب میں وہ روش اختیار کرلی جو صرف ابن الوقتوں کا خاصّہ ہوتا ہے ——— اور شاہد صاحب کے بعض خیر خواہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ گانے نے شاہد صاحب کو اور شاہد صاحب نے گانے کو کہیں کا نہ رکھّا۔

ہاتھی کٹے پہ بھی سوا لاکھ ٹکے کا ایک زمانے تک سمجھا جاتا رہا، لیکن جب دو کٹے ہُوئے ہاتھیوں میں ٹکرّ ہو جائے تو نتیجہ معلوم!

شکر رنجیاں اور تلخ کلامیاں، مولانا محمد حُسین آزاد کے والدِ محترم مولوی محمد باقر اور میر جعفر علی، میرؔ اور سوداؔ، مُصحفیؔ اور انشاءؔ، غالبؔ اور ذوقؔ، مولانا محمد حُسین آزادؔ اور حکیم مومن خاں مومنؔ، انیسؔ اور دبیرؔ، سر سیّد اور اکبرؔ الہ آبادی، مولانا محمد علی جوہرؔ اور خواجہ حسن نظامی، مولوی احتشام الدین حقّیؔ اور مولانا نیاز فتحپوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی اور جگرؔ مُرادآبادی، عصمت چغتائی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی، محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر تاثیرؔ، نواب جعفر علی خاں اثرؔ اور رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری، آغا محمد باقر (نبیرۂ آزادؔ) اور ڈاکٹر محمد صادق، اور اب انتظار حُسین اور صفدر مِیر میں بھی ہُوئیں، لیکن نہ اس طرح جس طرح شاہد صاحب نے استاد "ایس۔ احمد" بننے کے بعد جوشؔ صاحب سے ٹکرّلی اِس طرح کہ اِنسانوں کے جھگڑے کی جگہ یہ خود بقول شاہد صاحب "دوگائے کی ٹکرّ" نظر آنے لگی۔

(بھائی شاہد کی ہاں ایک مُلازم تھا ایک زمانے میں، جو غلط سلط اُردو بولتا تھا۔ ایک دن وہ کسی کام سے باہر گیا اور جلدی کا کام جب دیر میں کر کے واپس آیا اور اُس سے پُوچھا گیا کہ دیر کیوں لگی، تو اُس نے دو بِچاروں کی ٹکرّ کا ذکر اپنی زبان میں یوں کیا کہ "راستے میں دوگائے کا جھگڑا ہوتا تھا وہ ہم دیکھنے کھڑا ہو گیا تھا" اُس دِن کے بعد سے جہاں کہیں بھی بازار میں دو بِچاروں کو لڑتے بھائی شاہد دیکھتے تو کہتے ——— "دوگائے کا جھگڑا ہو رہا ہے" ———)

گو اس دنگل کا آغاز جوش صاحب کی طرف سے ہُوا، لیکن شاہد صاحب جیسے مُرنجاں مرنج، ملنسار، وضعدار اور رفع شر کے قائل نثر نگار کو جوش صاحب جیسے مصلحت ناآشنا اور ناعاقبت اندیش شاعر کے ساتھ جو رعایت برتنی چاہیے تھی، وہ نہ صرف یہ کہ اُنھوں نے نہیں برتی، بلکہ اینٹ کا جواب کچھ ایسے پتھر سے دیا کہ بیشتر مخالف افراد کا شیشۂ دل چُور چُور ہو گیا۔

اصل میں شاہد صاحب کو شروع ہی سے کچھ شاعروں کے طور طریق پسند نہ آتے تھے۔ ایک تو یہ بات، دُوسرے یہ کہ اُنہیں ہمیشہ شاعروں سے یہ شکایت رہی کہ نثر نگار گھنٹوں رپتہ مار کر بیٹھتا ہے۔ ایک صفحہ لکھنے کے لیے سو صفحے پڑھتا ہے تب کہیں جا کر نثر کا کوئی ٹکڑا تیار ہوتا ہے ——— اس پر بھی کوئی کسی نثر نگار کو کہیں کم ہی سُننے کا روادار ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس شاعروں کا یہ ہے کہ بقول سید احمد شاہ بُخاری "پطرس" پڑھے نہ لکھے نام محمد ترقی پسند" ——— چلتے پھرتے شعر ہو جاتے ہیں اور ایک ایک شعر دسیوں دفعہ سیکڑوں محفلوں میں سُناتے ہیں اور داد بھی پاتے ہیں اور نقدی بھی وصول کرتے ہیں۔ نثر نگاروں میں سوائے ایسے اسلامی، تاریخی ناول نگاروں کے جیسے مولانا عبدالحلیم شرر تھے، جن کے ناول کچھ لوگوں کے نزدیک نہ پُوری طرح اسلامی ہیں نہ تاریخی اور نہ ناول یا ظفر عمر جیسے جاسُوسی ناول نویسوں اور کورس کی کتابیں لکھنے والوں کے کوئی کم ہی پڑھا یا سُنا جاتا ہے، شاعروں کو ہر جگہ سُن لو ——— جاہلوں کی محفلوں سے لے کے عالموں اور حاکموں کی محفلوں تک! شاعری کے لیے کہا جاتا ہے کہ ع شاعری جزو یست از پیغمبری ——— حالانکہ بڑی باتیں ہمیشہ نثر ہی میں کہی گئی ہیں ——— پھر یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگوں کے نزدیک شاہد صاحب کا شاعری کا خانہ ویسے بھی خالی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ

ساقی کا حصّۂ نظم ہمیشہ نثر کے مقابلے میں کمزور رہا۔ اور بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ نثر نگار کو سُنے نہ جانے کی جھونج ہی تھی جو اُنھوں نے گا گا کر نکالی —! چنانچہ اُنھوں نے سارے شاعروں کا غصّہ جوشؔ صاحب پر اُنڈیل دیا۔ اور جوشؔ صاحب کا اُن کو چھیڑنا اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا —— جوشؔ صاحب نے کہیں شروع میں کہہ دیا تھا کہ ؎

ساقی کے مُدیر اور مئے ناب سے دُور

بر عکس نہند نامِ زنگی کافور

گرہ تو دل میں شاہد صاحب کے جوشؔ صاحب کی طرف سے اُسی دن سے بیٹھ گئی تھی یعنی پہلے ہی تعارف سے، اُس پر مستزاد یہ کہ جوشؔ صاحب نے اب ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف میں ترمیم و اصلاح شروع کر دی ترقّیٔ اُردو بورڈ کی ڈھال سامنے کر کے —— یُوں شاہد صاحب اور جوشؔ صاحب کا آمنا سامنا ہوا —— اور مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے بھی مرزا غالبؔ کے لیے کبھی ایسی کڑوی کسیلی باتیں نہیں کی تھیں۔ جیسی اِن دونوں دیوزادانِ اِدب نے ایک دُوسرے کو سنائیں —— ایسی مُلّاحی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

"افکار" جو محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور اور پشاور سے منظور شدہ ہے، اور جس کا جوشؔ نمبر کا دُوسرا ایڈیشن کراچی یونیورسٹی نے "ایم۔اے" کے نصاب میں شامل کر لیا ہے، اسی افکار کے جوش نمبر کے دُوسرے ایڈیشن میں اُردو ادب کے دو صاحبِ طرز اور عظیم ادیب اور شاعر یوں بغیر خم ٹھونکے اور بے لنگر لنگوٹ کسے اور بِنا لڑائی کے داؤں گھات جانے کسی ادائے خاص سے نکتہ سرا —— ہونے کی جگہ کچھ ایسے عام انداز سے ایک دُوسرے پر برسے کہ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے!

اِس چپقلش کو دیکھ کر "ایم۔اے" کے طالب علم تو اِن دونوں اُدب کے دیو پیکروں کے بارے میں جو رائے قائم کریں گے ــــــ کریں گے ــــــ اسکولوں کے طلباء بھی شاید دانتوں میں اُنگلی دبائیں!

دونوں کے دونوں "پدرم سُلطان بود" سے شروع ہو کر آخر کار راضی نامے یا معافی نامے پر اس طرح چڑھے ہُوئے تیوروں سے اُترے ہیں کہ دونوں کے اُترے ہُوئے چہرے بھی سُوجے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں شاہد صاحب اور جوش صاحب دونوں کا مزاج لڑنے کا ہے ہی نہیں ــــــ دونوں میل ملاپ کے آدمی اور لڑنے لڑانے کے داؤں پیچ سے ناواقف ہو کر جب "فری سٹائل" کُشتی پر اُتر آئیں تو ظاہر ہے ان کا ہر وار ایک دُوسرے کے لیے دورانِ جنگ ہی میں "مُشت بعد از جنگ" معلوم ہو گا ــــــ اور بقول مولوی احتشام الدین حقی ــــــ اس کا استعمال معلوم!

شاہد صاحب نے کہا کہ "مولوی نذیر احمد وہ ہیں جس کی کتابیں پڑھ کر ہم سب نے اُردو زبان سیکھی!" گویا امیر خسرو اور ولی دکنی وغیرہ ہم سے لے کر داغ تک کسی کو اُردو زبان آتی ہی نہ تھی ــــــ اور میر امّن دلّی والے اور مولانا محمد حُسین آزاد نے ڈپٹی نذیر احمد سے پہلے جو زبان لکھی، وہ اُردو نہیں کوئی اور بولی تھی یا اس سے کسی نے استفادہ نہیں کیا ــــــ شاہد صاحب نے تو یہ بات جوش صاحب کی اُس اصلاح کے جواب میں کہی جو جوش صاحب نے ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف میں "ترقّیٔ اُردو بورڈ" کے پردے میں کی، لیکن اِس کا جواب اگر جوش صاحب یہ دیتے کہ اگر ریہڑ، پرگنہ افضل گڑھ، تحصیل نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہو کر ڈپٹی نذیر احمد "ہم سب کو" اُردو زبان سکھا سکتے تھے، تو پھر نواب فقیر محمد خاں بہادر گویا کے پوتے کو بھی اودھ میں پیدا ہو کر اُن کی زبان میں اصلاح کرنے کا حق پہنچتا ہے ــــــ تو

بھی کوئی بات ہوتی ـــــ حالانکہ یہ بھی زیادہ وزنی بات نہ سمجھی جاتی، کیونکہ ڈپٹی نذیر احمد کا مقام اُردو ادب میں یہ ہے کہ اُنھوں نے ایک طرح سے اُردو ناول نگاری کی پہلی مرتبہ شعوری کوشش کی اور جو کچھ لکھّا وہ اُردو کا کلاسیکی ادب سمجھا جانے لگا۔ جوشؔ صاحب کے دادا کا شاہد صاحب کے جدِّ بزرگ کی طرح یہ مقام اُردو ادب میں نہیں، لیکن جوش صاحب نے شاہد صاحب کی اس بات کا جواب یہ دیا کہ "میں اودھ کے ایک نہایت مُقتدر تعلقہ دار خاندان کا فرد ہوں ـــــ میرے خاندان کی خودداری، شجاعت، دولت، حکُومت اور سخاوت کا تذکرہ اودھ کی تاریخوں میں پھیلا، بکھرا اور ستاروں کی مانند چھٹکا ہُوا ہے۔ جس کا جی چاہے میرے جدِّ بزرگ حسامُ الدّولہ تہوّر جنگ نواب فقیر محمد خاں بہادر گویاؔ گورنر خیر آباد، سپہ سالارِ سلطنت اودھ کے حالات مطالعہ کرلے ـــــ!"

شاہد صاحب کے اِس دعوے کے جواب میں کہ "مولوی نذیر احمد وہ ہیں جس کی کتابیں پڑھ کر ہم سب نے اُردو زبان سیکھی!" جوشؔ صاحب کا یہ "جواب دعویٰ" کہ میرے جدِّ بزرگ حسام الدولہ تہوّر جنگ نواب فقیر محمد خاں بہادر گویاؔ ـــــ گورنر خیر آباد، سپہ سالارِ سلطنت اودھ ـــــ ہونے کی وجہ سے گویا، خاں بہادر، شمس العلما ڈاکٹر حافظ مولانا مولوی نذیر احمد ایل۔ ایل۔ ڈی ـــــ ڈی۔ او۔ ایل سے بھی بڑے آدمی تھے اور اس لیے جوشؔ صاحب شاہد صاحب کے جدِّ بزرگ کی تصانیف میں اصلاح کرنے میں حق بجانب ہیں، کچھ "جاٹ رہے جاٹ ترے سَر پہ کھاٹ" کے جواب میں "تیلی رے تیلی ترے سَر پہ کولھو" قسم کی اَن مل بے جوڑ کہاوت سمجھی جائے گی کہ صاحب تیلی کا قافیہ کولھو سے ملے یا نہ ملے، تیلی بوجھوں تو مرے گا ـــــ پھر دونوں کی نبرد آزمائی اگر شروع سے آخر تک اسی طنطنے سے چلتی تو

کچھ فردوسی کی نظم ہی کا سا لُطف اُردو نثر میں پیدا ہوتا اور ذرا رُستم و سُہراب ہی کی یاد تازہ ہوتی، لیکن چونکہ شاہد صاحب اور جوش صاحب دونوں پُر امن شہری ہیں، اس لیے دونوں جنگ کے آداب سے کام نہیں لے سکے اور شاہد صاحب "سُنا ہے" کی آڑ لے کر اور جوش صاحب "احباب نے ضد کی" کا جامہ پہن کر بغیر لڑائی پر کمر باندھے شاید نادانستگی میں کہیں تو اُن لڑاکا بڑھیوں سے ملتا جلتا لہجہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں، جو ایک دُوسرے کو پُوری طرح جانے بنا اپنی جوڑی دار کی سات سات پشتوں کو دُھن کر یا پُن کر رکھ دیتی ہیں اور جس کے لیے جو مُنہ میں آتا ہے سُنا ڈالتی ہیں —— اور کہیں اُن سمندری اور جیوٹ قزاقوں کی سی روش اختیار کرتے نظر آتے ہیں، جو دُشمن تک کی خُوبیوں کی قدر کرتے ہیں اور مدِ مقابل تک کی جواں مردیوں کا لوہا مانتے ہیں ——

اُردو ادب میں ایسی "فری سٹائل" یا "بے سٹائل" کشتیاں پہلوانانِ ادب کی قوتوں کا صرف بے جا ہیں اور ایسی بے مصرف کہ نہ لڑنے والوں کے اپنے ہی دلوں کی پُوری طرح بھڑاس نکلتی ہے اور نہ اِن کُشتیوں سے "احباب نے ضد کی" والے احباب، اور جس میں "سُنا ہے" کی چُٹکی ڈلوانے والی "بی جمالو" قسم کی مخلوق کے کچھ ہاتھ آتا ہے —— ایسی ہر بی جمالو سے جمالِ شاہد کو اور ایسے احباب کی ضد سے کمالِ جوش کو بچانے کا بس وہی غالب والا نسخہ تھا کہ ؎

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی   نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہے —— یہ اصول اگر تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی یہ بات تو شاید کم ہی لوگ مان سکیں گے کہ جن دو فریقوں کے درمیان محبت یا جنگ ہو وہ آپس میں محبت یا جنگ کرنے کی بجائے فریقین کے دُور پرے کے رشتہ داروں یا قریبی عزیزوں تک کو اپنی محبت یا نفرت

کی لپیٹ یا جھپٹ میں لے لیں ——— یہاں تک بھی چلیے برداشت کر لیا جائے، کیونکہ کان پیارے تو بالیاں، اور بیوی پیاری تو سالیاں ——— ! اور سگِ لیلیٰ کو سگی بیوی پر فوقیت بعض حضرات دیتے ہیں اور دُشمن کی پرچھائیں تک سے جلتے ہیں، لیکن جو لوگ فریقین سے یا اُن کی مُحبّت اور نفرت سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں، اُنہیں خواہ مخواہ اُن کے گھروں یا اُن کی قبروں سے نکال کر زندہ دفنانے یا گڑھے مُردے اُکھیڑنے کی کوشش کیسے بھلا بھلی، معلوم ہو گی ———

اصل میں خاکہ بنانے یا خاکہ کھینچنے اور خاکہ اُڑانے میں جو فرق ہے، اُسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگوں میں بھی کم ہی محسوس کیا جاتا ہے ——— عموماً دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ یار لوگ کسی کا خاکہ کھینچنے بیٹھتے ہیں، لیکن اکثر خاکہ اڑا کر اُٹھتے ہیں۔ جناب شاہد احمد دہلوی اور حضرتِ جوش ملیح آبادی "افکار" کے مذکورہ جوش نمبر کے دوسرے ایڈیشن میں اپنے اپنے خاکے ——— "جوش ملیح آبادی دیدہ شنیدہ" اور "ضربِ شاہد بہ فرقِ شاہد باز" میں اسی افتاد میں مُبتلا نظر آتے ہیں۔ شاہد صاحب کا جوؔش صاحب پر مضمون اور جوؔش صاحب کا اس مضمون کے جواب میں "جواب مضمون" اگر اسی "مضمون" اور "جواب مضمون" تک رہتا، تو بہت سے لوگ از خود یہ سمجھ لیتے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ ——— وغیرہ، اور جہاں دو برتن ہوتے ہیں آپس میں بجتے ہی ہیں اور یہ کہ پکّے گانے کے شوق نے شاہد صاحب کو بعض معاملات میں کانوں کا کچّا کر دیا تھا۔ وغیرہ۔ اور توقّعات رکھتے کہ بڑا مزا اُس مِلاپ میں ہے کہ صُلح ہو جائے جنگ ہو کر ——— ! اور صُلح کے آثار اس لڑائی ہی میں نظر بھی آنے لگے تھے ——— لیکن ہُوا یوں کہ جوؔش صاحب کے احباب نے ضِد کی" اور شاہد صاحب "سُنا ہے" کی سُنی سنائی باتوں سے کچھ ایسے مجبور ہُوئے کہ بات حد

سے بڑھ گئی ـــــ اور شاہد صاحب نے جوشؔ صاحب کی ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف کی اصلاح میں جوشؔ صاحب پر جو مضمون لکھا اور اُس کے جواب میں جوشؔ صاحب نے شاہد صاحب پر جیسا مضمون لکھا اُس کے بعد جب جوشؔ صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ شاہد صاحب نے "ساقی" کا بھی "افکار" کے جوشؔ نمبر کی طرح کا ایک موٹا تازہ جوشؔ صاحب کے خلاف نمبر نکالنے کا مواد جمع کرنے کے لیے برِّصغیر پاک و ہند کے طول و عرض کا سفر شروع کر دیا ہے تو جوشؔ صاحب اِس غصّے کو پی نہ سکے۔ کیونکہ اس میں انہیں اپنی یوں سُبکی محسوس ہُوئی کہ کہیں لوگ یہ نہ خیال کریں کہ ؏

سُن کر جو پی گئے یہ مزا مُفلسی کا تھا ـــــ!

بھلا اودھ کے ایک نہایت مقتدر تعلقہ دار خاندان کے فرد، جن کے "خاندان کی خودداری، شجاعت، دولت، حکومت اور سخاوت کا تذکرہ اودھ کی تاریخوں میں پھیلا، بکھرا اور ستاروں کی مانند چھٹکا ہُوا ہے" حسام الدولہ تہوّر جنگ نواب فقیر محمد خاں گویاؔ، گورنر خیر آباد، سپہ سالار سلطنت اودھ" کے پوتے اور خود "رئیس ملیح" ہو کر (جوشؔ صاحب نے اپنے لیے خود اپنے مضمون میں بوجوہ یہ لکھا ہے کہ "مجھ کو ایک بڑی جائداد وراثت میں ملی تھی اور میں بھی" رئیس ملیح آباد" کہا جاتا تھا) "سُن کر جو پی گئے" کا گمان اپنے اُوپر کیوں گزرنے دیتے کہ اس سے اُن کے مُفلس گردانے جانے کا خدشہ لاحق ہوتا اور پھر وہ بھی ـــــ "ٹٹ پونجیے خاندانوں یا سُود خوار مُلّاؤں یا غاصب حاکموں کے بیٹھو علمائے کرام کے گھر میں جنم لینے اور وہیں تربیت پانے والے ـــــ کے مقابلے میں ـــــ یہ سارے کلماتِ خبیثہ جوشؔ صاحب نے اُن شاہد صاحب کے لیے اَپنے دہنِ مُبارک سے نکالے جن شاہد صاحب کے لیے آخر میں خود ہی اپنے اِسی مضمون میں فرماتے ہیں کہ ـــــ

"شاہد میاں آپ، ایک خاندانی اور شریف انسان ہیں — آپ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک شریف انسان ہمیشہ عیب پوش ہوتا ہے نہ کہ عیب فروش —"
اور یہ بھی جوشؔ صاحب ہی نے شاہد صاحب ہی کے لیے لکھا ہے کہ — "آپ مُلک کے مقتدر عالمِ مولوی نذیر احمد کے پوتے اور اُس دہلئ عظیم کے باشندے ہیں جس نے لکھنؤ سمیت تمام ہندوستان کو زبان، ادب، علم، وضعداری، تہذیب اور شرافت کا صدیوں درس دیا تھا —"

جوشؔ صاحب "دروغ گو" نہیں، لیکن "حافظہ نہ باشد" کی کم سے کم اپنے مضمون "ضربِ شاہد بہ فرقِ شاہد باز" میں تو وہ مثالیں اُنھوں نے قائم کی ہیں جس کی نظیر شاید ہی کہیں کسی اتنے بڑے آدمی کی ہاں ملے — مثلاً شاہد صاحب کے لیے اسی مضمون میں جوشؔ صاحب نے شروع میں لکھا ہے کہ — "صرف شاہد صاحب ہی نہیں تمام اُدبی دُنیا اِس سے واقف ہے کہ شاہد صاحب میرے دوستوں اور میرے ہم نشینوں کے زُمرے میں کبھی رہے ہی نہیں — اور میرے اُن کے مابین صرف ایک بار کے علاوہ ہمیشہ اس قدر طویل فاصلے رہے ہیں کہ مجھے اُن کا شہری ہی نہیں، ہم صُوبہ رہنے کا بھی فخر کبھی حاصل نہیں رہا" — کاش جوشؔ صاحب اس عبارت کے بعد اپنا ہی یہ مصرع رقم فرما دیتے کہ ع نسیاں مجھے لُوٹ رہا ہے یارو —!
غنیمت ہے یہ کہنا بھول گئے کہ مَیں کبھی اس ملک میں بھی نہیں رہا جس میں شاہد صاحب رہتے تھے — اب جوشؔ صاحب سے یہ کون پُوچھے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے اُن کا ماہنامہ "کلیم" اگر دلّی سے نہیں نکلتا تھا، تو کیا کوہِ طُور سے اِس کلیم کا اجرا ہُوا تھا، اور بعد میں ماہنامہ "آجکل" کی اِدارت اور آل انڈیا ریڈیو کی مشاورت کے فرائض اگر آپ دِلّی میں انجام نہیں دیتے تھے تو کہاں آخر اِن فرائض کی انجام دہی فرماتے تھے۔

اور کیا کراچی میں جوشؔ صاحب اور شاہد صاحب کا ساتھ ساتھ رہنا جوشؔ صاحب کے اس بیان کی تصدیق کر سکتا ہے کہ وہ شاہد صاحب کے ہم شہری تو کیا کبھی ہم صُوبہ بھی نہیں رہے اسی لیے شاہد صاحب کہا کرتے تھے کہ "نثر کہنی" نظم لکھنے سے زیادہ مشکل ہے ——— اس مضمون میں جہاں جوشؔ صاحب نے اُس صوبے تک میں نہ رہنے کا دعوہ کیا ہے جس میں شاہد صاحب کبھی رہے ہوں، وہیں انہی شاہد صاحب سے اتنی قربت بلکہ قرابت تک ظاہر کی ہے جس سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ شاہد صاحب کے دُودھ شریک بھائی ہوتے ہوتے رہ گئے ہوں۔ ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ایسی صُورت میں کہ شاہد صاحب نے اپنے مضمون "جوشؔ ملیح آبادی دیدہ و شنیدہ" میں خود لکھ دیا تھا کہ ——— "ویسے بھی میں شعر و شاعری کا آدمی نہیں اور نہ جوشؔ کا ہم مشرب ———" نہ تو شاہد صاحب ہی پر واجب تھا کہ وہ جوشؔ صاحب پر مضمون لکھنا اپنا فرض گردانتے اور نہ جوشؔ صاحب کو اپنے "جواب مضمون" "ضربِ شاہد بہ فرقِ شاہد باز" میں یہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ شاہد صاحب کے "ہم شہری" تو کیا "ہم صُوبہ" تک کبھی نہیں رہے ——— یہ تو وہی بات ہوئی کہ ؎

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے

پسینہ پُونچھیے اپنی جبیں سے

شاہد صاحب کے بارے میں جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ والدین کا سایہ اوائلِ عمری میں سر سے اُٹھ جانے اور سگے سوتیلوں کے قضیوں سے بچنے کے لیے وہ کچی عمر

سے پُختہ کار ہونے تک زیادہ تر مردانے ہی میں اپنے وقت کا بیشتر حصّہ گزارتے تھے۔ اور اُنھوں نے اپنا سونا اُٹھنا، بیٹھنا کھانا پینا سب مردانے ہی میں کر لیا تھا، جہاں اُن کا زیادہ وقت نوکروں کی صحبت میں گزرتا، اور اسی لیے اُن میں بہت سے وہ خصائل بھی پیدا ہو گئے جو بڑے گھروں کے نوکروں میں ہوتے ہیں۔ مثلاً: ہر بااثر آدمی کی مدح سرائی اور بے حیثیت لوگوں کی ہرزہ سرائی —— بڑے آدمیوں کو آتا دیکھ کر ٹوپیاں اُڑھنا اور بیڑیاں بُجھانا —— افسروں کا احترام اور برابر والوں کے ساتھ بے لگام —— مُنہ پہ تعریفوں کے پُل اور پیٹھ پیچھے ہر ایک کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر بُرائیاں نکالنا وغیرہ۔ اِن میں سے کہنے والے کہتے ہیں کہ بعض خامیاں شاہد صاحب میں بھی آگئی تھیں۔ مثلاً: بیڑیاں پینا، پوسٹ کارڈ لکھنا اور بااثر اور صاحبِ ثروت لوگوں سے کسی حد تک مرعوب رہنا وغیرہ —— چلیے، شاہد صاحب کو تو سمجھ لیجیے کہ اُنھوں نے نوکروں کی صحبت میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے اپنا حُلیہ بھی زیادہ تر "دلی" کے شرفا کی جگہ "دلی" کے "کرخنداروں" (کارخانے داروں) کا سا بنائے رکھا اور جوشؔ صاحب کو اپنے مضمون میں اُنھوں نے بے نقط، کھوٹی کھری ہر طرح کی سُنائیں اور ساقی کا "جوش نمبر" بھی وہ ہر شر مخالف کے سمجھانے کے باوجود بعد میں نکال کر رہے، لیکن آخر جوشؔ صاحب نے "ضربِ شاہد بہ فرقِ شاہد باز" جیسا مضمون کیوں لکھا جو اُن کو شاہد صاحب کی ہر طرح کی کڑوی کسیلی آخر کار سہنی پڑی —— خود ہی جوشؔ صاحب کہتے ہیں کہ ؎

اے نازکیٔ طبع کی رو کے ہوئے باگ\
شبّیر حسن خاں یہ زمانہ ہے کچھ اور

اور خود ہی اس پر عمل نہیں کرتے —— اور نتیجہ یہ بُھگتے بیٹھے ہیں کہ

۵ نہ خدا ہی مِلا، نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

وہی شاہد صاحب جو میرے بچّے کی "کتاب" پر، جو اُس نے باقاعدہ لکھنا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے لکھنی شروع کی تھی اور جس میں کچھ اِس طرح کا لفظوں کا گورکھ دھندا تھا جیسے —— ہوا + شاہ = بادشاہ —— حواس + دوست = ہوشیار —— بُو + چائے = بالٹی —— دولت + ی = مالی —— ہوا + ل = بادل —— جُرمانہ + الف = ڈنڈا —— صا + جنگل = صابن —— آنکھ + ک = عینک —— پیلا + ہ = زردہ —— عورت + پہلوان = ناریل —— پَر + الف = پنکھا —— جنگل + دروازہ = بندر —— پ + چھوٹا = پتنگ —— دی + حملہ = دیوار —— موٹر + ٹون = کارٹون —— بی + پٹائی = بیمار —— آواز + فت = صداقت —— ستون + با = کھمبا —— پانی + نثار = آبشار —— بھگوان + سٹوری = رام کہانی —— وغیرہ، تو وہ لفظوں کی اِس "جمناسٹک" پر خاصے چیں بہ جبیں ہُوئے تھے اور راقم الحروف سے کہا تھا کہ میاں، اگر ابھی سے بچّے کی زبان کی صحّت کا خیال نہیں رکھو گے، تو پھر یہ تمہارا بچّہ بڑا ہو کر خوب، باپ دادا کا نام روشن کرے گا، اور وہ زبان بولے گا اور لکھے گا جو چُوں چُوں کا مُربّہ ہو گی اور ساری زبانوں اور بولیوں کا مُرکّب! وہی مثل ہو گی کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا، بھان متی نے کُنبہ جوڑا —— ! لاحول ولاقوۃ! ایک تو تمہاری بیوی، میاں نظیر اکبر آبادی کے خاندان سے، اُس پر طُرّہ یہ کہ تم نے ابھی سے زبان کے مُعاملے میں بچّے کے لیے ڈھیلی ڈوری چھوڑ دی۔ وہ تو یہ کہو کہ ابوالخیر صاحب کی والدہ محترمہ کی گود میں اِس بچّے کی پرورش ہو رہی ہے، ورنہ زبان کے معاملے میں پتہ نہیں اِس بچّے کا کیا لکھّا پُورا ہوتا —— ابُوالخیر صاحب کی والدہ محترمہ،

اے۔آر۔خاتون اور قیصری بیگم وغیرہ یہ گنتی کی خواتین اب رہ گئی ہیں کہ جب بات کرتی ہیں تو مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔اِن خواتین کے بعد کتابی اُردو رہ جائے گی اَور بولنے کی زبان ختم ——— ! اور کہا کہ یہ اَبُوالخیر صاحب کی والدہ محترمہ کا دم قدم ہے اور مولوی عبدالسّلام صاحب کی تعلیم و تربیت کا اثر کہ آج ابوالاعلیٰ صاحب اور ابوالخیر صاحب مذہب اور اَدب میں اَپنا جواب نہیں رکھتے ورنہ اِن کے والد میرٹھ کے وکیل تھے اور اُن کی وکالت حیدر آباد دکن جاکر چمکی۔اس لیے یہ لوگ زیادہ تر دکن ہی میں رہے، لیکن اِن سب باتوں کے باوجود دیکھو کہ نہ اَبُوالخیر صاحب کی زبان پر اور نہ ابوالاعلیٰ صاحب کی زبان پر دَکنی بولی کا کوئی اثر ہے، نہ میرٹھ کے پانی کا ——— وہی حکیم اجمل خاں صاحب کے گھرانے کی ٹکسالی شریف خانی زبان ہے جو اِن کی والدہ بولتی ہیں ——— اور جب ۔۔۔ کے مصنف محمد خلیل الرحمٰن نے شاہد صاحب سے کہا کہ مَیں تو گھنٹوں ... پردہ رہ کر ابوالخیر صاحب کی والدہ محترمہ کی باتیں اس لیے سُنتا ہوں کہ یہ" عینی میاں " کو ساری کہاوتوں کا پس منظر بتاتی رہتی ہیں اور امیر خسرو کے غیر مطبوعہ دوسُخنے، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں اور دوہے سناتی ہیں ——— تو شاہد صاحب نے خلیل صاحب سے کہا تھا کہ آپ تو خیر اِن باتوں سے استفادہ کرلیں گے، لیکن ایک تو اِن حضرت نے (یعنی اس خاکسار نے) اپنے بچے کا نام لڑکیوں کا سا رکھ دیا ہے ——— راحت العین اور پیار کا نام "عینی" دُوسرے ابھی سے اسے کتابیں پڑھانے کی بجائے کتاب لکھنے پر چھوڑ دیا ہے۔ہم نے اور آپ نے کتابیں لکھ کر کیا حاصل کیا جو یہ اس چاٹ میں ابھی سے پڑ کر کچھ پالے گا اور جب خلیل صاحب نے کہا کہ لڑکیوں کا نام تو اقبال، شاہجہان اور عصمت بھی ہوتا ہے — اور "عینی شاہد" وغیرہ کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ تو شاہد صاحب ساری باتیں بھول

کر اس بات پر آ گئے کہ ڈر یہ ہے کہ اگر یہ بچّہ مادری زبان بولنے لگا یعنی آگرہ اُنگ کی اُردو، تو پھر یہ عصمت چغتائی کی طرح غلط زبان بڑا ہو کر لکھے گا۔

وہ شاہد صاحب جو زبان کے معاملے میں اتنے وہمی، محتاط اور بال کی کھال نکالنے والے تھے جب جوش صاحب سے لڑنے پر آئے تو کچھ ؎

زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا ! کی تفسیر بن گئے ——————

یعنی بھائی شاہد جیسا صاحب طرز نثر نگار جب اِس نوع کی عبارت لکھتا نظر آئے کہ زبان کی کوئی خوبی تو رہی ایک طرف، عبارت میں تسلسل، ربط اور معنویت تک مفقود ہو جائے، تو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شاہد صاحب ہیں جنہوں نے میرے بچّے کی "کتاب" کے سلسلے میں اِس بات پر بھی ناک بھوں چڑھائی تھی کہ سیّد سبط حسن صاحب نے اس بچے کی ہمّت افزائی کے لیے کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ جب یہ کتاب مکمّل ہو جائے گی تو ہم اِسے چھپوانے کا انتظام کر دیں گے، اور اے۔ حمید صاحب اِس کتاب پر پیش لفظ لکھنے کا ارادہ ظاہر کر رہے تھے۔

لکھتے ہیں اَپنے مضمون "جوش ملیح آبادی دیدہ و شنیدہ" میں — "جوش صاحب کو یہ مغالطہ تھا کہ جتنی اچھی وہ نظم لکھتے ہیں اُتنی ہی اچھی وہ نثر بھی لکھتے ہیں ——"

اِس فقرے کے پڑھنے کے بعد توقّع یہ بندھتی ہے کہ شاہد صاحب، جوش صاحب کی نثر کے ڈھیلے پن کی کوئی مثال دے کر کوئی فقرہ کسیں گے، لیکن شاہد صاحب، کا یہ فقرہ مذکورہ مضمون میں یوں مُکمّل ہوتا ہے کہ —— " ایک نیا مضمون نگار اسرائیل احمد خاں اُنہوں نے خدا جانے کہاں سے نکالا تھا — وہ اینڈے بینڈے مضامین لکھا کرتا تھا —————— یہ فقرہ یوں مکمّل ہوتا یا آگے چلتا دیکھ کر قاری کو گمان ہوتا ہے کہ اب اسرائیل احمد خاں ہی پر شاہد صاحب کا کوئی فقرہ اُترے گا (اسرائیل احمد

خان صاحب جوشؔ صاحب کے بہت ہی عزیز بھائی اور بھائی سے زیادہ دوست ہیں اور یہ بات شاہد صاحب کو معلوم تھی، لیکن آگے لکھا ہے ـــــ "یہ زمانہ تھا ہمایوں، ادبی دُنیا، نیرنگِ خیال، عالمگیر اور ساقی کے شباب کا ـــــ اب خیال گزرتا ہے کہ "کلیم" کا اِن رسالوں سے بقول حضرتِ الیاس عشقیؔ "موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ" کیا جائے گا لیکن لکھا ہے کہ ـــــ جوشؔ صاحب نے محسوس کرلیا تھا کہ پبلک بڑی ناقدر شناس ہے وہ نسل کبھی مستقبل بعید میں پیدا ہوگی، جو ان کے رسالے کی صحیح قدردانی کرسکے گی ـــــ !" چلیے چھٹّی ہُوئی ـــــ نہ جوشؔ صاحب کی نثر ہی معرضِ بحث میں آئی، نہ اسرائیل احمد خاں صاحب ہی کا ذکر آگے چل سکا اور نہ "کلیم" کے "CLAIM" پر کوئی تنقید ہوئی ـــــ کیونکہ رسالہ ہی بند ہوگیا" یعنی گھوڑا ہی ختم ـــــ "مارو گھٹنا، پھُوٹے آنکھ ـــــ نہ کھیت ہی کا پُوری طرح ذکر، نہ کھلیان ہی کا جم کر بکھان ـــــ !"
اِس مضمون کی شاہد صاحب کی زیادہ تر نثر بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی ـــــ "نظم کی ساری خامیوں سے داغ دار ہے۔" اور دلّی کے اُن دھوبیوں کی "بانیوں" سے مِلتی جُلتی معلوم ہوتی ہے جو مذہبی جلوسوں کے بارے میں اپنے طور پر کوئی "بانی" ایسی لکھتے تھے جو نہ پوری طرح نظم ہوتی تھی اور نہ نثر مثلاً "قاضی کے حوض پہ چلی چھُری۔ آگے دیکھو فتح پوری ـــــ فتح پوری پہ بھیڑ بہت۔ آگے دیکھو قاضی کا حوض۔ قاضی کے حوض پہ اُٹھا دھڑاں۔ آگے دیکھو لال کنواں ـــــ !وغیرہ (یہ دلّی کے اُن بازاروں کے نام ہیں جہاں جہاں سے یہ جلوس نکلا کرتے تھے) اور اس نثر نما نظم یا نظم نما نثر کو اِن دھوبیوں کی زبان میں "بانی" کہتے ہیں۔

اور پھر رابندر ناتھ ٹیگور (روندر ناتھ ٹھاکر) مولانا نیاز فتحپوری، حکیم آزاد انصاری جس کا بھی خیال جوشؔ صاحب پر مضمون لکھتے وقت شاہد صاحب کو آگیا۔ اُس کے ساتھ

"بازی، بازی، باریش باباہم بازی کا کھیل، کھیل ڈالا۔ اور جوش صاحب کی طرح شاہد صاحب نے اِن حضرات کو بھی "بے ریش" کر کے چھوڑا!

تعجب ہے کہ شاہد صاحب اور جوش صاحب دونوں کا مزاج یہ ہے کہ۔ لڑتے ہو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے یہ ——!" تو خود اِن کا خون پانی ہونے لگتا ہے۔ اور سارے جہاں کا درد اس طرح اِن کے جگر میں رہتا ہے کہ دُنیا جہاں کے جھگڑے ختم کرانے میں یہ دونوں خود اپنا خون پسینہ ایک کر دینے اور خود اپنے آپ ہی کو ختم کر لینے تک میں دریغ نہیں کرتے۔ کہاں کہ یہ خود آپس میں یوں دست و گریباں ہو جائیں کہ اِن دونوں عظیم سیّاروں کے ٹکّر میں آسمانِ اَدب کے ایسے ایسے ستارے بظاہر ماند پڑتے نظر آئیں جن کی تابناکیوں نے اندھیری پگڈنڈیوں کو اپنے اپنے دَور میں کہکشاں بنائے رکھا اور آسمانِ ادب یوں گرد باد ہو جائے کہ زمین پر سانس لینا ادب کے پرستاروں کا دُشوار ہوتا نظر آئے۔ اور شاعر اور ادیب تو رہے اپنی جگہ اِن خالقانِ ادب سے زیادہ بندگانِ اَدب تک کے چہرے گرد سے اَٹ جائیں اور دل غبار آلود ہو جائیں اور کچھ ایسی" تھرل نیو کلر"، "ریڈیو ایکٹو اور "نابکار" یا نابکار نوعیت کی گرد اُڑے کہ پہچانی ہُوئی صُورت بھی انجانی معلوم ہو —— عرش کے کنگورے ہلنے لگیں۔ اور قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل!

شاہد صاحب نے جوش صاحب کو اور جوش صاحب نے شاہد صاحب کو نیچا دکھانے کے لیے نہ صرف یہ کہ آپس میں بے ضرورت "ڈوال" کھیلا بلکہ آس پاس جو نظر آیا، چاہے اُس کا تعلق اِس جھگڑے سے تھا یا نہیں تھا اُسے بھی بزعمِ خود دونوں نے وہ دھوبی پاٹ دے کے مارا کہ دھوئے دھوئے یہ داغ دونوں میں سے ایک کے دامن سے بھی نہ چھوٹیں۔ مثلاً، جوش صاحب نے دارالترجمہ حیدر آباد دکن کے ناظم

اعلیٰ مولوی عنایت اللہ صاحب، جو اگر دار الترجمہ حیدر آباد دکن کے ناظم نہ ہوتے تب بھی انگریزی سے اُردو میں کسی لفظ کا لفظی ترجمہ چھوڑے بغیر اُردو ترجمہ کرنے والوں کے بادا آدم سمجھے جاتے اور بقول جوشؔ صاحب "آدم تا ایں دم"۔ اس ضمن میں کوئی اُن کا حریف نہیں۔ اُن مولوی عنایت اللہ صاحب کے بارے شاہد صاحب کو نیچا دکھانے کے جوش میں، جوشؔ صاحب لکھتے ہیں کہ "میرے زمانے میں ایک عنایت اللہ صاحب ناظمِ دار الترجمہ تھے۔ جن کے نام سے بھی لوگ ناواقف ہیں"۔ مولوی عنایت اللہ صاحب کے بارے میں تو جوشؔ صاحب کا یہ فرمان ہے اور خود اپنے سلسلے میں "غالب نام آدرم" کا وہ نعرہ ہے کہ —— "افکار کا یہ نمبر میرے باب میں ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جو آئندہ نسلوں کی ہمہ وجوہ رہنمائی کر سکے گی۔ اور اس سلسلے میں صہباؔ صاحب کا یہ اقدام اوّلین ادبیاتِ اُردو کی تاریخ میں تاقیامت دائم و قائم رہے گا۔

اَب جوشؔ صاحب سے کیسے کہا جائے کہ حضور جس ملک میں مولوی عنایت اللہ صاحب کے نام سے بھی لوگ ناواقف ہوں اور اب تک پُوچھتے ہوں کہ غالب کون ہے؟ اُس ملک میں آئندہ نسلیں آپ کو کیا یاد رکھیں گی اور صہباؔ صاحب کی مساعی کس حد تک کامیاب ہوں گی —— ؟

کمال ہے وہی جوشؔ صاحب جو فرماتے ہیں کہ ؎

دل بے کسئ اَدب پہ تھرّاتا ہے
مرطوب فضا میں دَم گھُٹا جاتا ہے
قدوسی و رودکی سمجھتا ہُوں اسے
مِصرع بھی مِرا آج جو دُھراتا ہے

خود اُردو کی ایک نامور اور قابلِ قدر شخصیت کو یوں نظر انداز اور قلم زد کر دیں کہ: "میرے زمانے میں ایک عنایت اللہ صاحب ناظمِ دارالترجمہ تھے جن کے نام سے بھی لوگ ناواقف ہیں۔"

جوشؔ صاحب کو یہ تو یاد ہے کہ ۴۷ء سے پہلے ــــ " شراب کی یہ ادقات تھی کہ ایک پُوری بوتل صرف ساڑھے آٹھ رُپلّی میں مِلا کرتی تھی اور ڈھائی ڈھائی، تین تین سو ماہانہ کی آمدنی والے تک ولایتی شراب پیا کرتے تھے"۔ اور یہ یاد نہیں کہ مولوی عنایت اللہ نے اُردو ادب میں کتنا انگریزی ادب کس دیدہ ریزی سے مُنتقل کیا۔ ایسی ہی باتوں سے چڑ کر مجازؔ نے اِن کے لیے کہا ہوگا کہ ؎

سینۂ انقلاب چھلنی ہے۔ شاعرِ انقلاب کیا جانے

اِن شاعرِ انقلاب صاحب کو یہ تک نہیں معلوم کہ "ساڑھے آٹھ روپلّی" یکمشت، اور ڈھائی سو، تین سو روپے ماہانہ کی آمدنی بھی بے شمار لوگوں کی آرزو ہے۔ اِس مہنگ مولے زمانے میں بھی۔

سچ کسی نے کہا ہے کہ جوشؔ صاحب کے سامنے مسئلہ ہمیشہ شراب اور شباب ہی کا رہا، کبھی روٹی کے بارے میں اُنہیں فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی، افلاس اور پریشانی جوشؔ صاحب کی لُغت میں یہ ہے کہ ؎

جب جیب میں ٹھٹھری ہُوئی چاندی ہی نہ ہو
تو جام میں پگھلا ہُوا سونا کیسا !

مُعین احسن جذبیؔ کی طرح وہ یہی بات اِس طرح کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ؎

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے، اُس وقت یہ شبنم موتی ہے

جوش صاحب کو جب پاکستان میں آتے ہی ساڑھے سولہ سو روپے ماہانہ کی مُلازمت مِل گئی، تو اُنھوں نے کہا کہ ساڑھے سولہ سو رُوپلّی مہینے میں تو میری شراب بھی نہیں چلے گی ـــــ باقی اخراجات کہاں سے اور کیسے پُورے ہوں گے ــــ! اِسی لیے اِن "رئیس ملیح آباد" کے لیے شاہد صاحب نے جب اتنا سا مبالغہ کر دیا کہ "جوش صاحب دیسی شراب بھی پی لیتے تھے"، تو اُنھیں اتنا زیادہ غُصّہ آیا شاہد صاحب کے اِس مبالغے پر کہ "اُنھیں یہ بھی نہ رہا یاد" کہ بہت سے لوگ دیسی شراب تو کیا "آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے"۔ ساغر صدیقی جو نہ صرف ساغر نظامی کی ضِد ہیں لباس کے معاملے میں بلکہ جنھوں نے اپنے لاابالی پَن میں میراجی، مجاز، منٹو اور نہال سیوہاروی کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ دیا ہے اور جن کا حال میر تقی میر کے زمانے کے اُن شاعر کا سا ہمارے آپ کے زمانے میں ہے جن کے لیے میر صاحب نے تذکرۂ شعرا میں لکھا ہے کہ: "عُریانی را جامہ می کرد، د، دَرہمہ عُریانی جامہ یافت۔ میر نے اپنے دَور کے ایسے شاعر کا بڑی محبّت سے ذکر کیا ہے، لیکن جوش صاحب شاید ساغر صدیقی صاحب کو جاننے سے بھی انکار کر دیں، کیونکہ وہ نہ ولایتی شراب پیتے ہیں جوش صاحب کی طرح اور نہ ایسا تکلف کا لباس، جیسا زندگی بھر شوکت تھانوی اور سمیع آرٹسٹ پہنتے رہے، اور شعر جب کہتے ہیں تو ایسا کہ ؎

مجھے وطن کے غریبوں کو ڈھانپنے کے لیے
قبائے خواجۂ اقلیم کی ضرورت ہے

شاہد صاحب اور جوش صاحب کا جھگڑا زیادہ تر ہوا ہی اس بات پر کہ شاہد صاحب نے جوش صاحب کے لیے یہ لکھ دیا کہ یہ حضرت ایک تو ریاض خیرآبادی "غریب" کی طرح ؎

اچھی پی لی، خراب پی لی۔ جیسی پائی شراب پی لی۔ کے قائل ہیں۔ دُوسرے بلانوش ہیں۔ لکھا ہے: "جوش صاحب بلانوش تھے جو بھی مل جائے چڑھا جاتے تھے۔" اِس پر جوشؔ صاحب برافروختہ ہو گئے۔ ایک تو "جو بھی" پر اور دُوسرے یہ کہ شاہد صاحب نے ایک ایسے شرابی کو بلانوش کہا جو چوتھے سے پانچوں "پیگ" چھونا حرام سمجھتے ہیں؛ چنانچہ جوش صاحب کو اپنی صفائی میں لکھنا پڑا کہ شاہد صاحب "خیر سے فرماتے ہیں میں گھڑی سامنے رکھ کر پانچ چھ پیگ پیتا ہوں ہر چند یہ جو میرے" پانچ چھ پیگ" لکھے گئے ہیں وہ شاہد میاں کی غلط شماری یا مبالغے کا نتیجہ ہیں، اِس لیے کہ میں عمر کی ہر منزل میں بڑی سختی کے ساتھ معتدل نوش، یعنی "چہار جامی" رہا ہوں۔"

شاہد صاحب اور جوشؔ صاحب دونوں کے نزدیک ایک طرح سے شراب قابلِ اعتراض ہوتی ہے پانچویں اور چھٹے "پیگ" سے اگر کہیں خدانخواستہ دیسی شراب ہو تو پہلا ہی پیگ اِن دونوں بزرگوں کے نزدیک حرام ——— شراب کی اتنی تعریف تو ساقی کے مُدیر نے بھی کی کہ "شاید ہر شرابی کا دِل مُنافقت سے خالی ہو جایا کرتا ہے۔" اسی لیے پانچویں یا چھٹے پیگ تک اگر نوبت نہ پہنچے اور "دیسی" نہ ہو تو اِن دونوں بزرگانِ ادب کے لیے جائز، ورنہ حرام۔ گویا "یہ دل جو پُرانا زاہد تھا برسوں میں شرابی بن سکا۔" دونوں کے پیٹ میں وہ ڈاڑھیاں اُتری ہُوئی معلوم ہوتی ہیں جو ان سے مے نوشی اور اُن سے موسیقی دانی بھی کراتی ہیں تو اُسی باقاعدگی اور خشوع وخضوع سے جس کی ضرورت عبادت میں ہوتی ہے؛ چنانچہ جوشؔ صاحب شراب کے وقت شراب اور شاہد صاحب گانے کے ریاض کے وقت گانے کی ریاضت ناممکن ہے جو کبھی قضا کر جائیں۔ نمازی کی نماز قضا ہو جائے، لیکن چاہے آندھی جائے

مجال ہے جواِن کی شراب اور اُن کی موسیقی کی ریاضت کا وقت ٹل جائے بس شرط یہ ہے کہ شراب "ولایتی" ہو اور موسیقی "دیسی"۔ دونوں وقت ملتے یہ دونوں یعنی شاہد صاحب طلوع آفتاب کے وقت اور جوش صاحب غروب آفتاب پر کبھی ریاضت موسیقی اور مے نوشی سے باز نہ آئے۔ اور ایک آخر کار اس ریاضت کے باعث فن موسیقی کے اُستاد اور دوسرے "مینائی شریعت کے اِمام" گردانے جانے لگے۔ لیکن جس طرح امیر خسرو کے علاوہ باقی زیادہ تر مُسلمان موسیقاروں نے اپنا نام ادا رنگ "سدا رنگ"، "رنگیلے پیا" اور اب سید ذوالفقار علی بُخاری صاحب نے "خوش رنگ" کے نام سے "راگ دریا" نامی موسیقی پر کتاب لکھ کر اپنا اصل نام چھپایا اُسی طرح شاہد صاحب بھی اُستاد ایس۔ احمد کے نام سے گاتے رہے اور اصل نام گانے بجانے کے ساتھ وابستہ کرنے میں تکلّف محسوس کرتے رہے۔ اُسی طرح جوش صاحب بھی شراب کو بہت ہی ناپ تول کر اور قاعدے قانون کے مطابق پینے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً گھڑی سامنے رکھ کر پیو۔ مجاز کی طرح گھڑا سامنے رکھ کر نہ پیو۔ چار پیگ سے زیادہ نہ پیو، ولایتی پیو، سورج غروب ہونے کے بعد پیو۔ اس لیے کہتے ہیں کہ ؎

جب مہر میں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

اور فرماتے ہیں کہ غالب والی "یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے"۔ سے بچو۔ غرضیکہ اتنے DO'NTS اور "DO'S" شاہد صاحب کے گانے اور جوش صاحب کے پینے میں ہیں کہ اِس سے یہ دونوں پابند صوم وصلوٰۃ ہی رہتے تو بہتر تھا۔ جب۔ طبیعت اِدھر نہیں آتی تو کس خدا نے کہا تھا کہ شاہد صاحب گائیں اور جوش صاحب شراب پئیں۔ انہی باتوں سے تنگ آکر شہزاد احمد شہزاد صاحب نے

کہا تھا کہ ؎

کُھلی فضا میں اگر پی کے ہم بہک نہ سکیں
تو زہر پینا ہے بہتر شراب پینے سے

اور کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ جو موسیقی دان موسیقی کا ذوق رکھنے کے باوجود اپنا نام اِس فنِ لطیف سے وابستہ کرنے میں حجاب میں محسوس کرتے ہیں، وہ اُن مے نوشوں کی مانند ہیں جو "کم کم خورد، گہہ گہہ خُرد، تنہا می خُر" قسم کی ہدایات پینے والوں کے لیے جاری کرتے پھرتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر شروع ہی میں جوش صاحب، شاہد صاحب کو ایسے دادا کا پوتا "جس کی کتابیں پڑھ کر ہم سب نے اُردو زبان سیکھی" چاہے مانتے یا نہ مانتے عارف عبدالمتین صاحب کی طرح "کلاسیکی موسیقی کے گِنے چُنے ماہرین میں سے ایک" مان لیتے اور شاہد صاحب، جوش صاحب کو "معتدل نوش" اور "ولایتی نوش" تو شاید یہ جھگڑا اتنا نہ بڑھتا۔ اور بات اِن دونوں امیر زادوں کے درمیان "LANGUAGE IMPERIALISM" ہی کے دائرے میں گھومتی۔ اور یہ صورت کبھی نہ پیدا ہوتی کہ جوش صاحب مولوی عنایت اللہ کی تحقیر کریں اور شاہد صاحب ایک مولوی عنایت اللہ کا بدلہ لینے کے لیے "ٹیگور"، مولانا نیاز فتحپوری اور حکیم آزادی انصاری کو کھوند کر رکھ دیں اور شاہد صاحب "ٹیگور" کو "گیتان جل" کے نوبل پرائز ملنے پر نوبل پرائز دینے والوں تک کو جلی کٹی سنانے بیٹھ جائیں۔

شاہد صاحب نے لکھا ہے کہ "ٹیگور" (رویندر ناتھ ٹھاکر) کی مابعد الطبیعاتی شاعری کو یار لوگ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں، جھٹ اُس کے ترجمے پر اُتر آئے، چونکہ ٹیگور کو نوبل پرائز ملا تھا اس لیے یہ سمجھ لیا گیا کہ ضرور اِس میں کوئی بڑے کام کی بات کہی

گئی ہے۔ حالانکہ آج تک یورپ والوں ہی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ملارمی اور ماترلنگ قسم کے شاعر یہ کیا فرما گئے ہیں کہ ؎ ایک دروازہ کھُلا، ایک دروازہ بند ہُوا اور ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ انہیں یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ اس پر کہاں سر دُھنا جائے؟ ٹیگور نے بھی یہی گُر استعمال کیا اور۔ ایٹس۔ نے اُسے جھنڈے پر چڑھا دیا۔ اُردو کی شامتِ اعمال یہ کتاب کہیں سے نیاز فتحپوری کے ہاتھ لگ گئی۔ "عرضِ نغمہ" کے نام سے اُس کا ترجمہ فوراً تیار ہو گیا۔ نام ہی دیکھ لیجیے "عرضِ نغمہ"۔ اِس کے اندر جو گت ٹیگور کے شاہکار کی بنی ہے اُسے کسی وقت فرصت سے دیکھیے گا، تو اس کا جوہر آپ پر کھُل جائے گا۔ ہمارے ادیبوں کے ہاتھ ایک سہل نسخہ لکھنے لکھانے کا آیا۔ لگے سب کے سب عرضِ نغمہ کرنے۔ پیاز کو چھیلیے، پرت ہی پرت اُترتے چلے جائیں گے، مغز آپ کہیں نہیں پائیں گے۔ یہی حال اِس نیازی یا پیازی اَدب کا تھا، جسے "ادبِ لطیف" موسوم کیا گیا جو ہماری نثر کا چرما چاٹی اور "سانڈے کے تیل" کا دَور تھا ——"

شاہد صاحب کی نثر کی روانی یوں "رواں دواں" کبھی ہو گی۔ اور نوش کی جگہ یوں نیش اُن کے قلم سے ٹپکے گا۔ اِس کا کبھی کسی کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اقوامِ مُتحدہ کے جنرل سیکرٹری "اوتھان" کا کہنا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی۔ لیکن مولانا نیاز فتحپوری کے ضمن میں تو تاریخ نے اپنے آپ کو ایسا دہرایا کہ سارا اگلا پچھلا جغرافیہ سامنے آ گیا۔ مولوی احتشام الدین حقّی صاحب دہلوی کے خواجہ حافظ شیرازی کے کلام کے ہم قافیہ اور ہم ردیف ترجمے پر جب نیاز صاحب نے "نگار" میں اپنے عروج کے زمانے میں ایسی ہی سخت تنقید کی جیسی اب اُن پر شاہد صاحب نے کی۔ تو مولوی احتشام الدین حقّی صاحب دہلوی تو اُس وقت آج سے کم و بیش پچیس برس

پہلے یہ کہہ کر چپ ہو گئے تھے کہ "حافظ" کے مترجم کو آپ کی یہ نصیحت کہ "مترجم نے یہ وقت کسی اور کارِ خیر میں صرف کیا ہوتا، تو زیادہ بہتر تھا۔" منتِ بعد از جنگ ہے اور اس کا استعمال معلوم، اور پھر ایں گناہیت کہ در شہرِ شما نیز کنند۔ آپ نے کیا ٹیگور کی "گیتان جلی" کو عرضِ نغمہ میں تبدیل نہیں کیا۔ آپ جیسے "چوٹی" کے ادیبوں کو اتنی بے احتیاطی سے کام نہیں لینا چاہیے۔" وغیرہ۔ اور عنوان مولوی صاحب نے نیاز صاحب کی اس تنقید کے جواب کا رکھا تھا "تنکیل نگار" یعنی محبوب کی ناک کی کیل، لیکن پچیس برس بعد شاہد صاحب نے اِس "تنکیل نگار" کو ایسا اونٹ کی ناک کی نکیل میں تبدیل کیا کہ دشمن بھی جس کو دیکھ کے نمناک ہو گئے۔ مولوی احتشام الدّین حقی صاحب جن کی ساری زندگی ادب اور اردو زبان کی تحقیق میں بسر ہوئی اور جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ اردو کی لغت کی ترتیب و تالیف میں اس طرح صرف کیا کہ اگر وہ لغت اردو میں چھپ جاتی تو دنیا کی کسی زبان کی لغت اتنی جامع نہ سمجھی جاتی۔ اُن مولوی صاحب نے جن نیاز صاحب کو چوٹی کے ادیبوں کے خانے میں رکھا، اُنہیں شاہد صاحب نے ہاتھ کی صفائی یا دیدے کی صفائی سے بیک جنبشِ قلم "چوما چاٹی" کے ادیبوں کے تہہ خانے میں ٹھونس دیا، اور "سانڈے کا تیل" بیچنے والوں میں اُن کا شمار کر کے رکھ دیا۔"

حکیم آزاد انصاری جن کا ثانی اِس اعتبار سے کہ اردو میں اِن سے پہلے کوئی شاعر ایسا ہوا نہ اب تک کوئی ہے۔ جس کی نظم کو نثر میں تبدیل ہی نہ کیا جا سکے۔ ایسے عدیم النظیر نثر میں شعر کہنے والے شاعر کے بارے میں شاہد صاحب جیسے نثر کے آدمی کا یہ کہنا۔ کہ "دِلّی میں اُنہوں نے کئی ٹھکانے بدلے۔ آخر آخر میں ایک مفلس مگر مخلص شاگرد کی ہاں چلے آئے تھے۔ جب اُن کی حالت بگڑی اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، تو وہ غریب شاگرد حیدرآباد اُنہیں لے کر پہنچا، اور اُن کے بیٹے کے گھر نہیں

چھوڑ آیا۔ بٹیا اچھّا خاصا پیسے والا تھا، مگر بہ اکراہ اُس نے باپ کو وصول کیا، بُڈھے میں دھرا ہی کیا تھا۔ دو چار دن بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔"

حکیم آزاد انصاری جیسے جوان فکر شاعر کو اِس بے دردی سے "بڈھا" شاہد صاحب نے صرف اس لیے کہا کہ حکیم آزاد انصاری جوشؔ ملیح آبادی کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کا اور کوئی قصور نہیں۔ سب سے اچھے الفاظ میں شاہد صاحب نے اَپنے اِس مضمون میں جوشؔ صاحب ہی کا ذکر کیا ہے اور اپنا یہ مضمون یہ کہہ کر ختم کیا ہے کہ "آخر میں جوشؔ صاحب کا نمبر آتا ہے (بزمِ شعر و سخن میں) وہ خوب اسٹیم بھر چکے ہیں۔ ایک بیاض سامنے رکھ کر شروع ہو جاتے ہیں۔ کس بَلا کا کلام ہے۔ سُننے والے پھڑک پھڑک کر داد دیتے ہیں۔ بیسیوں بند کی طویل نظم ہے۔ مگر اُکھڑتی نہیں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کبھی نظم ختم نہ ہو۔ اور ماشاءاللہ کتنی جان ہے پڑھنے والے میں۔ پوری آواز سے پڑھتے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔ آواز کھرائی تک نہیں۔ کیا اِس شاعر کا یہی ایک وصف ایسا نہیں کہ اس کے تمام عیوب کو نظر انداز کر کے اُسے گلے سے لگالیا جائے۔ ع نازت بکشم کہ نازنینی ۔۔۔!"

اگر کہیں شعر سُنانے میں جوشؔ صاحب کی آواز کھرا جاتی تو شاید شاہد صاحب اُن کے "تمام عیوب" کبھی معاف نہ کرتے۔ فراخدلی اور عالی ظرفی کی ایسی مثال شاید ہی کہیں نظر آئے۔ شاہد صاحب کی یہ داد نما بیداد کچھ اُسی قسم کی ہے جیسی داد سے ایک دفعہ جناب شوکت تھانوی کو بھی واسطہ پڑا تھا۔ —— ایک صاحب شوکت سے ملنے آئے اور ان کی "سودیشی ریل" کی تعریف میں بچھے بچھے گئے اور جب وہ "سودیشی ریل" کی مدح سرائی کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر یُوں رطب اللسان ہُوئے کہ "سودیشی ریل" کا کمال یہ ہے کہ اِسے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے

سچ مچ کی ریل سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہے، بس تصویر ہے ریل کی، جب سے یہ کتاب پڑھی ہے، ریل کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ کیا آواز ہے۔ بس ہم تو آواز کے عاشق ہیں۔ چاہے گانے کی آواز ہو یا ریل کی۔ جی چاہتا ہے یہ ریل یونہی چلتی رہے کبھی ختم ہی نہ ہو۔

کاش اس بیداد کے بعد شاہد صاحب "جوش صاحب کے تمام عیوب کو نظرانداز کر کے" اُن سے گلے مِل لیتے اور ساقی کا وہ جوش نمبر اس جوش و خروش سے نہ نکالتے جس کے لیے اُنہیں پُورے برِّ صغیر کا سفر کرنا پڑا اور اتنے لکھنے والے ساقی کے اِس جوش نمبر میں اُنہوں نے جمع کیے کہ اِتنے اِس جھگڑے میں پڑنے والے یا اس جوش نمبر کے پڑھنے والے نہیں مِل سکتے۔ کِسے اتنی فرصت ہے کہ ایسے معاملات میں پڑے اور ایسے قصّوں کو پڑھے۔

اور کاش جوش صاحب ہی شاہد صاحب کے اس مضمون کے جواب میں جو اُنہوں نے ڈپٹی صاحب کی زبان پکڑنے پر مُشتعل ہو کر لکھا۔ راجہ مہدی علی خاں کی طرح ایک "مثنوی قہرالبیان" قسم کی کوئی نظم لکھ دیتے۔ کیونکہ شاعری کا تو یہ ہے کہ

ع — آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

لیکن نثر میں تو لوہے کے چنے خود چبانے پڑتے ہیں، بھلا جو شخص نظم میں یوں قادرالکلام نظر آئے کہ ؎

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو
قاموس و لُغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پر نہیں اُڑتے معنی
الفاظ کے سینوں میں اُتر کر دیکھو

وہی صاحب، نثر لکھنے پر آئیں تو خود اپنے ہی قول کی تردید کرنے بیٹھ جائیں۔

اپنے ہندوستان سے پاکستان آنے کی صفائی میں جوش صاحب اپنے مضمون، "ضرب شاہد بہ فرقِ شاہد باز" میں لکھتے ہیں۔ "پنڈت جی میرے ترکِ وطن پر ہرگز آمادہ نہیں تھے، لیکن جب میں نے اپنے بچّوں کی معاشی، لسانی اور ثقافتی مستقبل کے پیشِ نظر اُن سے یہ درخواست کی کہ وہ مجھے خوشی کے ساتھ جانے کی اجازت دیدیں۔ تو اُنھوں نے غمگین ہو کر مجھ سے کہا کہ "جوش صاحب آپ نے مجھ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ مجھے دو روز کی مہلت دیجیے تاکہ میں ہر پہلو پر غور کر کے آپ کو جواب دے سکوں۔" جب دو روز کے بعد میں اُن سے ملا تو اُنھوں نے مجھ سے فرمایا:

"جوش صاحب میں نے آپ کے مسئلے کا حل نکال لیا ہے۔ اگر آپ کا یہ خیال (جس سے میں متفق نہیں ہوں) کہ میرے اور آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچّوں کا مستقبل تاریک ہو کر رہ جائے گا، تو آپ اپنے بچّوں کو ضرور پاکستانی بنادیں، لیکن جہاں تک آپ کی ذات کا تعلّق ہے آپ تمام عمر ہندوستان ہی میں رہیں۔" یہ سن کر جب میں نے اُن سے یہ کہا کہ اِس حل میں دو قباحتیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میں اپنے بچّوں سے دُور رہنے کی تاب نہیں لا سکتا اور دُوسری یہ کہ اب میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ اپنی اِس آخری عمر میں اُردو کی خدمت کے سِوا اور کوئی دُوسرا کام کروں گا ہی نہیں، تو پنڈت جی نے مسکرا کر جواب دیا کہ اس کا بھی حل نکال چکا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میری حکومت آپ کو اپنے بچوں کے ساتھ رہنے اور اُردو کی خدمت کرنے کے واسطے ہر سال پوری تنخواہ پر چار ماہ کی رخصت دیا کرے گی۔ اب آپ اور کیا چاہتے ہیں؟"

جوش صاحب کے مضمون سے یہ ٹکڑا اِس لیے نقل کیا گیا کہ ایک طرف تو اُردو

سے محبّت جتانے کا یہ حال ہے اور رہائے زبان کے بارے میں یہ ہے کہ ؎

الفاظ کے سر پر نہیں اُڑتے معنی
الفاظ کے سینوں میں اُتر کر دیکھو

اور دُوسری طرف الفاظ کے سَر پر خود اُڑتے نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"حضرت ماؔنی جائسی کو ادبی وظیفہ دلانے کی نیت سے جب میں ایک روز مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس پہنچا، تو اُنہوں نے یہ جواب دیا کہ : "میں ماؔنی کو سرے سے شاعر ہی نہیں تسلیم کرتا وظیفہ کاہے کا؟ اور جب میں نے اصرار کیا تو مولانا نے فرمایا: "ارے بھائی آپ جذبۂ یگانگت سے اتنے مجبور ہو گئے ہیں کہ "ماؔنی کے سے" غیر شاعر کو وظیفہ دلانے پر مُصر ہیں۔" یہ سُنتے ہی میں نے مولانا سے کہا کہ "آپ نے پہلے تو یہ معنوی غلطی فرمائی کہ ماؔنی کو شاعر تسلیم کرنے سے انکار فرما دیا اور پھر "یگانگت" ارشاد فرما کر لفظی غلطی کا بھی ارتکاب کر بیٹھے۔ جب ماؔنی کو ساتھ لے کر میں اسی مقصد کے حصول کی خاطر پنڈت جواہر لال کے پاس پہنچا اور اُن سے کہا کہ ماؔنی صاحب باہر بیٹھے ہُوئے ہیں۔ اجازت ہو تو اندر بُلالوں؟" تو انہوں نے کہا "یہ ماؔنی کون ہیں؟ میں نے کہا : "ارے آپ نہیں جانتے، میرے اُستاد ہیں!" پنڈت جی نے کہا "آپ کے اُستاد!" میں نے کہا "جی ہاں میرے اُستاد۔" پنڈت جی نے کہا "تو فوراً اندر بلا لیجیے۔" ماؔنی صاحب اندر آ گئے، اور اپنا دیوان پیش کیا اور پنڈت جی نے اُسی وقت اُن کا وظیفہ مقرّر فرما دیا۔ اور جب میں اُن کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہونے لگا، تو پنڈت جی نے کہا کہ آپ میرا شکریہ ادا کرتے ہیں، میں تو اُلٹا آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے اُستاد سے ملا دیا۔ یہ سُنتے ہی میں نے پنڈت جی سے کہا کہ ماؔنی صاحب کا وظیفہ مُقرّر فرما کر ایک طرف تو آپ نے میرا جی خوش کر دیا اور دُوسری طرف مشکور کا سا غلط

لفظ استعمال کر کے آپ نے میرے دل کو بھون ڈالا۔

جوشؔ صاحب کی ان دو ملاقاتوں کا ذکر شاہد صاحب کے اس مضمون میں اس لیے ضروری تھا کہ یہ دونوں حضرات "LANGUGE - IMPERIALISM" کے اس شدّت سے شوقین ہونے کے باوجود، خود زبان کی کیسی کیسی غلطیاں نادانستگی میں فرماتے ہیں۔ مثلاً جوشؔ صاحب نے ایک غلطی مولانا ابوالکلام آزاد کی "یگانگت" کی پکڑی اور دُوسری جواہر لال صاحب کی "مشکور ہونے" کی، اور خود یہ حال ہے کہ "غلطی" کا استعمال بے تکلّف فرمادیا ہے۔

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی "یگانگت" ہی تھی۔ شاید جوشؔ صاحب کے ساتھ کہ اُنھوں نے جوشؔ صاحب کو "غلطی" کے استعمال پر نہ ٹوکا۔ کیونکہ لفظ تو اصل میں "غلط" ہے۔ اگر "غلط" کی جگہ "غلطی" اُردو زبان میں جوشؔ صاحب جائز سمجھتے ہیں، تو پھر مشکور بھی، شکر گزار، شاکر، مُتشکر یا ممنون کے معنوں میں جائز ہے۔ اُردو میں زیادہ تر لوگ صرف اپنی تقدیر ہی پر "شاکر" ہوتے ہیں۔ "مشکور" کی غلطی "غلطی" کی طرح نہ صرف یہ کہ غلطُ العام کی سند حاصِل ہے۔ بلکہ "غلط" کی جگہ "غلطی"، اِس لیے دُرست ہے کہ غالب جیسے شاعر نے اِس اُردو کی "غلطی" کو فارسی کے طریقے سے جمع کے صیغے میں "اُردو" میں اپنے ایک شعر میں یوں استعمال کیا ہے کہ ؎

غلطی ھائے مضامیں مت پُوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اگر اِس طرح بقول جوشؔ صاحب "باقیات مانی" آنجہانی مسعُود الحسن تابشؔ دہلوی کی عینک لگا کر اُردو کی تطہیر کی گئی تو پھر "تابعدار" کی جگہ "تابع" "سنگھار" کی جگہ "شرنگار" لال ٹین کی جگہ "LANTERN" "تولیے کی جگہ" "TOWEL" اور اِس طرح کے بیشمار

الفاظ نکل آئیں گے۔ جو اَب ہاتھی کے دانتوں کی طرح اندر نہیں دھکیلے جا سکیں گے۔ مسعودُالحسن تابشؔ دہلوی کی طرح اگر جوشؔ صاحب ہر لفظ کی چھان بین کرنے بیٹھیں گے تو پھر اُنہیں خود اپنی "ریل کی پٹڑیوں میں ہیں غلطاں" والی نظم بھی قلم زد کرنی پڑے گی اس ٹیپ کے مصرع کی وجہ سے کیونکہ انگریزی میں تو "ریل" کہتے ہی "پٹڑی" کو ہیں۔ "ریل کی پٹڑی" اِس حساب سے بے معنی بات ہُوئی۔ مولانا صلاح الدین احمد صاحب اور سیّد انصار ناصری صاحب کا یہ مشورہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ: "KING'S ENGLISH" کی طرح اُردوئے مُعلّیٰ کا معیار جانچا جانا چاہیے قلعۂ مُعلّیٰ کی اُردو سے لیکن مولانا صلاح الدین احمد صاحب اور سیّد انصار ناصری صاحب کے ذہن میں یہ بات شاید ہی کبھی آئی ہو کہ بہادر شاہ ظفرؔ نے اُردو میں جس زبان کا جو لفظ جس تلفّظ کے ساتھ اور جن معنوں میں استعمال کیا وہ بھی اس لیے غلط گردانا جائے کہ مسعودُالحسن صاحب تابشؔ دہلوی کی عینک کے حساب سے سنسکرت، عربی، فارسی، تُرکی، انگریزی یا فرانسیسی وغیرہ میں کسی لفظ کا وہ مخرج، مادّہ، تلفّظ یا معنی نہیں ہیں، جو اُردو میں بہادر شاہ ظفرؔ نے سمجھے، پھر تو خود "اُردو" کے معنی "لشکر" کے ہو جائیں گے اور زبان کے لیے شاید جوشؔ صاحب بھی یہ کہنا پسند نہ کریں کہ میری زبان "لشکر" ہے۔ تُرکی زبان کا یہ لفظ جس طرح اَب ایک زبان کے معنوں میں مُستعمل ہے اُسی طرح "منشور" اور "یگانگت" پر بھی جوشؔ صاحب کو اُن کے اِن معنوں کے استعمال پر حرف گیری نہیں کرنی چاہیے تھی جن معنوں میں جوشؔ صاحب کے سامنے پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ الفاظ استعمال کیے۔ اگر سب اُردو دان جوشؔ صاحب کی طرح مسعودالحسن تابشؔ صاحب دہلوی کے نمبروں کی عینک لگا کر اُردو کی خدمت پر اُتر آئے، تو پھر اُردو کی ترقّی اور ترویج جیسی تو شاید ہو جائے جیسی ڈاکٹر

مولوی عبدالحق بابائے اُردو نے کی، لیکن دُور دُور تک پھیل نہیں سکے گی جب تک کہ اُردو کی ترقّی اور ترویج میں فلمی گانے لکھنے والوں اور فلمی گانے گانے والوں کی مدد شامل نہ ہو، اُردو کی کسی انجمن یا بورڈ نے چاہے وہ انجمن ڈاکٹر مولوی عبدالحق بابائے اُردو نے قائم کی ہو یا وہ بورڈ جوشؔ صاحب کی مساعی سے مُزیّن ہو، اُردو کے پھیلانے میں وہ کام نہیں کیا جو فلمی گانے گانے والوں اور گانے والیوں نے۔ چاہے اُن کی اپنی مادری زبان سے اُردو کا دُور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

اُردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ جوشؔ صاحب اپنے بچّوں کی محبّت میں اس قدر مُبتلا ہیں کہ اُن سے دُور رہنے کی بقولِ خود تاب نہیں لا سکتے۔ یہ وہ جوشؔ صاحب ہیں جو کارل مارکس کو ع اوّلین پیغمبرِ فرشِ زمیں۔ مانتے ہیں اور جس کے لیے علّامہ اقبال نے کہا تھا کہ ع نیست پیغمبر و لے دارد کتاب۔ اِس کارل مارکس کا تو یہ حال تھا کہ اُس کا ایک بچّہ لندن میں "ڈاس کیپٹل" نامی صحیفۂ ارضی لکھنے میں بغیر دوا کے جب مر گیا اور اُس کی بیوی نے اُسے بتایا کہ اِس بچے کو دوا تو نصیب نہ ہو سکی، اب اگر تمہاری غیرت قبُول کرلے تو میں پڑوسیوں میں سے کسی سے ایک پاؤنڈ اس کے کفن دفن کے لیے قرض لے لوں؟ اور اِس حادثے پر جب اس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار نِکلے تو اِس کمزوری پر اُس نے اپنے مشہور دوست 'انگل' کو پیرس خط لکھّا کہ تُم یہ سمجھتے ہو کہ میں تاریخ، فلسفے اور اقتصادیات کا پروفیسر ہوں اور انسانیت کے لیے کوئی بڑا کام کر کے مروں گا، لیکن میں تو اِتنا گھٹیا نکلا اور ایسا خود غرض کہ اپنے ہی بچّے کے غم میں رونے بیٹھ گیا، اور جو شخص اپنے بچّوں کا اِتنا خیال کرے وہ دُوسروں کے ایسے کروڑوں بچّوں کے مستقبل کے مفاد کے بارے کیا اور کیسے سوچ سکتا ہے، اِس لیے مجھ سے کسی بڑے کام کی

توقّع رکھنی عبث ہے۔"

دعویٰ تو جوشؔ صاحب کا یہ ہے کہ ؎

دانائے رموزِ ایں و آں ہوں اے جوشؔ
مولائے اکابرِ جہاں ہوں اے جوشؔ
کیوں اہلِ نظر پڑھیں نہ کلمہ میرا
میں شاعرِ آخر الزّماں ہوں اے جوشؔ

لیکن ۵۔ دسمبر ۱۸۹۸ء کی صبح چار بجے سے تا دمِ تحریر یا بقولِ خود "آدم تا ایں دم" یہ نہ جان سکے کہ "رموزِ ایں و آں" کی جستجو میں آج سے تقریباً ڈھائی ہزار برس پہلے گوتم بُدھ نے اپنے بیوی بچّے کو جس آسانی سے چھوڑ دیا تھا، یہ مُشکل جھیلے بغیر "دانائے رموزِ ایں و آں" تو کیا دانائے زبان تک ہونا دشوار ہے!

قادرُالکلامی اور زبان دانی کے فرق کو اگر جوشؔ صاحب نظر میں رکھتے، تو نہ ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف میں اصلاح کی زحمت انہیں اُٹھانی پڑتی اور نہ "یگانگت" اور "مشکور" جیسے الفاظ کے اُس استعمال پر اُن کا دل بُھنتا جن معنوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ الفاظ جوشؔ صاحب کے سامنے بولے ——— اور نہ شاہد صاحب میں سے وہ آدمی باہر نکلتا جو ان کے بعض جاننے والوں کے نزدیک اس لیے اُن میں چھپا بیٹھا تھا کہ اُن کا اوائل عُمری کا زمانہ؛ والدین کا سایہ بچپن میں سر سے اُٹھ جانے کی وجہ سے گھر کے نوکروں میں گذرا جو صرف آدمی کی عزّت اُس کے منصب کی وجہ سے کرتے ہیں، اس کی انسانیت اور علم و فضل کی وجہ سے نہیں۔ اور جو بیٹھ پیچھے بادشاہ تک کو بُرا کہنے، فقرے کسنے اور خاک کے اُڑانے میں اپنا زیادہ وقت گزارتے ہیں اور اگر جوشؔ صاحب "ٹٹ پونجیے

خاندانوں یا سُود خوار مُلّاؤں یا غاصب حاکموں کے پٹھو علمائے کرام کے گھر میں جنم لینے اور وہیں تربیت پانے" والے جیسی کھری کھوٹی شاہد صاحب کو نہ سُناتے، تو ہرگز شاہد بھائی میں سے وہ اُن کا ہمزاد باہر آ کر اُن کا سامنا نہ کرتا جس نے ساقی کا جوش نمبر نکالا۔ نہ جوش صاحب شاہد صاحب کو اُن کے کالے رنگ سے زیادہ کالا رنگتے اور نہ اپنے میدہ اور شہاب رنگ کو داغ دار ہوتے دیکھتے۔ وہی بات ہوئی کہ ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

ورنہ شاہد بھائی تو وضعدار آدمی تھے اور ایسے مرنجاں مرنج کہ ایک موسیقی کے اُستاد کے کہنے سُننے سے عارضی طور پر شراب و شاہد کے دلدادہ ہو گئے، محض اس خیال سے کہ کہیں اُستاد کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ ترقّی پسند تحریک کے آغاز میں جب اِن کے بعض دوستوں نے مارکسٹ لٹریچر اُن سے زبردستی پڑھوایا تو اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ ساقی کا بیشتر حِصّہ اُردو کے ترقی پسند مصنّفین کے لیے ۳۶ء سے ۴۰ء ۴۲ء تک وقف رکھا بلکہ "بھائی وصی" یعنی الحاج حافظ سیّد وصی اشرف صاحب مالک کُتب خانہ علم و ادب کو سمجھا بجھا کر اپنے اِن ترقّی پسند ادیب دوستوں کی خوشنودیٔ طبع کے خیال سے اُن کے ماہنامے "شاہجہان" کی پیشانی پر "ترقی پسند ادب کا ترجمان" چھپوانا شروع کر دیا۔ ایک طرف تو یہ حال تھا اور دوسری طرف اپنے سرکاری عہدے دار ادیبوں کا پاس یہ تھا کہ جب بھی ترقّی پسند مصنّفین کا کوئی جلسہ ساقی کے دفتر میں ہوتا ان سرکاری عہدے دار ادیبوں کے مشورے سے "سی۔ آئی۔ ڈی" کے دفتر میں بھی خود ہی پہلے سے خبر کرا دیتے، تاکہ نہ سرکار ناراض ہو اُس زمانے کی اور نہ اُس زمانے کے ترقّی پسند ادیب اِن سے اس بات پر کبیدہ خاطر ہوں کہ اِن

ہیں اتنی بھی ہمّت نہیں کہ اپنے رسالے کے دفتر میں ترقّی پسند ادیبوں کا اجتماع ہونے دیں، عارضی طور پر شاہد صاحب ترقّی پسند تحریک کے اوائل میں بے دین بھی رہے اور ایسے ادب کا ترجمہ بھی کیا جس سے مذہب کی نفی ہوتی ہو، لیکن جس طرح عارضی طور پر گورنمنٹ پوسٹ کے "ساقی" کے قائل رہے اُسی طرح یہ زیادہ عرصہ لامذہب بھی نہیں رہے اور جلد ہی مذہب کی طرف لَوٹ آئے۔

بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ موسیقی کی طرف بھی یہ اس لیے مائل نہیں ہُوئے کہ اِن کی طبیعت کا مَیلان ہی ایسا تھا، بلکہ اصل میں اس بہانے اِس فن کے کچھ پریشان حال موسیقی دانوں کی مَدد ہو جاتی تھی ـــــــ اَدب کی طرف بھی اِن کا رُجحان زیادہ تر اسی وجہ سے ہوا کہ ایک اَدبی رسالے کے پَردے میں کچھ غریب ادیبوں کی مَدد ہو جائے۔ کسی کی مُصیبت اِن سے نہ دیکھی جاتی اور اکثر دوسروں کی مصیبتوں پر آواز سے رونا شروع کر دیتے، اتنا کہ ہچکی بندھ جاتی۔ دوستی جس سے ایک دفعہ ہو جاتی آخر دم تک حتی المقدور نبھاتے۔ اور قول کے بھی پکّے تھے؛ البتہ کانوں کے ذرا کچّے تھے، اسی لیے شاید نِتشے نے کہا تھا کہ مکمّل انسان کہیں نظر نہیں آتا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہیں کہیں صُورت ہے، کہیں سیرت، کہیں ذہانت اور کہیں صرف دیانت وغیرہ، اور پیسٹرنک کو یہ کہنا پڑا تھا کہ اُگی ہُوئی گھاس سب دیکھ سکتے ہیں، گھاس کے اُگنے کا عمل کم لوگوں کو معلوم ہوتا ہے اور غالب کی کہن ہے کہ ؏

آدمی کو بھی مُیسّر نہیں انساں ہونا!

میں اور شاہد

جوش ملیح آبادی

یہ غالباً ۱۹۲۸ء کی بات ہے جب کہ میں حیدر آباد دکن میں تھا کہ ایک روز میرے دوست، ڈاکٹر اشرف الحق صاحب، شاہد احمد دہلوی کو اپنے ساتھ لیے ہوئے میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ میرے بھائی اور "ساقی" کے مدیر ہیں۔

اس کے بعد میری شاہد صاحب سے دو ایک ملاقاتیں اور ہوئیں، لیکن چونکہ وہ طبعاً ایک خاموش سے انسان تھے اس لیے میرے اور ان کے روابط قائم نہیں ہو سکے۔

اس کے ایک زمانہ دراز کے بعد کراچی میں اُن سے دس پانچ ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے موقع ملا کہ انہیں قریب سے دیکھوں۔

اس اثنا میں بعض حالات ایسے پیش آئے کہ انہوں نے میرے خلاف اپنے

پرچے کا خاص نمبر نکلا جس کا مَیں نے کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔

ابھی چند روز کی بات ہے کہ مجھے خبر ملی کہ اُن پر دل کا دَورہ پڑا ہے۔ مَیں جناح ہسپتال اُن کی مزاج پُرسی کے لیے گیا۔ انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب خطرے کی حدود سے نکل چکا ہوں۔

ہسپتال کے بعد پھر اُن سے مُلاقات کی نوبت نہیں آئی اور پرسوں ترسوں اُن کے انتقال کی خبر نے میرے دل کو قلق میں مبتلا کر دیا۔

زندگی میں اَن بَن ہو جایا کرتی ہے مگر اَن بَن کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ کسی کے محاسن سے آنکھیں پھیر لی جائیں۔ اور اس کے معائب کے ڈنکے پیٹے جائیں۔

شاہد صاحب ایک بہت بڑے گھرانے کے رُکن اور میرے دوست کے بھائی تھے۔ اَن بَن کے باوجود میں ہمیشہ اُن کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا رہا اور اُن کی خوبیوں کے اعتراف سے مَیں نے کبھی روگردانی نہیں کی۔

اُردو ادب کے منارے ایک ایک کر کے گِرتے چلے جا رہے ہیں اور حالات اِس قدر بدل چکے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اَب اِن جانے والوں کا کوئی جانشین نہیں بن سکے گا۔

ادب کے دوش بدوش مرحوم شاہد صاحب کو فنِّ موسیقی پر بھی بہت عبور تھا اور وہ اس کوچہ میں بھی سندِ اجتہاد حاصل کر چکے تھے۔

جب تک انسان موت پر فتح نہیں پاتا ہم سب کو مرنا پڑے گا لیکن جب تک ہمارے جسم میں دِل اور دِلوں میں جذبات باقی ہیں مرنے والوں پر ہم برابر ماتم کرتے رہیں گے۔

آج ہم شاہد صاحب کا ماتم کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اِن کی موت ایک

ایسی ہستی کی موت ہے جس پر صبر نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کی موت نے اُردو زبان کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ ایسا نقصان جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

کسی ایرانی شاعر نے ماتم احباب میں ایک بے نظیر رُباعی کہی ہے۔ اس پر ان چند سطروں کو ختم کرتا ہوں ؎

افسوس دلا کہ غم گساراں رفتند
سیمیں بدنان و گُل عذاراں رفتند
بر بُوئے گل آمدند بر باد سوار
در خاک چسد قطرہ ہائے باراں رفتند

مکاتیب رشید

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

جمعہ ۲۶ر اپریل ۶۸ء

محترمی سلام مسنون۔

۲ر اپریل کا نوازش نامہ کل شام موصول ہوا۔ معلوم نہیں اتنی دیر کہاں اور کیوں لگی۔ آپ کی فرمائش کی تعمیل کر دوں گا، لیکن اِن دنوں آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے معالج نے پڑھنے لکھنے کی ممانعت کر دی ہے۔ یُوں بھی طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ اِس لیے معافی کا خواست گار ہوں۔ یعنی کوشش ضرور کر دوں گا اور جو کچھ ہو سکے گا حاضر کر دوں گا۔ ہفتے عشرے کی مُہلت چاہتا ہوں۔ اُمّید ہے آپ اور آپ کے رُفقائے کرام مع الخیر ہوں گے۔

مخلص۔ رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ - علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

یک شنبہ - ۲۸ اپریل ۱۹۶۸ء

مکرمی - سلام شوق -

پہلے نوازش نامے میں آپ نے فرمائش کی تھی کہ آپ کی زیرِ تالیف کتاب کے لیے شاہد احمد مرحوم کی برسی کے موقع پر کُچھ لکھ کر بھیج دُوں - اس کے جواب میں عرض کیا تھا کہ ممکن ہُوا تو تعمیلِ ارشاد میں کچھ نہ کچھ کر سکوں گا، لیکن طبیعت اتنی خراب اور حالات ایسے ناسازگار ہیں کہ وعدہ ایفا نہ کر سکوں گا - ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے پرہیز بتایا ہے - اُمّید ہے آپ معالج کے کہنے پر عمل کرنے میں میری مدد فرمائیں گے - دُعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں اس لیے کہ زندگی کی ایک سے ایک اہم ذمّہ داریاں آپ نوجوانوں پر عائد ہیں جن سے اِس پُرآشوب دَور میں عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے - اللہ تعالیٰ مدد فرمائے -

مخلص - رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ - علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

اتوار ۲ جُون ۱۹۶۸ء

مشفقی - تسلیم -

گرامی نامہ ۱۴ مئی کو مِلا تھا - آپ نے محبّت اور شرافت کی اتنی باتیں لکھ دی تھیں کہ مَیں نے اس خط کو علیحدہ رکھ دیا تھا کہ اطمینان سے جواب لکھوں گا - اطمینان آتا جاتا رہا، لیکن جواب لکھنے کی نوبت نہ آئی - کچھ یہ بھی تھا کہ آپ نے ایک فرمائش کی تھی جسے پُورا نہیں کر سکتا تھا - یعنی مرحوم شاہد دہلوی پر کچھ لکھنا - اِس سے پہلے

شاید عرض کر چکا ہوں یا نہیں کہ بہت دن ہوئے غالباً علی گڑھ میں مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ایک شام کو کسی عزیز نے سَرسری سا تعارف سرِ راہے کرا دیا تھا۔ چند رسمی جملوں سے زیادہ بات بھی نہ ہو سکی۔ جب تک وہ دہلی میں رہے شاید ہی کبھی خط وکتابت کی نوبت آئی ہو۔ پاکستان چلے جانے پر کبھی کبھی نامہ و پیام کا اتفاق ہو جاتا۔ ایسا ہوتا تو ہم دونوں ایک دوسرے سے دردمندی اور دِل داری کی باتیں کر لیتے۔ مرحوم نے پاکستان میں مُدتوں سختی کی زندگی گزاری۔ درآں حالیکہ دہلی میں اُن کی زندگی بڑی فراغت اور رکھ رکھاؤ کی تھی اور اچھے اچھوں میں اچھے مانے جاتے تھے۔ پاکستان سے "ساقی" برابر آتا رہا۔ اب بھی آتا ہے۔ کچھ لکھنے کی مجھے کبھی توفیق نہ ہوئی۔ مرحوم نے کبھی لکھنے کی فرمائش نہ کی جس سے شرمندہ ہوں، لیکن مرحوم کی وقعت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ یہ بھی مرحوم کی ایک آن تھی، لیکن جلالی نہیں جمالی! وفات کے بعد معلوم ہوا کہ حکومتِ پاکستان نے پس ماندگان کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس سے اتنی خوشی ہوئی جیسے اس وظیفے کا بندوبست حکومت نے نہیں، مَیں نے کر دیا ہے۔ دوسرے کی خوشی میں شریک ہونے کا میرا احساس کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔

دہلی کی زبان اور دہلی کے نشان اب وہاں کی اُن خاموش، سالم یا شکستہ عمارتوں میں باقی رہ گئے ہیں جو اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ آپ زبان اور عمارت کے گہرے معنوی ربط کو سمجھتے ہوں گے جس کی بڑی اچھی اور نہایت قریب کی مثال اُردو اور ہندوستان کی شاہی عمارتیں ہیں۔ دہلی کی تہذیب اور اس کا رکھ رکھاؤ اب اُن لوگوں میں باقی رہ گیا ہے جو خزاں رسیدہ پتّیوں کی طرح چمن سے باہر تتّر بتّر ہو چکے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنی زبان، اپنے آداب و کرام سے دِلّی کے نام و نقوش کو دلوں پر بٹھاتے چلے

جاتے ہیں۔ یہ جہاں جائیں گے مشرقِ وسطیٰ کی اس گراں مایہ تہذیب کی داغ بیل ڈالتے جائیں گے جس کی آبیاری عہدِ سعادت وسطوت کے سرچشموں سے ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس رول کے ادا کرنے میں اُن اصحابِ قلم کا بڑا حصّہ ہے جنہوں نے دہلی کی اس عظمت، عبرت اور شانِ دل آویزی کو تازہ وتابندہ رکھّا ہے جس کی طرف اقبالؔ کا ذہن سوادِ روضۃ الکُبریٰ میں منتقل ہوّا تھا۔ مرحوم شاہد دہلوی اِن اصحابِ قلم میں یقیناً ممتاز ہیں اور ممتاز رہیں گے۔ میری تو رائے ہے کہ ڈائجسٹ کا ایک گوشہ ایسے مضامین نظم ونثر کے لیے مخصوص ہوّا کرے جن سے اس تہذیبی رکھ رکھاؤ اور ثقافتی ثروت کی ترجمانی ہوتی ہو جس کو ہم دہلی کہتے آئے ہیں۔ اس طرح آپ کا ڈائجسٹ محض روایتی ڈائجسٹ نہیں رہ جائے گا، بلکہ ایک تہذیبی رول بھی ادا کر سکے گا جس پر پاکستان کے دانش وروں کو کچھ دنوں تک زور دیتے رہنا چاہیے۔ یہ بات اس لیے کہنی پڑتی ہے کہ پاکستان کے نوجوان دانشوروں نے (جو نوجوان زیادہ اور دانش ور کم معلوم ہوتے ہیں) اپنے آپ کو اُس تہذیب سے وابستہ کرنا شروع کر دیا ہے جس کو بنانے میں وہ شریک تھے نہ بگاڑنے میں، لیکن اپنانے میں سب سے آگے ہیں۔ شاید اس سبب سے کہ وہ اپنی تہذیب کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے اور سنوارنے کے اہل نہیں رہ گئے ہیں۔ یُوں بھی نوابوں کی نکمّی اولاد ترکے کی دولت کو قوّتِ بازو کی دولت پر ہمیشہ سے ترجیح دیتی آئی ہے۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ یہ نوجوان اُس تہذیب پر فریفتہ ہیں جس کو خود اس کے قبیلے والے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے!

آپ نے لاہور کے جن عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھّے ہیں کہ وہ مجھے محبّت اور عزّت سے یاد کرتے ہیں، اُن کے علاوہ کتنے اور عزیز پاکستان میں اِدھر

اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ کتنے بچھڑ گئے، کتنے باقی ہیں۔ ان سب کا خیال آتا ہے تو کیا بتاؤں دِل پر کیا گزرتی ہے۔ بالکل جیسے حالیؔ نے اپنے مشہور مرثیے میں دِلّی کے بچھڑے ہوئے ارباب و اکابر کو یاد کیا ہو۔ طویل عُمر پانے کی دُعائیں مانگی جاتی ہیں اور کیا کیا جتن نہیں کیے جاتے، لیکن مجھ سے پُوچھیے جُوں جُوں عُمر بڑھتی جاتی ہے، وہ دِل، جو کبھی کتنی اور کیسی کیسی خوشبوؤں اور حوصلوں کا لہلہاتا ہوُا باغ تھا، کِتنی تیزی سے گزرے ہوئے عزیزوں کی حزیں یادگار گورستان بنتا جا رہا ہے۔ جو رہ گئے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو خوش و خرم رکھے۔ آمین۔ میری زندگی جتنی اور جیسی رہ گئی ہے وہ انہی کے جینے اور خوش رہنے سے عبارت ہے۔

مُلک کی تقسیم نے بزرگوں، دوستوں اور جِگر گوشوں کو ایک دُوسرے سے جتنا دُور کر دیا ہے اور ملنے کی جیسی دُشواریاں پیدا ہو گئی ہیں، وہ رنج د راحت کے کیسے کیسے موقعوں پر کس سفاکی سے حائل ہوتی رہتی ہیں، کس کو نہیں معلوم ہیں، بایں ہمہ ان کو جھیل کر پاکستان اور ہندوستان آنا جانا ہوتا رہتا ہے۔ میرے تو قریب ترین عزیز اور دوست پاکستان میں ہیں، لیکن وہاں جانے کے لیے اپنے کو بالکل تیار نہیں پاتا۔ کچھ ذاتی اور نفسیاتی موانع بھی ہیں۔ آپ نے بابائے اُردو اور سید سلیمان ندوی مرحومین کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ پاکستان آئے تو پاکستان والوں نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اِس بنا پر آپ سب مجھے کس مُنہ سے وہاں بُلائیں۔ یقین مانیے میرے ذہن میں یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں نہ آ سکتا ہے۔ مَیں تو وہاں عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں سے مِل کر خوش ہونے اور اُن کو خوش کرنے کے لیے جاؤں گا۔ اُن کے لیے یہاں سے

تحفے لے جاؤں گا۔ سب کے ساتھ اچھّا کھانا کھاؤں گا۔ ان کے ساتھ سیر کے لیے نکلا کروں گا اور جب تک ان میں رہوں گا آس پاس کے مکائد و مصائب کو پاس نہ آنے دُوں گا۔ واپس آؤں گا تو یہاں کے عزیزوں کے لیے وہاں کی اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا۔ ایسے میں پاکستان والے مجھ سے بُرا سلوک کیوں کریں گے —— بقیہ پھر کبھی۔ خُدا حافظ۔

مخلص۔ رشید احمد صدیقی

دلّی کی تہذیب کا نمائندہ

احسان دانش

تقسیمِ مُلک کے بعد کی درمیانی خندقوں اور کانٹے دار تاروں کی جالیوں سے پہلے مَیں جب بھی دہلی جاتا تھا، تو سب سے پہلے راستے میں مولوی سمیع اللہ صاحب کی دُکان پڑتی تھی اور وہی شاعروں اور ادیبوں کے اُترنے کا پلیٹ فارم تھا۔ کہیں اور کسی شہر سے بھی شاعر یا ادیب آتے تو وہ مولوی سمیع اللہ صاحب کی دُکان پر ضرور آتے اور یہیں سب شاعروں اور ادیبوں سے مُلاقات ہو جاتی۔

مولوی سمیع اللہ صاحب کے متعلّق بھی مَیں ایک دو فقرے لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ وہ بیک وقت کتابوں اور کھدّر کے تاجر ہیں اور اُن کے دونوں تجارتی مرکز اُن کا اعتبار کرتے ہیں اِس لیے کہ وہ تقاضے کو مناسب خیال نہیں کرتے۔ جب پبلشر یا مصنّف اپنی کُتب کی رقم طلب کرنے آتا ہے تو اُسے اسی قیمت کا کھدّر ناپ دیتے ہیں اور جب کھدّر والے قیمت مانگتے ہیں تو کتابیں تھما دیتے ہیں۔ گویا وہ کُتب فروشوں اور شعرا و ادبا کو کپڑے کی تجارت

اور کپڑے والوں کو کتابوں کا کاروبار سکھاتے ہیں اور دن بھر میں جو بکری ہوتی ہے وہ دَورِ حاضر کے نوجوانوں کو بہ رغبت اور پُرانے لوگوں کو بوضع کھِلا پِلا دیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھا ہے کہ کہیں باہر سے دو چار شاعر یا ادیب آ گئے اور کیسہ خالی ہوا تو دُکان سے قیمتی کتابیں اور قیمتی کپڑا لے کر بازار کے نرخ سے نِصف قیمت پر دُکانداروں کو دے آئے اور چائے وغیرہ آ گئی۔ یہی اُن کی ایسی خصوصیّت ہے جو اُن کے علم و فضل اور دیو بند کی سنجیدگی پر حاوی ہے اور اسی سے وہ مُلک بھر کے علمی ادبی حلقوں میں قابلِ ذکر انسان سمجھے جاتے ہیں۔ نہ جانے دِلّی کے ادیبوں نے مولوی سمیع اللہ صاحب کی شخصیّت پر اب تک کیوں کچھ نہیں لکھّا۔

مولوی سمیع اللہ صاحب کی دُکان پر جہاں اور ادباء شعرا آتے تھے، وہیں شاہدؔ مرحوم بھی آیا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے بڑی محبّت کرتے تھے اِس لیے نہیں کہ مَیں کبھی کبھی 'ساقی' میں چھپتا تھا، بلکہ اُن کا اخلاق ہی ایسا تھا۔ مَیں دہلی میں جب تک اُن سے مِلتا رہا مَیں نے کبھی اُن سے کسی کی بُرائی نہیں سُنی۔ یُوں فطرتاً تو وہ کم سُخن تھے، لیکن جب ادب و شعر یا نغمہ و ساز پر گفتگو کرتے تو اُن کی معلومات سے ادب کے سینکڑوں تاریک گوشوں پر روشنی پڑنے لگتی۔ وہ دہلی سے باہر بہت کم جاتے تھے، لیکن اس مرکز نشینی کے باوصف اُنہیں مُلک بھر کا علمی ادبی حلقہ جانتا اور اُن کی عزّت کرتا تھا اس لیے نہیں کہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے شجرے میں تیسرے خانے کے انسان تھے، بلکہ اس لیے کہ شاہدؔ اپنی جگہ قلم کے نہایت مضبُوط اور دہلی کی زبان کے ادا شناس تھے۔ اُن کی تحریریں سُلجھاؤ اگرچہ ورثہ معلوم ہوتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی طرزِ نگارش کے واحد قلمکار تھے جسے

ہم دِلّی کی زبان کا وہ کنگرہ کہہ سکتے ہیں جس کے بعد صرف آسمان کی نیلی چادر کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

تقسیمِ مُلک کے بعد اگرچہ وہ دُوسرے ہزاروں مہاجروں کی طرح جنہوں نے افسران کے دروازوں کی ذِلّت برداشت نہیں کی، نہایت عُسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اُنہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مَیں نے پاکستان آ کر غلطی کی —— بیچارے خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ برداشت کرتے رہے جو شریف مہاجروں پر پڑا تھا، لیکن اُنہوں نے وفاداری کا دامن نہ چھوڑا اور مَیں اِس وفاداری کو وضع داری ہرگز نہیں کہوں گا، کیونکہ وضعداری کے پیٹ کی جِلد بڑی نرم ہوتی ہے اور معدہ ہلکا پُھلکا۔ شاہد صاحب کے سامنے وہ سب اِرتقائی مدارج تھے جو ایک مُلک کے بننے اور ترقّی کرنے میں آتے ہیں۔ وہ دُوسرے شکوہ سنج لوگوں کو بھی شکوہ وشکایت سے منع کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ابھی مُلک کی حالت ایسی نہیں جو بآسانی ہماری کفالت کر سکے۔ ابھی تو یہ بچّہ ہے۔ جب پروان چڑھے گا تو ہماری تمہاری نسلیں بھی پروان چڑھیں گی۔ ذرا صبر کی ضرورت ہے۔ کسی حدتک تمہاری تلخی بھی دُرست ہے، کیوں کہ تم اپنے کاروبار، گھربار، مکانات، زمینیں، بزرگوں کے مزارات اور قبرستان جیسی چیزیں چھوڑ آئے ہو، لیکن تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ جب ہماری سات سو برس کی تہذیب ہی تلپٹ ہو گئی تو اب ہم کیا رہ گئے؟ یہاں کے لوگوں کی سردمہری اور کج خُلقی سے گھبراؤ نہیں، ہم لوگوں کی قُربانیاں اِس کی بُنیادوں میں کنکریٹ سے کہیں مضبوط ہیں۔ وہ دِن دُور نہیں کہ یہ مُلک تمام دُنیا میں رشک سے دیکھا جائے گا اور تمام ٹُوٹے ہوئے رِشتے جُڑ ہی نہیں

جائیں گے جہاں دیئے جائیں گے۔

یوں تو وہ مشرقی تہذیب کے دِلدادہ معلوم ہوتے تھے، لیکن مَیں اُنہیں صرف دِلّی کی تہذیب کا نمائندہ کہتا ہوں۔ قدیم دِلّی کی تہذیب کے آثار کی لیپ پوت میں شاہد صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ صحیح معنوں میں دہلوی تھے اور دہلی کے روایات اور روزمرّہ کو زندہ و تابندہ رکھنا اپنا فرض منصبی خیال کرتے تھے۔

نہایت مُنکسر المزاج، حلیم الطّبع اور بڑے نستعلیق قسم کے انسان —— لیکن جہاں تہذیب قدیم اور دِلّی کی روایت پر بات آتی اُسی وقت اُن کی فطرت کا کھرّا پن اُبھر آتا اور اُسی ڈھب کا جواب دیتے۔ اُن کے دل میں ماضی کا احترام اور بزرگوں کی عزّت نقشِ کالحجر ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اِسی قدر و منزلت کے جنون میں اُنہوں نے جناب جوشؔ ملیح آبادی کے خلاف مواد اکٹّھا کر کے چھپوا ڈالا ہے۔ اِس سے اُن کی رُوح کی تلخی اور دِل آزاری کا پتہ چلتا ہے۔

آج شاہدؔ پر مقالے پڑھے جا رہے ہیں، کتابیں چھپ رہی ہیں، تعزیتی جلسے ہو رہے ہیں، لیکن زندگی میں اِس مُردہ پرست قوم نے اُنہیں کوئی قابلِ ذکر سہارا نہیں دیا۔ کسی کی سمجھ میں اُن کی پریشانی اور غم انگیزی کا سدِّباب نہ آیا۔ سب نے اُن کی خاموشی کو عادت پر محمول کر کے اُن کے دلی کیفیات سے نظریں چُرائیں۔ اُن کے سانسوں سے سینے کے بگڑے ہوتے زخموں کی مہک نہ پہچانی اور چہرے کو دیکھ کر سینے میں نہ جھانکا۔

آج سوسائٹیاں بنتی ہیں، دکھاوے کے غُل غُپاڑے مچائے جاتے ہیں۔ اُن لوگوں سے مُردوں کی قبروں پر سفیدی پھروائی جاتی ہے جنہوں نے ایسے بڑے اور قابلِ قدر ادیب کو زندگی میں نہ پہچانا۔ آج یہ واویلا کر کے اپنی چلتی پھرتی

لاشوں کے شانوں پر زندگی کا چہرہ چڑھا کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں، حالاں کہ شاہد اُن کی اُچھل کُود اور صنعتی فریاد و فغاں کے محتاج نہیں، اُن کی کتابیں اور لٹریچر اُن کی زندگی کی ضمانت ہے۔ "دِلّی کی بپتا" اور "گنجینۂ گوہر" ہی ایسی کتابیں ہیں جو ادب میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

جناب شاہد ہم سے دُور بہت دُور جا چکے ہیں اور وہاں تک جانے کے لیے موت کی تیز رَو سواری سے بڑھ کر کوئی سواری ممکن نہیں ہو سکتی۔ موت ہی وہ سواری ہے جو ہمیں عقبیٰ تک لے جاتی ہے۔

خُدا مرحوم کو جنّت اور پسماندگان کو صبر و تسکین عطا فرمائے۔ آمین!

ادیب ابنِ ادیب

نقی محمد خان خورجوی

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے کوئی ہنسی نہیں ہے

شاہد صاحب کے انتقال کو ایک سال ہونے آیا، لیکن یاد اُن کی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ وہ ادیب ابنِ ادیب ابنِ ادیب تھے۔ شمس العلما مولوی نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیر احمد کے بیٹے تھے اور ادب ان کا خاندانی ورثہ تھا۔ ریڈیو میں ایس احمد مشہور تھے۔ رسالہ ساقی کے ذریعے سے جو اُنہوں نے برسہابرس ادبی خدمات انجام دی، وہ ادبی دُنیا کبھی فراموش نہ کرے گی۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ باوجودیکہ ان کا تعلق مولوی خاندان سے تھا، علم و فضل کے علاوہ وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور اُن کے شاگردوں میں اکثر ایسے ہیں جو کلاسیکی موسیقی کے ماہرِ فن ہیں۔ مجھے حضرت امیر خسروؒ کی ایجاد کردہ موسیقی کی تحقیقات کے سلسلے میں ایسے شخص کی تلاش تھی جو موسیقی میں کامل

اور علم و ادب کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں، چناں چہ ان ہر دو صفات کا حامل سوائے شاہد مرحوم کے کوئی نہ مِلا اور یہی ہم خیالی میری اور شاہد صاحب کی مُلاقات کی وجہ بن گئی۔ آپ اس کی تفصیل انہیں کی زبان سے سُنیئے۔ جو پہلا شعر اس مضمون کی تمہید میں شاہد صاحب نے کہا تھا ممکن ہے اس کا مفہوم میرے متعلّق ہو، لیکن اب تو اُنہیں کے واسطے زیادہ موزوں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ؎

"باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیئے گا
کرتے کسی کو سُنیئے گا تو دیر تلک سَر دُھنیئے گا"

اللہ بھلا کرے ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کا جس کی بدولت ایسے ایسے لوگوں سے ملنا ہو گیا جن سے شاید کبھی مِلنا نصیب نہ ہوتا۔ اُنہیں میں ایک خان بہادر نقی محمد خان صاحب بھی ہیں جن کی بزرگانہ شفقت اور محبّت نے میرے بہت سے غم غلط کر دیے۔ خیر سے ۸۴ سال کی عمر ہے۔ اللہ ہزاری دے، مگر ایسے زندہ دِل کہ روتوں کو ہنسائیں۔ خُوب ہنستے ہیں اور خوب ہنساتے ہیں، ورنہ اس عمر میں تو اچھّا بھلا آدمی کاٹنے کو دوڑنے لگتا ہے اور خود سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس عُمر سے تو پیغمبروں نے بھی پناہ مانگی ہے اب اگر کوئی ایسا بُڈّھا مِل جائے جس کے پہلو میں دلِ زندہ دم نہ توڑ چکا ہو تو اسے ایک عجوبہ ہی سمجھنا چاہیے، "پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است" —— نقی محمد خاں صاحب کے اسمِ گرامی سے تو مَیں بچپن ہی سے واقف تھا۔ اُن کے دِلچسپ مضامین رسالوں میں چھپتے رہتے تھے۔ ملازمت سے سُبکدوش ہونے کے بعد اُنھوں نے دہرہ دُون میں کوٹھی بنالی تھی۔ مولوی عنایت اللہ مرحوم سے

ملنے جب میں دہرہ دُون جاتا تو اُن کی کوٹھی کے سامنے سے اکثر گزرتا اور ملنے کو بھی دل چاہتا، مگر دنوں قیام کے باوجود ملاقات کا کوئی موقع نہ ملا۔ مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا اور دہرہ دُون خواب ہو گیا اور نقی محمد خاں صاحب بھی خیال سے اُتر گئے۔ ایک دن صبح سویرے ایک صاحب تشریف لائے۔ ملیے، لہکارے، اُجلا رنگ، کتابی چہرہ، کترواں مُونچھیں، ڈاڑھی گھٹی ہوئی، سر پر تُرکی ٹوپی، پاؤں میں بوٹ۔ دروازے میں سے کرٹک کر پُوچھا: شاہد صاحب ہیں؟ مَیں نے دل میں کہا خدا خیر کرے بھلا اِن بزرگ نے اس ویرانے میں آنے کی زحمت کیوں کی ہو گی۔ مَیں نے کہا تشریف لائیے۔ جب دروازے میں سے اندر آئے تو اُن کے پیچھے جالبی صاحب کا مُسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ "خان بہادر نقی محمد خاں صاحب خلیل خورجوی" اور اس کے بعد جو دلچسپ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی گھنٹے گزر گئے۔ نقی محمد خاں صاحب ادب کے تو پُرانے بیمار تھے ہی، موسیقی کے بھی کُہنہ مریض نکلے۔ اس مرض اور غرض کی ابتلا نے فوراً ہی یگانگت کی بُنیاد ڈال دی۔ اُنہیں حضرت امیر خسروؒ کی موسیقی کی تلاش تھی۔ ریڈیو پاکستان کے خلیق صاحب نے نشان دہی اور جمیل جالبی صاحب نے رہبری کی۔ یُوں یہ انمول رتن میرے ہاتھ آیا۔ وضع داری کے علاوہ خوش گفتاری بھی اُن کا ایک بڑا وصف ہے۔ چاق چوبند زندگی گزارنے کے بعد بیکاری اُن کے لیے بار بن گئی۔ ہمزاد کی طرح اُنہیں بھی ہر وقت کام چاہیے۔ ایک روز میں نے کہا آپ اپنی سوانح عمری لکھ ڈالیے۔ آپ کی زندگی عجیب و غریب واقعات کا مُرقّع ہے اس میں ایک صدی کی ثقافتی جھلکیاں بھی آ جائیں گی۔ میری اس فرمائش پر انہوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ تین مہینے بھی شاید پُورے نہ ہونے پائے تھے کہ

پانچ سو صفحے کی سوانح عمری تیار ہو گئی۔ میں نے اس کو بہت دلچسپ پایا اور خیال کیا کہ اور مسوّدوں کی طرح یہ مسوّدہ بھی دیمک کی نظر ہو جائے گا، اسے ساقی کے ایک خاص نمبر کی شکل میں "عمرِ رفتہ" کے نام سے پیش کرنا مناسب ہو گا، چنانچہ یہ خاص نمبر اپریل ۵۰ء میں شائع ہوا۔"

اس تعارف کے بعد شاہد مرحوم سے طبیعت کو کچھ ایسی مناسبت ہوئی کہ انتقال کے وقت تک شاہد احمد صاحب سے ملتا رہا اور ان ملاقاتوں میں طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ مجھے شاہد صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور میں نے اُن کو مکمّل انسان پایا۔ اُن کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ متواضع اور خلیق تھے۔ امیر غریب سب سے یکساں ملتے تھے، بڑے باوضع اور خوددار تھے۔ برسوں ریڈیو میں کام کیا، لیکن ملازمت نہ کی۔ کوئی غرض مند اگر چلا جاتا تو اپنا کام چھوڑ کر پہلے اس کا کام کرتے۔ اس موقعہ پر ایک واقعہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص کو انہوں نے کسی محکمے میں ملازم کرا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک روز وہ شاہد صاحب کے مکان پر گیا اور ازراہِ تشکّر پانچ ہزار کے نوٹ دینے چاہے۔ روپے کی کس کو ضرورت نہیں ہوتی اور شاہد صاحب کی تو وہی مثل تھی کہ روز کنُواں کھودنا اور پانی پینا، لیکن شرافتِ نفس اور وضعداری کا یہ عالم تھا کہ اس کثیر رقم کو لینے سے قطعی انکار کر دیا۔

بڑی خوبی یہ تھی کہ یارِ شاطر تھے بارِ خاطر نہ تھے۔ متواضع ایسے کہ آئے دِن دعوتیں کرتے اور بِلا چائے کی تواضع کیے تو کسی کو جانے ہی نہ دیتے۔ دوسری بڑی صفت یہ تھی کہ نہ اُنہوں نے جھوٹ بولا اور نہ کبھی جھوٹا وعدہ کیا۔ صاف گوئی بھی اُن کا بڑا وصف تھا۔ حق بات کہتے اور حق بات پسند کرتے تھے اور

اس پر مرتے دم تک قائم رہے۔ حاضر جوابی، زندہ دلی اُن کے خمیر میں داخل تھی۔ وہ کسی کے بلا سبب سر نہ ہوتے، لیکن اگر کوئی اُن کی یا اُن کے خاندان کی توہین کرتا تو مُنہ توڑ ایسا جواب دیتے کہ جس کو وہ ہمیشہ یاد رکھتا۔ بعض ضرورتیں بھی پیش آئیں، لیکن انہوں نے کبھی نہ شکایت کی نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ اُن کی بڑی تمنا یہ تھی کہ کلاسکی موسیقی جس کا معیار پاکستان میں روز بروز گرتا جا رہا ہے، اس کی ترقّی اور بقا کے واسطے موسیقی کا اعلیٰ پیمانے پر کالج قائم ہو۔ اس کے لیے شاہد مرحوم نے معہ میرے اور جمیل جالبی صاحب کے کئی سال کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی اور یہ حسرت وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

موسیقاروں میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر خیال کرتے ہیں، لیکن عجیب معاملہ تھا کہ موسیقی میں نہ خود حاسد تھے نہ دوسرا اُن سے برتری کا دعویٰ کرتا تھا۔ باوجود عدیم الفرصتی کے گِلڈ کے بھی ممبر رہے۔ شاہد صاحب نے ایک دو نہیں نہ معلوم کتنے لکھنے والوں کو ساقی کی بدولت 'دیب' بنا دیا۔ میرا اس قدر احترام کرتے تھے کہ جب کبھی مَیں نے کوئی مضمون اصلاح کی غرض سے بھیجا، یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے، البتہ فلاں بات کے اضافے کی ضرورت ہے۔ الغرض ان کی خوبیوں کا کہاں تک شمار کروں۔ بعض اوقات جب یاد آتے ہیں دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے ؎

"ابھی کیا ہے رُلائے گی ابھی تو داستاں تیری"

شاہد و ساقی

فضلِ حق قریشی

عرصۂ دراز کی بات ہے، یعنی تقسیم برِّ صغیر سے بھی کئی سال پہلے، مَیں نے ایک روز نجی نشست میں شاہد بھائی سے کہا: "حضرت حافظؔ شیرازی واقعی لسانُ الغیب تھے۔ اُن کے اشعار اُن کی اس صفت کے آئینہ دار ہیں۔ اب مَیں بھی اس بات کا قائل ہو گیا ہوں۔"

انہوں نے پُوچھا: "وہ کیسے؟"

وہ سمجھے کہ شاید مَیں نے اُن کے دیوان سے کوئی فال نکالی ہے۔

مَیں نے کہا: "اُن کو صدیوں پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ کسی زمانے میں برِّصغیر کے ایک گوشے میں ایک شخص "شاہد" نام کا پیدا ہو گا اور وہ رسالہ "ساقی" نکالے گا۔"

انہوں نے بڑے تعجب سے کہا: "اچھّا!" اور پھر پُوچھا: "کیا مطلب؟ ذرا صاف بات کرو۔"

مَیں نے جواب دیا: "اُن کا کلام پڑھ کر دیکھو۔ ایک ترکِ شیرازی کے سیاہ خال پر سمرقند و بخارا نچھاور کرنے والے لسانُ الغیب نے اور زیادہ مخیّر بنتے ہوئے دونوں جہان تم پر اور تمہارے رسالے پر قربان کر دیے تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا ع

جہانِ فانی و باقی، فدائے شاہد و ساقی

مَیں نے حافظ کے مصرعے میں شامل دو لفظوں کی جو نئی تاویل پیش کی تھی، اس پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ محفل میں شریک دوسرے لوگوں نے بھی قہقہہ بلند کیا۔ پھر مَیں نے کہا: "اگر کبھی مَیں نے تم پر کوئی مضمون لکھا تو اِسی مصرعے کے الفاظ کو زینتِ عنوان بناؤں گا۔" لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ موقع ان کے مرنے کے بعد آئے گا —— جب میرا مضمون خود ان کے رسالے میں شائع بھی نہ ہو سکے گا۔

جنوری ۱۹۳۰ء میں ساقی جاری ہوا۔ اُنہی دنوں کی بات ہے، ایک روز مَیں اپنے ایک دوست ممتاز حسین کے ہاں بیٹھا تھا جو اُس وقت میری طرح طالبعلم تھے اور اب کراچی کی ایک درس گاہ کے پرنسپل ہیں۔ وہاں ظفر قریشی آئے۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں میں شامل تھے اور اب عُمر کی ایک منزل تک پہنچ جانے کے باعث میری طرح ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اُس وقت اُنہوں نے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی اور مَیں اس منزل میں قدم رکھنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

اُن کے ہاتھ میں ساقی کا پہلا پرچہ تھا۔ ہمیں دکھایا اور اپنے مخصوص انداز

میں کہنے لگے: "ذرا ان کو باندھیے۔ پہلا دھجی پرچہ نکلا ہے اور "نگاہِ اوّلین" میں لکھتے ہیں کہ دُنیائے ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیں گے۔ ہر نئے پرچے کا ایڈیٹر یہی دعویٰ کرتا ہے اور پھر بھول جاتا ہے کہ مَیں نے کیا کہا تھا۔ ابھی کیا ہے۔ تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔ کئی اشاعتوں کے بعد صحیح رائے قائم کرنے کا وقت آئے گا۔ مَیں نے اپنی رائے لکھ کر انہیں بھیج دی ہے، تم بھی ایک خط لکھ مارو۔ یہ حضرت کسی مغالطے میں نہ رہیں۔"

اُس وقت ہم تینوں میں سے کوئی بھی شاہد احمد کو اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ڈاکٹر نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیرالدّین احمد کے بیٹے ہیں۔ اُن کے گھرانے سے انہی دو بزرگوں کی تصانیف شائع ہوتی تھیں۔ علم و ادب کا چرچا تھا۔ اس لیے رسالہ نکال لیا گیا۔ آج کل کے برعکس اُس زمانے میں رسالہ نکالنے کی اجازت لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اخراجات بھی زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ پھر دِلّی کے متموّل گھرانوں میں ان کا خاندان شمار ہوتا تھا۔ اپنا ذوق پُورا کرنے یا خاندانی روایات قائم رکھنے کے لیے رسالے کا شائع ہونا کوئی تعجّب کی بات نہیں تھی۔

حُسنِ اتّفاق ہے کہ انصار ناصری بھی، جو حال ہی میں ریڈیو کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں، اُس زمانے میں ہم تینوں کے ہم سبق تھے اور شاہد کے عزیزوں میں سے تھے۔ چند ماہ بعد اُن کے ذریعے شاہد سے باقاعدہ تعارف ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے تکلّفی بڑھتی چلی گئی۔

اُن دنوں میرا ایک ڈرامہ ماہ نامہ ادبی دنیا میں چھپا تھا۔ عابد علی عابد نے اس کی تعریف میں نوٹ لکھ دیا تھا اور مجھے ایک کُہنہ مشق ادیب قرار دیا تھا۔ شاہد نے

اسے پڑھ کر ساقی کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی اور یوں ادبی سلسلہ اُن کے رسالے میں شروع ہو گیا، اور وہ بھی اس التزام کے ساتھ کہ مَیں نے چھ سال کے بہتّر پرچوں میں کبھی ناغہ نہیں کیا۔ یہ افتخار میرے سوا کسی اور ادیب کو نصیب نہ ہو سکا۔ چھ سال بعد میری دوسری مصروفیات کے باعث رخنہ پڑا اور پہلی سی باقاعدگی قائم نہ رہ سکی۔

ساقی کا دفتر اسی حویلی کے ایک حصّے میں تھا جہاں ڈاکٹر نذیر احمد اور پھر مولوی بشیر الدّین احمد بیٹھ کر خدمتِ ادب کرتے تھے۔ نیچے کی منزل میں باپ اور دادا کی مطبوعات کا دفتر تھا اور شاہد کے ماموں اشتیاق حسین چشتی اس کے مہتمم تھے۔ اُوپر کی منزل میں سے دو بڑے کمرے شاہد نے گھیر لیے تھے جو آمنے سامنے تھے۔ ایک میں ساقی کا دفتر تھا۔ ایک ہندو کلرک کام کرتا تھا۔ دوسرے میں وہ خود براجمان ہوتے تھے۔ دونوں کمروں میں میز کرسی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ دری چاندنی پر نیچے کی نشست رہتی۔ بڑے سے بڑے مُلاقاتی کو وہیں بٹھایا جاتا تھا۔ کسی میز کے بغیر چائے پانی کی پیشکش بھی ہو جاتی تھی۔ شاہد بڑی سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ موسمِ گرما میں تہمد اور بنیان میں آ کر اپنے کمرے میں بیٹھ جاتے۔ سردی کے موسم میں خاکی گرم قمیص اور سفید وائل کا پاجامہ اُن کا خاص لباس تھا۔ ایک اُونی چادر بھی مستقل طور سے کمرے میں پڑی رہتی تھی کہ جب ضرورت ہو کندھے پر ڈال لی جائے۔

رفتہ رفتہ اُن سے اتنی بے تکلّفی بڑھی کہ روزانہ دفترِ ساقی میں جانا اور آٹھ نو بجے تک وہاں بیٹھنا معمول ہو گیا۔ مَیں مجلسِ بلدیہ کے محکمۂ ہاؤس ٹیکس میں انسپکٹر ہو گیا تھا۔ ظفر گورنمنٹ پریس میں پہنچ گئے تھے۔ ممتاز حسین نے ایک مدرسے میں

بچّوں کو پڑھانا اور انصار ناصری نے عدالتوں میں وکالت کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے علاوہ قاضی عبّاس حسین (ظریف دہلوی)، افضل حسین چشتی (علّامہ مضحک دہلوی) پیر ولایت حُسین (خمّار دہلوی) بھی شریکِ محفل ہوتے تھے۔ کبھی کبھار آنے والوں میں وصی اشرف، صلاح الدّین قریشی، نہآل سیوہاروی، محمود مورخ اور تابش دہلوی تھے۔

ساقی کے ادارتی فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ شاہد کو گانے بجانے کا بھی شوق تھا۔ اس شوق کی ابتدا تو زمانۂ طالب علمی میں ہو گئی تھی، بلکہ سچ پوچھو تو اس اچھّے یا بُرے شوق نے اُن کی زندگی میں سب سے بڑا موڑ پیدا کیا تھا۔ بزرگوں کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنیں۔ اسی خیال سے میٹرک کے بعد اُن کو ایف سی کالج لاہور میں داخل کیا تھا اور بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگے تھے، لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ شاہد انسانی جسموں کی چیر پھاڑ کرنے کی بجائے نشترِ الفاظ کی نوک سے رگِ احساس کو گُدگدیں۔ لاہور کی رنگین فضائیں انہیں گانے بجانے کا شوق چرایا۔ طبّی کتابوں کی بجائے وہ ہارمونیم اور طبلہ سنبھال بیٹھے۔ طبعیات کے فارمولے یاد کرنے کی بجائے غالب اور میر کی غزلیں ازبر ہونے لگیں۔ جب امتحان میں فیل ہوئے اور کالج سے رپورٹ گئی کہ صاحبزادے پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے تو بزرگوں نے اُن کو لکھا کہ بُدّھو میاں خیر سے گھر آ جاؤ۔

دہلی آ کر وہ مشن کالج میں داخل ہو گئے اور انگریزی ادب میں بی اے آنرز کر لیا۔ موسیقی سے لگاؤ تو یہاں بھی رہا، مگر ذرا چوری چھپواں —— پڑھائی کی رپورٹ کالج سے ہر مہینے بڑے بھائی منذر احمد کو مل جاتی تھی۔ یُوں تو وہ بڑے بھائی تھے، لیکن بالکل والد کی طرح سرپرستی کرتے تھے۔ خود فارغ التحصیل ہو کر

ریلوے کے ایک دفتر میں افسر بن گئے تھے۔ گریجوئیٹ ہونے کے بعد شاہد کو بھی وہیں گھسیٹ لیا۔ یہ حضرت میز کرسی سے گھبراتے تھے۔ اِن کا دل چاہتا تھا کہ زمین پر دوزانو بیٹھ کر اور آگے جھک کر سفید چاندنی پر رکھے ہوئے کاغذ پر خامہ فرسائی کرتے رہیں۔ آزاد منش پنچھی جال میں کب تک رہتا۔ ملازمت روپے پیسے کے خیال سے نہیں کی تھی۔ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جائیداد اتنی زیادہ تھی کہ اس کے کرائے سے نہ صرف گھر چلتا، بلکہ رسالہ ساقی اور ساقی بُک ڈپو سے جو خسارہ عُمر بھر ہوتا رہا، اسے بھی وہ اپنے حصّے کی رقم سے پُورا کرتے تھے۔

شروع میں بڑے بھائی کی طرف سے جو لاگ ڈانٹ تھی، وہ ساقی نکلنے کے بعد بتدریج کم ہوتی گئی۔ ویسے بھی شاہد اُس وقت تک تین چار بچّوں کے باپ بن چکے تھے۔ ان پر نادیبی انکس کب تک لگتا رہتا۔ پاسبانِ عقل نے اُن کو تنہا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ شام ہوتی، کلرک اور کاتب اپنے اپنے گھر جاتے اور ہم چار پانچ دوست جمع ہو جاتے۔ کچھ دیر ادبی گفتگو ہوتی، کچھ "ساقی" کی تیاری کے بارے میں تبادلۂ خیالات ہوتا اور بعد مغرب صحن میں ایک دری بچھ جاتی۔ ملازم گاؤ تکیوں کے علاوہ ہارمونیم اور طبلہ بھی نکال کر رکھ دیتا۔ ہماری ادبی ٹولی میں سے شاہد کے علاوہ انصار ناصری اور پیر ولایت حُسین بھی طبلے سے شوق فرماتے تھے۔ انصار گاتے نہیں تھے اور ولاؔیت کو جو بعد میں خُمارؔ دہلوی بن گئے، فارسی کی دو غزلیں یاد تھیں۔ قوّالی کے رنگ میں وہ انہیں گاتے اور گاتے گاتے خود حال کھیلنے لگتے۔ ایک شعر کے الفاظ کچھ اس طرح ادا کرتے کہ کسی کے پلّے نہ پڑتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کانوں میں دو لفظ سب سے زیادہ گُونجتے —— حلَب بادا —— چنانچہ ان کا نام ہی حلَب بادا

پڑ گیا۔ شاہد آواز دیتے: "ارے بھئی حلّب بادا!" اور وہ کہتے "جی"۔ یہ الفاظ اتنے مشہور ہوئے کہ گھر والوں کے کانوں تک بھی پہنچ گئے۔ جب محفلِ ساقی میں غیر معمولی دیر ہو جاتی اور وہ دیر تک گھر نہ پہنچتے تو اُن کی والدہ ملازم کو بھیجتیں یہ کہہ کر کہ "جا، ننّدو کے ہاں۔ ولایت کو بُلا کر لا۔ وہ چنڈال چوکڑی میں بیٹھا حلّب بادا کر رہا ہوگا۔ (شاہد کو رشتے کے چھوٹے بڑے سب ننّدو کہتے تھے)

پیر ولایت کے مُنہ میں اُوپر والے چوکھٹے کے درمیانی دو دانتوں میں اتنی جھری تھی کہ اس میں بیڑی اٹکا لیتے تھے۔ وہ کش لگاتے اور گاتے جاتے اور اسی حالت میں ان پر حال بھی آجاتے تھے۔ یہ دِلّی کی ایک پُرانی درگاہ سیّد حسن کے سجّادہ نشین کے صاحبزادے تھے۔ درگاہ میں قوّالی ہر جمعرات کو ہوتی۔ یہ بھی والد کے قریب بیٹھ جاتے۔ ان پہ قوّالی کا رنگ وہاں سے چڑھا اور دُوسرے لوگوں کو دیکھ کر خود بھی حال کھیلنے لگے۔

ایک روز مجھے شرارت سُوجھی۔ جب انہوں نے محفلِ ساقی میں حال کھیلنا شروع کیا تو مَیں نے بھی ایک زور کا نعرہ لگایا اور اُن سے زیادہ والہانہ انداز میں جھومنے لگا۔ جب اُن پر حال آئے تو مَیں بھی بے حال ہو گیا۔ انہیں یہ بات ناگوار گزری۔ اپنی ظاہری خود فراموش محویّت کے عالم میں ایک زوردار گھونسا میرے رسید کیا۔ میری طبیعت درست ہو گئی، لیکن مَیں نے بدلہ لینا ضروری سمجھا۔ محفلِ موسیقی ایک چھوٹا سا اکھاڑہ بن گئی۔ خوب "لپاڈگی" ہوئی۔ میری تمام حرکتیں مذاق میں ہو رہی تھیں، مگر وہ سنجیدہ ہو گئے۔ چند دن بدمزگی رہی، لیکن پھر وہ منا لیے گئے۔ ہم میں سے کوئی بھی زیادہ عرصے دل میں کپٹ نہیں رکھتا تھا۔ لڑتے اور پھر مِل بیٹھتے۔ اس عمر میں زندگی کا یہ کھیل سب سے زیادہ دل پسند کہا جا سکتا ہے۔

شام کی محفل میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے جن کو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ نہ تو ساقی پڑھتے اور نہ شاہد سے اُن کے ادیب ہونے کے اعتبار سے ملتے۔ وہ صرف گانے بجانے سے شوق رکھتے تھے۔ اِن میں سے ایک صاحب تھے منظور۔ اُن کے مُنہ میں بھی پیر ولایت حُسین کی طرح اُدپر والے دو دانتوں میں نقص تھا، لیکن چھِری ہونے کی بجائے وہ ذرا بڑے تھے۔ اسی لیے ان کو "دَتّو" کہا جاتا تھا۔ وہ طبلہ بجانا جانتے تھے۔ دو تین ٹھمریاں بھی یاد تھیں۔ روزانہ انھی ٹھمریوں کو الاپتے۔ مجھے ان کے بول یاد نہیں۔ بول یاد کرنے سے پہلے ان کو سمجھنے کی جو ضرورت تھی اور یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ شاہد کہتے بھی "میاں دَتّو، اور بھی کوئی چیز سیکھو۔ ان دو تین گانوں سے تمہاری طبیعت اُکتاتی نہیں؟" لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ گانے کے پلیٹ فارم پر ان کی گاڑی سائڈ لائن پر لگ چکی تھی۔ اب چلتی پٹڑی پر کیسے آتی۔

انھی جیسے ایک صاحب اور بھی تھے ——— حافظ یوسف کہلاتے تھے۔ وہ ہم سب کے ایک مشترک دوست کے بڑے بھائی تھے۔ ذرا سنکی، بلکہ نیم پاگل تھے۔ کوئی کام کاج نہ کرتے۔ اُن کے بھائی فوجیوں کو تعلیم دینے پر معمور تھے۔ وہ کچھ رقم ہر مہینے بھیج دیتے۔ اسی سے رُوکھی سُوکھی کھا کر اُن کا گزارا ہوتا تھا۔ وہ شام کی محفل میں باقاعدہ نہیں، کبھی کبھی شریک ہوتے۔ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے رہتے اور صرف ایک غزل سُنا کر چلے جاتے۔ کبھی کبھی ہمیں شرارت سُوجھتی۔ وقت سے چند منٹ پہلے اُٹھ جاتے۔ اُن کا گانا نہ سُنتے۔ صرف شاہد بیٹھے رہ جاتے۔ وہ تکلفاً محض دِل رکھنے کے لیے کہتے: "ہاں، حافظ جی، شروع ہو جاؤ۔ بدذوق لوگ چلے گئے ہیں، لیکن میں تو سُننے کے لیے موجود ہوں۔" اور حافظ جی ہارمونیم سنبھال کر

واقعی شروع ہو جاتے۔ شاہد طبلے پر سنگت کرتے۔ حافظ یوسف کو صرف ایک غزل یاد تھی۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے

ایک روز مجھے مذاق سُوجھا۔ مَیں نے حافظ جی سے پُوچھا: "یہ بتائیے، وہ کم سن جسے آپ باغباں سے ہلکے رنگ کی کلیاں بھجوانی چاہتے ہیں، لڑکا ہے یا لڑکی؟"

اُن کا جواب آنے سے پہلے شاہد بول پڑے: "ارے میاں ڈاڑھی والا مرد ہے۔ محلّے کی مسجد میں اذان دیتا ہے۔ اسی لیے تو حافظ جی بھی پنج وقتہ نمازی ہو گئے ہیں۔"

لیکن میرے سوال کا جواب باقی تھا۔ حافظ یوسف بولے: "پہلے تو وہ ایک کم سن لڑکی تھی، لیکن اب چار بچّوں کی ماں بن چکی ہے، تاہم میری نگاہ میں کم سن ہے۔ اس کی شادی کو صرف سات سال ہوئے ہیں۔ بس ؏

"اسی کی یاد میری زندگی ہے"

شاہد فوراً بولے: "یہ غلط بات ہے۔ اصلیّت نہ چھپاؤ۔ پہلا مصرعہ بھی تو پڑھو ؏

"گزارے ہیں خوشی کے چند لمحے"

آپ کی وہ کم سن لڑکی پیدا ہوتے ہی چار بچّوں کی ماں تو نہیں بن گئی تھی۔ جب آپ انگنا میں گلی کھیلتے تھے اسے دکھانے اور رجھانے کے لیے تو وہ ننھے بالما کا گیت گاتی ہوگی۔ ذرا اس گیت کے بول بھی تو کسی روز سُنا دو۔"

محفل میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ حافظ یوسف بڑے افسردہ ہوئے اور خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر چلے گئے۔ کئی دن تک دفتر ساقی میں نہیں آئے۔ آئندہ کے لیے ہم سب نے احتیاط برتنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تہیّہ کر لیا کہ حافظ یوسف کو اشارۃً یا کنایۃً پُرانی یاد نہیں دلائیں گے۔ ہم لوگ ہنسی مذاق کے لیے جمع ہوتے تھے، کسی کی دِلآزاری کے لیے نہیں۔

شاہد کے بڑے بھائی منذر ہماری ان نشستوں میں کبھی شریک نہیں ہوتے تھے، البتّہ چھوٹے بھائی سراجدین احمد عُرف چھجّن باقاعدہ آتے۔ وہ خود بہت کم لکھتے تھے، لیکن ادبی ذوق ورثے میں ملا تھا اِس لیے شریکِ محفل ضرور ہوتے اور بحث و تمحیص میں حِصّہ لیتے تھے۔ اُن کا صحیح ذوق شکار تھا۔ بڑے بھائی کے ساتھ جنگلوں کی خاک چھانتے اور شیر کا شکار کھیلتے۔ ہرن، نیل گائے اور جھانک مار لاتے تھے۔ انھوں نے جم کاربٹ کے مضامین پڑھے تھے۔ ایک روز کہنے لگے: "اس نے شکار کم کھیلا اور مضامین زیادہ لکھّے ہیں اور بہت سی باتیں تو گھر بیٹھ کر اپنے دل سے لکھّی ہیں۔ اِن میں اکثر جگہ حقیقت کا رنگ مفقود ہے۔"

مَیں نے کہا: "پھر تم کیوں قلم نہیں اُٹھاتے۔ اپنے تجربات لکھ ڈالو۔"

کچھ اُن کو بھی جوش آگیا۔ چند دن بعد ایک طویل مضمون لے کر آئے۔ اس روز محفلِ موسیقی نہ جم سکی۔ چھجّن کا مضمون سُنا گیا۔ تبادلۂ خیالات ہُوا اور شاہد کے سپرد کر دیا گیا۔ پھر کیا تھا۔ سلسلہ چل پڑا۔ ہر ماہ اُن کا ایک مضمون چھپنے لگا۔ ساقی میں شائع ہونے والے بعض مضمونوں اور افسانوں کا نزول اسی انداز میں ہوتا تھا۔

امتیاز علی تاج اپنے چچا چھکّن کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے تھے۔ ایم اسلم نے 'مرزا جی' کے خاکے لکھ کر نام پیدا کیا تھا۔ شاہد نے مجھ سے کہا: "تم بھی ایک کردار پیدا کرو، لیکن دِلّی کے ماحول میں دِلّی والوں کی باتیں اس میں جھلک دکھائیں"۔ مَیں نے 'بھابی جان' کے عنوان سے مضامین لکھنے شروع کیے جو خوب مقبول ہوئے۔ ساقی میں سلسلہ چلتا رہا۔ دُوسرے رسائل نے فرمائش کی تو ان کی بھی تعمیل کر دی گئی۔ ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں تھا، لیکن جب کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہُوا تو زیادہ دِقّت نہیں ہوئی۔ تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ اِن کڑیوں کو ایک زنجیر میں مربُوط کر دیا گیا۔

محمود مورخ بھی روزانہ ساقی کے دفتر میں آتے اور آخر وقت تک جمے رہتے؛ حتّٰی کہ محفلِ موسیقی میں بھی شرکت کرتے، حالانکہ وہ ایک لحاظ سے قابلِ رحم تھے۔ پانچ چھ سال کی عُمر میں بالکل بہرے ہو گئے تھے۔ سادہ کاغذ اور ایک پنسل ہمیشہ ساتھ رکھتے۔ جب کسی سے بات کرنے لگتے تو کاغذ پنسل اس کے سامنے بڑھا دیتے کہ جو کچھ کہنا ہے، لکھ دو۔ وہ صرف بہرے تھے گُونگے نہیں تھے۔ بولتے اور بلند آواز میں بولتے تھے، لیکن عموماً گفتگو کے وقت خود اپنی بات بھی کاغذ پر لکھنی چاہتے تھے۔ شاہد اس حرکت پر انہیں ڈانٹ دیتے کہ جب تم بول سکتے ہو تو لکھتے کیوں ہو؛ حالانکہ قوّتِ سامعہ کے سلب ہو جانے کے بعد ان کی حِس اتنی تیز ہو گئی تھی کہ دوسرے شخص کے ہِلتے ہوئے ہونٹ دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ اس نے کیا کہا ہے۔ وہ انگریزی روزنامہ نیشنل کال کے نائب مُدیر تھے، لیکن دراصل اخبار کے پروف دیکھتے تھے۔ ان کی میز لائنو ٹائپ پریٹروں کے بالکل قریب تھی۔ سخت شور میں بھی وہ قریب بیٹھ کر پروف پڑھ لیتے۔ شورِ بے ہنگام اُن کے کام میں رخنہ انداز نہ ہوتا۔ اُن کے

اخبار میں فلمی اداکاروں کے قصے خوب چھپتے تھے۔ شاہد کے اصرار پر انہوں نے ان قصوں کو بہت دل پذیر انداز میں لکھنا شروع کیا۔ کچھ جاسوسی کہانیاں بھی ان سے لکھوائی گئیں۔ اس سے قبل وہ خشک مضامین تحریر کیا کرتے تھے جو زیادہ مقبول نہیں تھے۔ "ساقی" کے ساتھ اُن کا رشتہ تادیر قائم رہا۔ انہیں اپنی شریکِ حیات سے بہت دُکھ پہنچا تھا۔ آخر میں ان کی ستم رانیوں کا شکار ہو گئے۔ ان کی موت اچانک واقع ہوئی اور ایک معمّہ بن گئی۔ اُن دنوں اچانک مرنے والوں کا پوسٹ مارٹم شاذونادر ہی ہوتا تھا۔ تاوقتیکہ خود پولیس کو کسی واردات سے دلچسپی نہ ہو، یہ زحمت گوارا نہیں کی جاتی تھی؛ چنانچہ اُن کی موت کا سبب کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ بس کاتبِ تقدیر سے اتنی ہی لکھوا کر لائے تھے۔ اس کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا۔ ساقی میں اُن پر ایک نوحہ چھپ گیا۔ اُن کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ساقی بُک ڈپو سے شائع ہو کر رہ گیا۔ اب بالکل ناپید ہے۔

غالباً ۱۹۳۲ء کے شروع میں امتیاز علی تاج کا ڈرامہ انار کلی چھپا۔ ایک کتاب تبصرے کے لیے دفترِ ساقی میں آئی۔ شاہد نے خود مطالعہ کیا پھر اسے باآوازِ بلند محفلِ ساقی میں پڑھا گیا۔ اس پر تبادلۂ خیالات ہوا اور طے پایا کہ اس پر کڑی تنقید کی جائے اور سب اس میں شریک ہوں۔ ایک دن اس کام کے لیے مقرر ہو گیا۔ سب نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔ افضل حسین چشتی نے، جو سائنسی افسانے ساقی میں لکھتے رہتے تھے، علامہ مضحک دہلوی کا قلمی نام اختیار کیا اور تنقید کا مسوّدہ تیار کر لیا۔ وہ بھی محفل میں پڑھا گیا اور پنچوں کی رائے زنی اور مناسب تبدیلیوں کے بعد ساقی میں شائع کر دیا گیا۔ لاہور کی ادبی محفلوں میں ہل چل مچ گئی۔ اُس زمانے میں رسالہ

"نیرنگِ خیال" بہت اُونچا جا رہا تھا۔ حکیم یوسف حسن نے تاجؔ اور ان کے سب ساتھیوں کو جمع کیا تاکہ ساقی میں شائع ہونے والے مضمون کا مُنہ توڑ جواب دیا جائے۔ وہاں بھی یہی صورت رہی۔ تاجؔ کے علاوہ پطرسؔ، تاثیرؔ، مجید ملک اور سالک وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مشترک مضمون لکھا گیا جو "نیرنگِ خیال" میں شائع ہوُا۔

ہم لوگوں کے لیے یہ حربہ غیر متوقّع نہیں تھا۔ جواب کے لیے تیاّریاں شروع کر دی گئیں۔ پھر کیا تھا۔ جوابُ الجواب کا سلسلہ کئی مہینے تک چلتا رہا۔ جب ادبی تنقید کی منزل سے ہٹ کر دِل آزاری کی صورت پیدا ہونے لگی تو باہمی تصفیے سے اسے ختم کر دینا ہی پڑا۔ اس ادبی نوک جھونک سے "ساقی" کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اس کی اشاعت ایک دم بڑھ گئی اور بڑھتی چلی گئی۔

پھر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ لاہور کے ادبی حلقوں میں صحیح ردِّ عمل ان تبصروں کا کیا تھا، شاہد، مَیں، انصارؔ اور ولایتؔ مارچ ۱۹۳۳ء میں لاہور گئے۔ ممتاز حسین پہلے سے وہاں ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخل تھے۔ ہمارا قیام ایم اسلم کے عشرت کدے پر ہوُا۔ اُنہوں نے مسلسل دو دن تک اپنی بے پناہ محبّت اور بے پایاں خلوص سے ہم سب پر بُری طرح "ستم ڈھایا۔" ستم اس لیے کہ وہ اپنی دانست میں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہم میں سے ہر شخص کی خوراک گاما پہلوان کی خوراک سے کم نہ ہوگی، — اور یہاں صورت یہ تھی کہ آدھا فالسہ کھا کر پُورا دن گزار دینا جانتے تھے۔ ایک روز مجھے میاں اسلم سے کہہ دینا ہی پڑا کہ حضرت، ہم دِلّی والے ہیں، ہم تو پانی بھی چبا کر پیتے ہیں کہ کہیں بدہضمی نہ ہو جائے اور آپ اتنے مختلفُ النوع کھانوں کا اہتمام کرتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کا شمار تک مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم میں سب سے کم خوراک

شاہد کی تھی اور سب سے زیادہ بلانوش پیر ولایت حسین تھے، لیکن اسلم کے ہاں انہوں نے بھی پناہ مانگ لی۔

اسلم چاہتے تھے کہ ہم لوگ لاہور میں کسی اور سے نہ ملیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ آپ جس سے ملنا چاہیں گے، مَیں اس کو یہاں بلالوں گا۔ تاثیر، بارود خانے میں ان کے دیوان خانے کے قریب ہی رہتے تھے۔ وہ پہلے ہی دن دوبار آگئے تھے۔ پھر ایک روز میزبان بن کر اسلم نے سبھی ادیبوں کو مدعو کر لیا۔ بڑی گہما گہمی رہی، لیکن ہمارا دِلی منشا پورا نہ ہو سکا۔ ہم چاہتے تھے کہ الگ الگ سب سے پوری بے تکلفی کے ساتھ ملیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں؛ لہٰذا طے پایا کہ دوسرے روز ناشتہ کرنے کے فوراً بعد چلا جائے اور میاں اسلم کی کوئی بات نہ مانی جائے۔ چنانچہ لاہور پہنچنے کے چوتھے دن ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے اپنے معزز میزبان سے کہہ دیا کہ آج ہم لوگ مختلف ادیبوں اور فن کاروں سے الگ الگ ان کے ہاں جا کر ملیں گے۔ انہوں نے منع کرنا چاہا، لیکن ہمارے اصرار کے سامنے زِچ ہو گئے اور خود بھی ہمراہ چلنے کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔ فرمایا:

"یہ بات تھی تو رات ہی کہہ دیتے۔ مَیں موٹر گاڑی کا انتظام کر لیتا۔ اب تانگے میں جانا پڑے گا۔"

ہم نے اگلے چار دن میں تاجؔ، پطرسؔ، یوسف حسن، سالکؔ، اخترؔ شیرانی، آغا حشرؔ، شمیمؔ حسین، تاجورؔ نجیب آبادی، میاں بشیر احمد اور منصور احمد وغیرہ سے ملاقاتیں کیں۔ ان کی یاد کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ شاہد نے انگریزی ادب میں آنرز کیا تھا، لیکن اُن کا مطالعہ اُس وقت تک درسی کتابوں تک محدود رہا تھا۔ تاجؔ سے گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا مبلغِ علم کتنا وسیع ہے۔ قدیم و جدید ادب

پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان سے اور آغا حشر سے ہماری ملاقاتیں پُرلُطف ہونے کے علاوہ مفید بھی ثابت ہوئیں۔ ہم نے ان دونوں بزرگوں سے بہت کچھ سیکھ لیا۔ آغا حشر کے ساتھ ڈیڑھ دن کی نشست کا حال تو مَیں نے ایک مضمون کی صورت میں لکھ دیا جو ساقی میں شائع ہوا جو خود آغا حشر نے بہت پسند کیا۔

ان چار دنوں میں کہیں بھی "انار کلی" پر تنقیدوں کا ذکر نہیں ہوا۔ کسی کی زبان پر حرفِ شکایت تک نہ آیا۔ تاجؔ نے سب سے زیادہ رواداری کا ثبوت دیا۔ شاہد نے "ساقی" کی اگلی اشاعت میں اس سفر کا حال لکھتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا۔ شاہد کا خیال تھا کہ "ساقی" میں شائع ہونے والی تنقیدوں کو بجنسہٖ اور "نیاز مندانِ لاہور" کی جانب سے لکھے جانے والے جوابات کے خلاصے کتابی صورت میں شائع کر دیے جائیں، لیکن بعد میں یہ ارادہ ترک کر دینا پڑا۔

ساقی کے دفتر میں ہم سب کی نشستیں ایک ایسا معمول بن گئی تھیں کہ گھر والے بھی اس کو اچھّی طرح سمجھنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص خلافِ معمول کسی روز ذرا پہلے گھر پہنچ جاتا تو خیریت پُوچھی جاتی۔ بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا جاتا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کہیں نصیبِ دُشمناں طبیعت تو خراب نہیں ہے۔ اُدھر دفتر ساقی میں تشویش ہوتی کہ کہیں ہمارا ساتھی کسی کے بہکائے میں آکر آج دفتر سے اُٹھتے ہی سیدھا اپنے گھر تو نہیں چلا گیا۔ دوسرے دن جواب طلب کیا جاتا۔ معقول جواب نہ مِلنے کی صورت میں جرمانہ ہوتا اور جرمانہ یہ کہ مجرم ایک فلم سب کو دکھاتا۔ ایسا فلم عموماً ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب کو دوسرے شو میں دیکھا جاتا اور اُس روز باقی رات دفتر ساقی میں بسر ہوتی۔ نیند کسی کو نہ آتی۔ ہنسی مذاق کرتے ساری رات آنکھوں

میں کٹ جاتی۔

ان موقعوں کے علاوہ بھی "ساقی خانے" میں رتجگا رہتا۔ مثلاً جب ساقی کا نیا شمارہ پریس سے آنے والا ہوتا تو ایک دن پہلے اطلاع مل جاتی تاکہ سب لوگ اپنے اپنے گھروالوں یعنی والدین کو مطلع کر دیں کہ ہمارا انتظار نہ کیا جائے۔ شاہد کے سوا ہم میں سے کسی کی بھی شادی اُس وقت تک نہ ہوئی تھی۔ بیویوں سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں تھا، لیکن اولاد کے انتظار میں جاگتے رہنے والی ماؤں کو بتانا ضروری ہوتا تھا کہ آج ہم نہیں آئیں گے تاکہ وہ مطمئن ہو کر ستاروں کو سو جانے کی تلقین کرتی ہوئی خود بھی سو جائیں۔

اُس روز پروگرام کچھ اس طرح بنتا کہ شام کی چائے کے وقت گرما گرم جلیبیاں اور سموسے کھائے جاتے۔ شاہد کو یہ دونوں چیزیں مرغوب تھیں اور شام کے وقت کٹڑہ بڑیان کے علاقے میں، جہاں وہ رہتے تھے، یہ روزانہ تلی جاتی تھیں۔ چائے دفتر ساقی ہی میں بنتی، روزانہ بنتی اور ہر وقت بنتی رہتی۔ ایک بہت بڑی کیتلی، بلکہ کیتلا چولہے پر چڑھا رہتا تھا۔ جب جی چاہا، چائے دانی میں پتّی ڈالی اور تازہ دم چائے بنا لی۔ کیتلی واقعی اتنی بڑی تھی کہ موسمِ سرما میں نہانے تک کا پانی اس میں گرم ہو جاتا تھا۔

چائے پانی سے فارغ ہو کر موسیقی کا پروگرام شروع ہو جاتا جو خلّب بادا پر آ کر ختم ہوتا۔ پھر پہلے شو میں ہم سب لوگ چلے جاتے۔ وہاں ٹکٹ ایک شخص خریدتا، دوسرا چائے اور اس کے ساتھ دہی بڑے، قلمی بڑے، سیخ یا مچھلی کے کباب منگا لیتا۔ روٹی بالکل نہ کھائی جاتی، کیونکہ پھر کام کرنا اور جاگنا مشکل ہو جاتا تھا۔ فلم دیکھنے کے بعد واپس دفتر ساقی میں آتے، چائے کا تیسرا دور چلتا اور سب کام پہ لگ جاتے۔ کلرک پتوں

کے ریپر تیار کر کے چھوڑ جاتا تھا، لیکن شاہد پھر بھی کچھ پتے اپنے حافظے کے سہارے لکھتے۔ خریداروں کے نہیں، جان پہچان والوں کے، جن کے نام کسی رجسٹر میں درج نہیں تھے۔ اس لیے وہ خود ہی لکھتے تھے۔ اُن کی یہ عادت آخر وقت تک نہ گئی۔ وفات سے چند دن پہلے میں اُن کے گھر گیا تو وہ آخری شمارے کے پتے ریپروں پر لکھ رہے تھے۔

ہاں تو اُس رات دو ڈھائی بجے تک رسالہ لپیٹا جاتا۔ اس دوران میں سازوں کے بغیر گانا ہوتا رہتا۔ زیادہ تر کوئی بے تکا راگ جس میں میں اور ممتاز تک حصّہ لیتے تھے۔ تین بجے آخری چائے پی کر سونے کی کوشش کی جاتی، لیکن کسی کی کوشش کامیاب نہ رہتی۔ اُس روز شاہد کی بیگم بھی اکیلی ہی سوتی تھیں، کیونکہ شاہد بھی دفتر ساقی میں کسی ایجنٹ کے نام جانے والے رسالوں کے بڑے سے بنڈل کو تکیہ بنا کر لیٹ جاتے تھے ـــــ ہائے! کیا دن تھے۔ کسی سُہانے موسم کی آخری رات میں دیکھے ہوئے دل نشین خواب کی مانند زندگیاں گزر رہی تھیں۔

اختر حسین رائے پوری کا ایک مقالہ رسالہ "نگار" میں شائع ہوا، تو ادبی حلقوں میں اس نے تہلکہ مچا دیا۔ ان کے قول کے مطابق وہ اُردو زبان میں ان کی پہلی کوشش تھی، لیکن بڑی کامیاب تھی۔ اقبالؔ، ٹیگورؔ اور نذرُالاسلام کی شاعری کا موازنہ کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ آخرالذکر کی شاعری سب پر بھاری ہے۔ ٹیگور کو تیسرا درجہ دیا تھا۔ دفتر "ساقی" میں اس مضمون کو مِل کر پڑھا گیا اور تبادلۂ خیالات بھی ہوا۔ سب کا دِل چاہا کہ اِس شخص سے کسی طرح مِلا جائے یا کم سے کم یہ ہو کہ آئندہ اس کی تحریریں "ساقی" میں بھی شائع کی جائیں۔

شاہد نے علامہ نیاز فتح پوری کو خط لکھا کہ اختر حسین کا پتہ لکھ کر بھیج دیجیے۔ یاد دہانیوں کے باوجود وہاں سے کوئی جواب نہ آیا، لیکن ایک روز بالکل غیر متوقع طور پر خود اختر رائے پوری کا خط شاہد کے نام آگیا۔ لکھا تھا: "میں دِلّی آ رہا ہوں۔ کورونیشن ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ اُمید ہے کہ دفترِ "ساقی" میں آپ سے مُلاقات ہو گی۔"

خط پڑھ کر سب کو خوشی ہوئی، لیکن کچھ اَدھوری قسم کی، کیونکہ انھوں نے کسی تاریخ کا تعیّن نہیں کیا تھا۔ توقع تھی کہ دُوسرا خط ضرور آئے گا، لیکن ایک روز جو ہم سب حسبِ معمول دفتر "ساقی" میں جمع ہوئے، تو ایک خوبصورت سے اجنبی نوجوان کو وہاں بیٹھے دیکھا۔ ماتھا ٹھنکا۔ ہو نہ ہو، یہی شخص رائے پوری ہے۔ تعارف کرایا گیا تو اندازہ دُرست نکلا۔ یہ نشست بہت طویل رہی۔ باتیں بے حد دلچسپ تھیں۔ سب کا جی چاہا کہ ان کا سلسلہ زلفِ یار سے بھی دراز تر ہو جائے۔ اسی دَوران میں شاہد نے شاہجہانی ہوٹل سے کھانا منگوا لیا، کچھ لوازمہ گھر سے آگیا۔ اس طرح اختر کے اعزاز میں دعوت کی ایک ریہرسل ہو گئی۔

کھانے کے بعد بھی گفتگو ہوتی رہی۔ اُس روز طبلہ اور ہارمونیم نہیں نکالے گئے۔ حافظ یوسف بھی اُس روز آگئے تھے۔ خاموش بیٹھے رہے۔ اچانک شاہد کی نظر اُن پر پڑی۔ جس طرح گراموفون ریکارڈ پر ایک کُتّا بھونپو کے آگے اپنے آقا کی آواز سُننے کے لیے ہمہ تن گوش بن کر بیٹھا نظر آتا ہے، بالکل اسی طرح یوسف بھی کچھ بولے بغیر ٹکٹکی باندھے اختر کو گھُورتے رہے تھے۔ شاہد نے پُوچھا: "حافظ جی! کیا دیکھ رہے ہو؟"

اختر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا: "کیا بتاؤں، معشوق تو اچھّا ہے، لیکن ہونٹ ذرا موٹے ہیں۔"

بس کچھ نہ پُوچھیے ہم سب کا کیا حال ہوا۔ اچانک سب پر بجلی سی گر پڑی۔ اختر سے پہلی مُلاقات تھی جو رسمی تکلّفات کے دائرے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ شاہد تو کھسیانی ہنسی ہنس کر اپنی وہ خفّت مٹانے لگے جس کے براہِ راست وہ ذمّے دار نہیں تھے اور ہم سب کو گویا سانپ سُونگھ گیا تھا، لیکن خود اختر نے اس جُملے کا پُورا لُطف لیا۔ وہ ذرا سے تامّل کے بعد بے تحاشا ہنسے اور حافظ جی کی پیٹھ ٹھونک کر انہیں داد دینے لگے۔

اور جب کچھ عرصے کے بعد اختر کی شادی نیلی چھتری والے ظفر عمر کی صاحبزادی حمیدہ بیگم سے ہو گئی اور میری پہلی مُلاقات ان سے ہوئی تو مَیں نے یہ لطیفہ ان کو سُنا دیا۔ ہنستے ہنستے حمیدہ بہن کے پیٹ میں بَل پڑ گئے۔ انہوں نے کہا: "بھئی واللہ، تنقید ہو تو ایسی جچی تُلی ہو۔ کیا اس شخص سے ملنا کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ مَیں یہ جُملہ اُسی کی زبان سے سُننا چاہتی ہوں۔"

اسی سال کے وسط کا ذکر ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ شاہد تہمد اور بنیان میں اُکڑوں بیٹھے ڈاڑھی مُونڈ رہے تھے۔ مَیں اور مُمتاز اس انتظار میں تھے کہ وہ تیاری کر لیں، نیز انصار اور پیرجی آ جائیں تو پہلے شو میں فلم دیکھنے چلا جاتے۔ اتنے میں شاہد کا ملازم فیاض خاں اُوپر کی منزل میں آیا اور ایک کارڈ دکھا کر کہنے لگا: "اجی، ایک پگڑباز آئے ہیں اور کاغذ کا یہ ٹکڑا دیا ہے کہ شاہد احمد صاحب کو دے دو۔"

وزیٹنگ کارڈ پر لکھا تھا —— مُحمد رشن —— شاہد گھبرا گئے۔ کہنے لگے: "اب مَیں کیا کروں۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ مَیں شیو ختم کیے اور نہائے بغیر کپڑے پہن لوں۔ (اُن کے کپڑوں کی الماری دفترِ ساقی ہی کے ایک کونے میں رہتی تھی) اور یہ

ممکن بھی نہیں ہے کہ اس بانکے دھاڑے اس سے ملوں۔ وہ کیا رائے قائم کرے گا۔"

پھر وہ مجھ سے کہنے لگے: "تم شاہد بن جاؤ اور اسی حیثیت سے ملاقات کرو۔ اسے کیا خبر۔ خط وکتابت تو بہت ہوئی ہے لیکن ملاقات پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ وہ تم ہی کو شاہد سمجھ کر باتیں کرے گا، لیکن ذرا جلدی ٹال بھی دینا۔ کہیں فلم کا پروگرام فسخ نہ ہو جائے۔"

مَیں نے فوراً کہا: "نہیں، مجھ سے یہ اداکاری نہ ہوگی۔ ہنسی آ جائے گی۔ بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم کپڑے لے کر غسل خانے چلے جاؤ۔ باقی شیو وہیں کرنا اور نہا دھو کر کپڑے بدل کر آ جانا۔ اتنی دیر ہم دونوں اپنی اصل شخصیت کے ساتھ اس سے باتیں کرتے رہیں گے۔ چونکہ سُدرشن بغیر اطلاع کے آئے ہیں، اس لیے چند منٹ انہیں انتظار کرنا ہی پڑے گا۔"

شاہد نہ مانے۔ کہنے لگے۔ "اس شخص کی تحریر اچھی ہے، لیکن طبیعت کے اعتبار سے بُرا ہے۔ سخت متعصّب انسان ہے۔ اس سے نہ ملنا ہی بہتر ہے۔ جس طرح بھی ہو، ٹال کر اسے چلتا کر دو۔"

مَیں نے اپنی بَلا ممتاز کے سر ڈال دی۔ وہ راضی ہو گئے۔ شاہد ذرا کھسک کر کمرے کے آخری سِرے پر چلے گئے اور بدستور شیو کرتے رہے۔ سُدرشن کو اُوپر بُلایا گیا۔ ممتاز نے شاہد کی حیثیت سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سُدرشن ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ شاہد کا کہنا دُرست تھا۔ ہم لوگ ایک روز پریم چند سے ملنے گئے تھے تو اُنہوں نے بھی ہم سے مصافحہ نہیں کیا تھا۔ کٹّر ہندوؤں کو مسلمانوں سے ہاتھ ملانے میں بھی عار تھا۔

خیر، ہم لوگ بیٹھ گئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ وہ اپنی ایک کتاب کا ایک

نیا ایڈیشن مکتبۂ ساقی سے چھپوانا چاہتے تھے۔ اِس سلسلے میں شاہد کو خط بھی لکھا تھا جس کا کوئی جواب اُس وقت تک نہیں گیا تھا۔ ممتاز ایک دم مُکر گئے۔ "جی نہیں، آپ کا کوئی خط اس ضمن میں نہیں ملا۔"

سُدرشن ذرا چکرائے۔ "جی! کیا کہا۔ آپ نے پہلے خط کا جواب تو دیا تھا، لیکن مَیں نے دوسرے خط میں جو شرائط لکھیں، اُن کا جواب آپ نے نہیں دیا۔"

ممتاز نے فوراً بات بنائی: "جی ہاں، میرا مطلب اسی دوسرے خط سے ہے یعنی آپ کا کوئی شرائط نامہ نہیں آیا۔"

غالباً سُدرشن کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ کہنے لگے: "تو پھر ابھی سب باتیں طے ہو جانی چاہییں۔"

ممتاز زِچ ہونے والے نہیں تھے۔ فوراً بولے: "واہ پنڈت جی! ایسی شرطیں تو تحریر میں آنی ضروری ہوتی ہیں۔ پھر ان پر غور کرنا پڑتا ہے اور مَیں تو ایسی ہر چیز اپنے قانونی مشیر کے سپرد کر دیتا ہوں۔ آخری فیصلہ اُنہیں کرنا ہوتا ہے۔"

اب سُدرشن کے لیے اصرار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اجازت چاہی۔ ممتاز نے ذرا مہمان نوازی کا ثبوت دینے کے لیے کہا: "ابھی جلدی کیا ہے۔ چائے پانی تو پیتے جائیے۔" اور فوراً شرارت کے مُوڈ میں آ کر شاہد سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "ابے بُدّو! کب تک شیو کیے جائے گا۔ جا، اِن صاحب کے لیے چائے یا لیمن لے آ۔"

بھلا جو شخص مسلمان سے ہاتھ نہ ملائے، وہ اس کے گھر کی چائے کیسے پی سکتا تھا۔ سُدرشن تو ہاتھ جوڑ کر معذرت چاہنے لگے اور شاہد جو شیو ختم کر چکے تھے، "بہت اچھا سرکار"، کہہ کر غسل خانے چلے گئے۔ سُدرشن فوراً کھڑے ہو گئے اور

پہلے کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اُن کے جانے کے چند ہی منٹ بعد انصار اور پیر ولایت آ گئے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ ذرا پہلے نہ آتے، ورنہ ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور اپنی نادانستگی کے عالم میں اس راز کو فاش کرنے کا ذمّہ دار ہو جاتا۔ ولایت کا معمول تھا کہ وہ دفتر ساقی میں گھستے ہی شاہد کو دیکھ کر نعرہ لگاتے تھے: "کھوٹا ڈو بھائی، کیا حال ہے؟" انصار سے کم توقع ہو سکتی تھی، کیونکہ وہ وکیل تھے۔ پہلے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور شاید اس اداکاری پر پردہ پڑا رہتا۔

شام کی محفلوں میں شاہد — مرزا غالب، میر، ذوق اور ظفر کی غزلیں گا تو لیتے تھے، لیکن ذوق کی آسودگی انہیں نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اصل گانا تو راگ راگنیوں کا ہے، لہذا پکّا گانا سیکھنے کے لیے اُنہوں نے اُستادوں کی طرف رُخ کیا۔ اُن دنوں دِلّی میں چاند خاں اور رمضان خاں پکّا گانا گانے والوں میں بہت مشہور تھے۔ اُن کے بہت سے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ طبلہ بجانے والوں میں کاگو کا جواب نہیں تھا۔ مَیں نے اس فن کا ایسا کوئی اور باکمال نہیں دیکھا۔ استاد بُندو خاں صرف سارنگی بجاتے تھے۔ یُوں تو وہ نوابوں اور راجاؤں کی محفلوں میں بُلائے جاتے تھے لیکن عام لوگ بھی ان کے ساز کے اعجاز سے محروم نہیں رہتے تھے۔ خود ان کے مکان پر محفلیں جمتی تھیں جن میں باذوق لوگوں کو شرکت کے لیے اِذنِ عام تھا۔

شاہد شام کی نشست دفتر ساقی میں ختم کر کے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد روزانہ ان اُستادوں کے ہاں جانے لگے۔ چاند خاں کے ساتھ تو اُن کا باقاعدہ اُستادی شاگردی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ طبلہ بجانے کے بھی شوقین تھے۔ کاگو کے کمالات

کے معترف ہوئے، لیکن شاگرد نہیں بنے۔ کبھی کبھی ان سے استفادہ کرنے ان کی محفل میں چلے جاتے تھے۔ وہ بُندو خاں کا دل سے احترام کرتے تھے، لیکن سارنگی کے میدان میں قدم رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا؛ البتہ اُن کو اپنا اُستاد مانا اور ہمیشہ اُستاد ہی کہہ کر مخاطب کیا۔

جب اِن استادوں میں سے کسی کے ہاں بڑی محفل ہوتی تو شاہد مجھے، انصار، ممتاز اور پیرجی کو بھی گھسیٹ کر ساتھ لے جاتے۔ ہم میں سے کوئی بھی پکّا گانا سُننے کا دھنی نہ تھا۔ پیرجی کا گانا حلّب باد اتک محدود تھا اور انصار سیدھا سیدھا طبلہ بجا لیتے اور کبھی کسی گانے پر ذرا سر ہلا لیتے۔ مَیں اور ممتاز بالکل بھینس تھے۔ گانے والے سے غزل سُن کر صرف شعر کا لُطف لیتے، موسیقی کا نہیں، لیکن شاہد کی خاطر بعض راتیں کالی ضرور کرنی پڑتی تھیں۔ ممتاز کی شادی ہو چکی تھی، مگر باقی ہم تین کنوارے شُتر کی طرح بے مہار تھے اور جب صورت یہ ہو کہ "نہ جورو نہ جاتا۔ شاہد میاں سے ناتا"، تو پھر شاہد جہنّم میں بھی لے جاتے تو اُن کی خاطر وہاں جانے سے بھی اجتناب نہ ہوتا۔

ایک روز شام کی محفل میں شاہد نے غلام محی الدّین کو بُلا لیا جو عُرفِ عام میں گاما کہلاتے تھے۔ انہوں نے میرے، ممتاز اور انصار کے ساتھ میٹرک پاس کیا تھا۔ پھر ہم چاروں اپنے اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ ہو گئے تھے۔ محی الدّین اور انصار نے وکالت پاس کر لی تھی اور پریکٹس کرنے لگے تھے۔ گاما پکّا ہی نہیں پُختہ گانے کے ماہر تھے۔ یہ فن ان کی گھٹّی میں پڑا تھا۔ اُن کی والدہ اور ایک بہن دِلّی کی مشہور طوائفیں تھیں۔ اس لیے اُنہوں نے بھی گانے میں کمال حاصل کر لیا تھا، لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں کوئی نواب پُتلی کے بیٹے یا اقبال پُتلی کے بھائی

ہونے کے اعتبار سے سمجھے۔ وہ اپنا مقام الگ پیدا کرنے کے متمنّی تھے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی اور اُن کی بیگم سخت پردے کی پابند تھیں۔

وہ شاہد کے بُلانے پر محفل ساقی میں آئے۔ پہلے تو دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ نہایت پُر لُطف اور خوش مذاق انسان تھے۔ بہت عرصے بعد اُن سے ملنا ہُوا تھا۔ کُچھ دیر بعد گانا شروع ہُوا۔ وہ مُنہ سے ہی نہیں، جسم کے دوسرے اعضا سے بھی اظہارِ موسیقی کرتے تھے۔ یعنی جوش میں آکر اُن کے ہاتھ پاؤں بھی گلے کی سنگت کرتے۔ کبھی یہ معلوم ہوتا کہ وہ کسی کو ٹھوکر مار رہے ہیں اور کبھی محسوس ہوتا کہ فری اسٹائل کُشتی کی مشق کر رہے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے اُن کی طرف نہ دیکھتے ہوئے صرف سُنا جائے تو گمان ہوتا تھا کہ کوئی شخص تکلیف میں کراہ رہا ہے اور فریاد بھی کر رہا ہے۔

میں اطمینان سے گاؤ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ جب اُن کا گانا ختم ہوا تو مَیں نے پُرانی دوستی کے پیشِ نظر محض مذاق سے کہا: "یار گاما! آج تم نے بہت وقت ضائع کیا۔ یہ تمہارا گانا آخر کیا تھا۔ بچپن میں ہم اس سے اچھّا رو لیتے تھے اور اگر اب کوئی ثقیل چیز کھا لینے سے پیٹ میں درد ہو تو کچھ اسی قسم کا اظہار ہوتا ہے۔"

شاہد سمیت سب نے ایک قہقہہ لگا دیا، لیکن میرا جملہ گاما کے سینے میں چُبھ گیا۔ فن کار کے احساس کی رگ مجروح ہو گئی۔ وہ ناراض ہو کر ایک دم کھڑے ہو گئے اور شاہد سے کہنے لگے: "آپ بھی عجیب بد ذوق لوگوں کو اپنی محفل میں بُلاتے ہیں جن کو فن سمجھنے کا ذرا سلیقہ نہیں ہے۔ مَیں تو یہاں آکر پچھتایا۔ آئندہ کبھی نہ آؤں گا۔" یہ کہہ کر جانے لگے۔ مَیں نے بہت خوشامد کی۔ سب نے میرا ساتھ دیا اور اُن کو مجبور کر کے بٹھا لیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بیٹھ تو گئے، مگر پُھولے رہے۔ بہت دن کے بعد اُن کا غصّہ ٹھنڈا ہوا۔ پھر کبھی اُن کو چھیڑ کر رنگِ رُخ تک دیکھنے کی ہمت

مجھ میں نہ ہوئی۔ اُن کے ساتھ بے تکلّفی کے باعث یہ بات زبان پر آگئی تھی، ورنہ اتنی جرأت ممکن نہ تھی۔ یہ بات کسی اور فن کار کی شان میں نہیں کہی جاسکتی تھی۔ خدا معاف کرے، شاہد کے ساتھ جاکر پکّا گانا سُننے کی سزا کتنی بار بھگتنی پڑی تھی، لیکن حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ آیا تھا۔

موسیقی کی بڑی محفلیں شاہد کے گھر پر بھی ہونے لگی تھیں جن میں اُستاد، شاگرد، نئے سیکھنے اور سُننے والوں میں مجھ جیسے بدذوق سبھی شامل ہوتے تھے۔ ایک روز قاضی عباس حسین ظریف دہلوی مجھ سے کہنے لگے: "یہ بہت بُری بات ہے کہ تم محفل میں بالکل بُت بنے بیٹھے رہتے ہو۔ جس طرح مشاعرے میں اکثر لوگ شعر کو پُوری طرح سُنے بغیر بڑھ چڑھ کر داد دینے کے انداز میں واہ وا کے نعرے لگاتے ہیں تاکہ اپنی قابلیت، بصیرت اور سُخن فہمی کا ثبوت دیں، اسی طرح تم بھی ذرا کھوپڑی مٹکا کر اور کبھی کبھی شانوں کو ہلا کر گانے والے کی ہمّت بڑھایا کرو۔"

مَیں نے کہا: "بہت اچھا۔ آئندہ آپ کے اس قیمتی مشورے پر عمل کرونگا۔"

شاہد ہنس پڑے۔ انہیں پچھلی واردات یاد آگئی۔ کہنے لگے: "اگر محفل میں گاما موجود ہو تو ایسی حرکت نہ کرنا۔ وہ پھر ناراض ہو جائے گا۔"

کوئی ایک ماہ بعد خود ظریف دہلوی کے مکان پر محفل منعقد ہوئی۔ وہ شاہد کی زنانہ و مردانہ حویلیوں کے درمیان ایک مکان میں رہتے تھے۔ اُن کی بڑی لڑکی نجم کی شادی تھی۔ شادی سے لے کر زچگی، عقیقے یا ختنے کی رسم ادا ہونے تک، خوشی کے موقعوں پر مشاعرے ہوتے تھے یا موسیقی کی محفلیں برپا کی جاتی تھیں؛ چنانچہ قاضی جی نے، جو اُس وقت تک پختہ شاعر نہیں ہوئے تھے، اِس روایت

کا خیال رکھتے ہوئے شاہد سے درخواست کی کہ محفلِ موسیقی کا انتظام کریں۔ ان کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ شاید خیال کو الفاظ کی صورت اختیار کرنے میں دیر لگے، شاہد کے لیے موسیقی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں لگتی تھی؛ چنانچہ شام کو ظریف دہلوی کی طرف سے اشارہ ملتے ہی رات کی محفل کا اہتمام کر لیا گیا۔ اُس روز دُلہن کا چالا تھا۔ جو مہمان آئے ہوئے تھے اُنھیں زبانی کہہ دیا گیا کہ کھانے کے بعد ٹھہر جائیں۔

مَیں اس محفل میں شاہد کے قریب بیٹھا تھا۔ غیر شعوری طور پر قاضی جی کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ سر مٹکایا، شانے ہلاتے اور طبلے پر تھاپ دینے کے انداز میں اُنگلیوں کو حرکت بھی دی۔ رمضان خاں نے، جو اس جلسے کے مہتمم تھے اور مجھے بارہا شاہد کے ساتھ محفلوں میں دیکھ چکے تھے، ہارمونیم میرے سامنے سرکا دیا اور فرمایا:
"آپ بھی کچھ عطا کیجیے۔"

مَیں گھبرا گیا۔ کیسے کہوں کہ آپ غلط سمجھے ہیں۔ مَیں نے کنکھیوں سے شاہد کی طرف دیکھا۔ وہ زیرِ لب مسکرا رہے تھے اور قاضی جی بھی دل ہی دل میں خوش تھے کہ بُرا پھنسا ہے اب دیکھیں، اس بلا کو کس طرح ٹالتا ہے۔

مَیں نے حواس مجتمع کر کے نہایت سنجیدگی سے کہا: "جی، ابھی نہیں۔ پہلے اُستادانِ فن اپنے کمالات دکھالیں۔ تب میری باری آئے گی۔ مَیں تو صرف ایک ہی راگ جانتا ہوں، اس کا نام ہے، محفل اُکھاڑ، کیوں کہ جب میرا ٹینٹوا اپنا رنگ جمانا شروع کرتا ہے تو جمی جمائی محفل برخاست ہو جاتی ہے۔ اس لیے ابھی دُوسروں کو اپنا ذوق پُورا کرنے دیجیے۔"

میرا یہ بیان رمضان خاں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ اس کا

مطلب کیا ہے۔ شاہد نے ہنس کر ہارمونیم اپنی طرف کھسکا لیا اور اس طرح میری جان بچ گئی۔ اس کے بعد مَیں نے پھر کبھی ظریف دہلوی کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔

شاہد کی چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ باہر سے بُلائے جانے والے مہمانوں میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کو بھی دعوت دی گئی۔ اُمّید نہ تھی کہ وہ آئیں گے۔ ادبی مشاغل کے علاوہ عدالتِ عالیہ میں ججی کے فرائض ادا کرنے سے اُن کو بمشکل فرصت ملتی تھی۔ اس سے قبل وہ تنِ تنہا دو تین بار دِلّی آ چکے تھے، مگر ایک ایک دو دو دن کے لیے اس دفعہ آئے تو بیوی بچّوں سمیت اور پُورے ایک ہفتے کے لیے بغیر اطّلاع آ گئے۔

فوراً شاہد کا پرچہ دہلی میونسپل کمیٹی کے دفتر میں میرے پاس پہنچا۔ لکّھا تھا:
"چغتائی آ گئے ہیں، اُن کا حکم ہے کہ تم ایک ہفتے کے لیے بیمار بن جاؤ۔ ڈاکٹری سرٹیفیکیٹ دے کر رخصت لے لو۔ گھر والوں سے بھی کہہ دو کہ ایک ہفتے کی جُدائی گوارا کر لیں۔ رات دن دفترِ ساقی میں رہنا ہو گا یا جو بھی پروگرام بنے اس پر عمل کرنا ہو گا۔"

میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس حکم کی سرتابی کرتا۔ سیدھا ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی کے مطب میں گیا۔ وہ پُرانے کرم فرما تھے۔ شاہد کے غالباً ہم جماعت تھے۔ وہ ان کا احترام کرتے تھے۔ مَیں نے بے کم و کاست اصل بات گوش گزار کر دی۔ وہ ہنسے اور کہنے لگے: "مَیں کون سی بیماری لکھوں، تم تو بالکل تندرست ہو اور جب آج تک دفتر میں کام کیا ہے تو ایسی کون سی بیماری تشخیص کروں جو فوراً مان

لی جائے۔"

میں نے مذاق میں کہا: "آپ لکھ دیجیے چغتائی ہو گئی ہے۔ میرا سپرنٹنڈنٹ بہت گھامڑ انسان ہے۔ سمجھے گا کہ ہیضے کی طرح کی کوئی بیماری ہے جو اچانک لاحق ہوتی ہو گی۔"

بہرنوع انہوں نے شدید بخار، دردِ سر، غشی اور سرسامی کیفیت لکھ کر سرٹیفکیٹ دے دیا۔ گھر والوں سے بھی کہہ دیا گیا کہ ہم ایک ہفتے تک نہیں آئیں گے۔ والدہ کچھ جزبز ہوئیں، مگر ان کو منا کر خاموش کر دیا گیا۔

دو روز شادی کے ہنگاموں میں سب گھرے رہے۔ شاہد کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ بہن رخصت ہو گئیں تو چوتھی چالے کا کام انہوں نے دُوسرے بھائیوں کے سپرد کر دیا۔ چغتائی بھی اسی انتظار میں تھے۔ دو روز تک تاریخی مقامات کی سیر ہوتی رہی۔ دِلّی والوں کے لیے تو ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں تھی۔ ہر جگہ کو سَو سَو سے زیادہ مرتبہ دیکھا ہو گا، لیکن چغتائی کی خاطر سب کو ساتھ جانا پڑتا تھا، البتہ سَیر کے دَوران میں چغتائی کے لطیفے اور چٹکلے لُطف دے جاتے تھے۔

ایک روز سب تھک تھکا کر چُور ہو چکے تھے۔ جلد سو جانا چاہتے تھے، لیکن چغتائی کی نیند غائب تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ باتیں ہوتی رہیں۔ شاہد نے مین سُوئچ بند کرا کے اُن سے کہہ دیا کہ کرنٹ جاتا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ تو خراٹے لینے لگے اور ہم سب کو بھی تھوڑے وقفے سے نیند آ گئی، لیکن چغتائی نہیں سوئے۔ رات کے شاید دو بجے ہوں گے کہ انہوں نے جھنجھوڑ کر شاہد کو جگا دیا: "اُٹھو اور سب کو اُٹھاؤ۔ ایک ضروری مسئلہ ہے اس پر تبادلۂ خیالات کرنا ہے"۔ شاہد نے "اللہ خیر کرے" کہہ کر کروٹ لی اور مجھے جگا دیا، اور جب دُوسرے

ساتھی بھی جاگ گئے تو چغتائی بولے: "دیکھو، زمانہ خوب ترقی کر گیا ہے، لیکن بہت سی باتوں میں ہم لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ اب حروف ابجد اور ان کے اعداد کو لو۔ صرف عربی قاعدہ اپناتے ہوئے ہیں، حالانکہ اُردو میں بہت سے حروف ایسے ہیں جو عربی زبان میں نہیں ہیں۔ مجبوراً پ کی جگہ ب کے، ٹ کی جگہ ت کے، چ کی جگہ ج کے اور اسی طرح کچھ حروف کی جگہ دوسرے حروف کے اعداد حساب لگاتے وقت شمار کیے جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟ مناسب یہ ہے کہ اُردو کے فالتو حروف کو الگ نمبر دیے جائیں اور ان کو انہی الفاظ کے بیچ بیچ میں گھسیڑا جائے یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے۔ اس ضمن میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟"

انہوں نے بالکل ایسے استفسار کیا جیسے جیوری کے لوگوں سے جج دریافت کرتا ہے۔ آخر کو جودھ پور کے چیف جج تھے۔ شاہد کچھ ناراض سے ہوئے "لاحول ولا۔ آپ کو اس اندھیرے میں بڑی دُور کی سُوجھی۔ سب کی نیند خراب کر دی۔ یہ باتیں صبح بھی ہو سکتی تھیں۔ سارا دن پڑا تھا۔"

مَیں نے اور ممتاز نے شاہد کی تائید کی۔ انصار ٹھیرے وکیل۔ انہیں ہر وقت ایک مؤکّل کی ضرورت رہتی تھی۔ انہوں نے بلا فیس چغتائی کی وکالت کرنا مناسب سمجھا۔ بحث اصل موضوع پر نہیں ہوئی، بلکہ صرف اس پہلو پر کہ اس کام کے لیے آدھی رات کا وقت مناسب تھا یا نہیں۔ اندھیرے میں لیٹے لیٹے کوئی ایک گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ حتّٰی کہ جب پڑوس کے مرغوں نے اور محلّے کی مسجد کے مؤذّن نے ایک ساتھ اذان دی تو سب کو دوبارہ نیند آ گئی۔ اس بحث میں حَلَب بادلنے حصّہ نہیں لیا۔ وہ مسلسل سوتے اور اپنی عادت کے مطابق تکیے پر رال بہاتے رہے۔

صبح کی نمود اپنے صحیح وقت پر ہوئی، لیکن دفتر ساقی میں کافی دیر کے

بعد ــــــ اُس روز نمازِ فجر بھی کسی نے ادا نہیں کی۔ ساڑھے آٹھ بجے ناشتے کے لیے دسترخوان بچھا تو ہم سب چغتائی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ غسل خانے میں ایسے گھُسے کہ نکلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے اور جب نکل کر آئے تو ہم سب انہیں دیکھتے رہ گئے۔ ایک ہاتھ میں لوٹا اور دوسرے ہاتھ سے کمر بند تھامے ہوئے۔ پاجامہ باندھا نہیں تھا۔ دُور ہی سے چیخنا شروع کیا: "ہو گیا۔ شاہد ہو گیا۔ مزا آگیا، واللہ!"

شاہد نے گھبرا کر کہا: "ارے بھئی، خیر تو ہے۔ ذرا وضاحت کیجیے۔ کیا ہو گیا؟ کہاں ہو گیا؟"

چغتائی نے پانی کا بھرا ہوا لوٹا شاہد کے ہاتھ میں تھما دیا اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ شاہد بول پڑے: "تم طہارت سے بھی فارغ ہو لیے تھے یا کمر بند پکڑ کر یُونہی چلے آئے۔ کہیں بیگم صاحبہ کو کپڑے دھونے نہ پڑ جائیں۔"

انہوں نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ بولے: "رات کو جو گفتگو ناتمام رہ گئی تھی، یعنی وہ حروفِ ابجد اور ان کے اعداد کا مسئلہ، وہ مَیں نے تنہا حل کر لیا ہے۔"

ہم سب بے تحاشا ہنس پڑے۔ شاہد نے اس کامیابی پر اُن کو فوراً مبارکباد دی، اور کہا: "آؤ۔ اب ناشتہ کر لو۔"

وہ بولے: "ابھی نہیں۔ کچھ کسر باقی ہے۔ اپنے خیالات کو لکھ لُوں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی کڑی زنجیرِ ذہن سے نکل جائے۔ ناشتہ بعد میں ہو گا۔ مَیں پہلے مضمون لکھوں گا۔"

چنانچہ وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گئے۔ وہ لکھتے اور ہم سب ان کو لکھتے ہوئے دیکھتے رہے۔ قلم کی رفتار بہت جِنّاتی قسم کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی

نوک پر کوئی ایٹم لگادیا گیا ہے۔ چغتائی لکھتے وقت خوب کاٹتے اور حاشیوں پر اصل متن سے زیادہ عبارت لکھتے تھے۔ اسی لیے خوش نویس ان کے مضمون یا افسانے کی کتابت کرتے وقت ان کی جان کو روتے تھے، لیکن اس مضمون کا مسوّدہ تیز رفتاریٔ قلم کے باوجود صاف تھا۔ بہت کم کاٹ چھانٹ ہوئی تھی۔ پندرہ منٹ میں ساقی کے ساڑھے تین صفحات کا مضمون لکھ کر شاہد کے حوالے کر دیا۔ کہنے لگے:
"لو، اگلے شمارے کے لیے ہے۔ کیا یاد کرو گے۔ اسے اپنی بہن کے نام معنون کر دینا۔ یہ اُن کے لیے شادی کا ادبی تحفہ ہے۔"

پھر بولے: "تم سب ابجد، ہوّز، حطّی وغیرہ کی گردان کرلو۔ سب جگہ کومے لگے ہوئے ہیں۔ فُل اسٹاپ کہیں نہیں ہے۔ اب مَیں نے فُل اسٹاپ لگایا ہے۔ ان تمام حروف کو مِلا کر جو عربی میں نہیں ہوتے ایک آخری لفظ بنا دیا ہے —— چیپٹر ڈ گژ —— کیوں کیسی کہی۔" پھر انھوں نے جملہ الفاظ دُہراتے ہوتے اپنے آخری لفظ پر زور دے کر اسے خوب کھینچا جیسے شِشکاری دی جا رہی ہو۔ شاہد نے مضمون بغیر دیکھے اس لفافے میں ڈال دیا جو کاتب کے لیے رکھّا رہتا تھا۔ اس کے بعد دفتر ساقی میں ناشتے کا دَور چلا۔

اُسی روز طے پایا کہ شام کو چغتائی کے ساتھ یارانِ ساقی کی ایک تصویر کھنچ جائے تاکہ اس ملاقات کی یادگار قائم رہے، لیکن انصار اور پیر ولایت شام کو نہ آ سکے۔ آخر شاہد، چغتائی، مَیں اور ممتاز تانگہ لے کر رام ناتھ کے ہاں پہنچے۔ وہ اُن دنوں دلّی کے سب سے اچھے فوٹو گرافر سمجھے جاتے تھے۔ چغتائی اور ممتاز سُوٹ میں تھے۔ وہ کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مَیں اور شاہد شیروانی میں تھے۔ ہم پیچھے کھڑے ہو گئے۔ چغتائی کچھ تھکے ہوتے سے انداز میں سر ایک طرف لٹکا کر بیٹھ گئے۔ شاہد نے فوراً

رام ناتھ کو اشارہ کیا۔ وہ خود بھی اس صورت پر نظر جمائے ہوئے تھے۔ انھوں نے قریب آکر سر کو سیدھا کر دیا، لیکن جب وہ کیمرے کے قریب واپس گئے تو چغتائی نے سابقہ اندازِ نشست اختیار کر لیا۔ رام ناتھ پھر پلٹے تو چغتائی ایک دم بکھر گئے۔ "یہ سر میرا ہے یا آپ کا۔ مَیں سیدھا رکھوں یا ٹیڑھا۔ آپ کو کیا۔"

رام ناتھ عمدہ فوٹو گرافر ہونے کے علاوہ نہایت خوش مذاق انسان بھی تھے۔ ہنس کر بولے: "آپ کہیں تو مَیں اسے آپ کی گود میں رکھا ہوا یا شاہد بھائی کے کندھوں پر رکھا ہوا دکھا دوں تاکہ جدید آرٹ کا ایک نمونہ نظر آئے، لیکن بصورتِ موجودہ لوگ فوٹو گرافر کو گالیاں دیں گے کہ ایک اچھے خاصے انسان کو خدا جانے کیا بنا دیا یا وہ سمجھیں گے کہ تصویر کھنچوانے والے نے یہ سر کہیں سے مستعار لیا ہے جبھی تو شانوں پر ٹھیک طرح لگا نہیں آیا۔"

مَیں رام ناتھ کو پہلے ہی بتا چکا تھا کہ یہ حضرت مرزا عظیم بیگ چغتائی ہیں۔ وہ ساقی کے خریدار تھے اور چغتائی کے مضامین پڑھتے رہتے تھے۔ چغتائی ان کے اس جملے پر تڑپ اُٹھے۔ کھڑے ہو کر ان کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگے: "اب آپ سَو بار میری گردن مروڑیے۔ مَیں ہرگز کچھ نہ کہوں گا۔"

رام ناتھ نے سر کو زاویۂ مستقیم پر ٹھہرا دیا، لیکن وہ پھر بھی زاویۂ حادہ پر آ کر رہ گیا۔ تصویر اسی طرح اُتری۔ دُوسرا نقص یہ تھا کہ اُوپر کی دو دو ڈاڑھیں غائب ہونے کے باعث چغتائی کے گال کچھ پچک گئے تھے۔ دوسرے روز پروف دیکھا تو تصویر میں یہ نقص نظر آیا۔ شکایت کی گئی تو رام ناتھ بولے: "یہ جناب آپ کا کام تھا کہ دونوں کلّوں میں قیمہ دبا کر آتے تاکہ وہ کلچوں کی طرح پھولے ہوئے نظر آتے۔"

شاہد بولے: "پنڈت جی! آپ ایسے لوگوں کے لیے اپنے اسٹوڈیو میں رَس گلّے رکھا کریں۔ ایک ایک دونوں طرف دبا لیا اور تصویر کھنچوالی، لیکن شرط یہ ہے کہ ساتھ آنے والوں کا خیال رکھا جائے۔ وہ اس نعمت سے محروم نہ رہا کریں۔"

اختر حسین رائے پوری پہلی بار صرف دو دن کے لیے دہلی آئے تو کورونیشن ہوٹل میں ٹھہرے۔ دوبارہ آنے کا انہوں نے پروگرام بنایا تو پہلے سے شاہد کو لکھا کہ اس ہوٹل میں ایک ہنگامہ رہتا ہے، سکون نصیب نہیں ہوتا۔ قیام کے لیے کسی ایسی جگہ کا انتظام کرا دیجیے جہاں تنہائی اور خاموشی میسّر آ سکے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ وہاں رہ کر دو چار افسانے لکھوں۔ شاہد کی گویا مراد بر آئی۔ جب تاریخ مقررہ پر اختر آئے تو ان کو ریل گاڑی سے اُتار کر دفتر ساقی میں لے آئے۔ کلرک والے کمرے کے قریب ایک کشادہ کوٹھڑی تھی جس میں کچھ پُرانا سامان بھرا ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی سے نکلوا کر چھت پر ڈلوا دیا تھا اور اچھی طرح صفائی کرا کے ایک پلنگ بچھوا دیا تھا۔ میز کرسی بھی لگوا دی تھی۔ اختر کو وہ "گوشۂ عافیت" بہت پسند آیا۔ ایک جانب گلی تھی، لیکن وہاں نہ بچّے شور مچاتے تھے اور نہ سودے والوں کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ دن کے وقت بھی رات کا سا سکوت، بلکہ سنّاٹا پایا جاتا تھا۔ اختر وہاں صرف رہنے لگے۔ انہوں نے شاہد سے کہہ دیا کہ کھانے کا تکلّف نہ کرنا۔ مَیں آزاد منش ہوں۔ جہاں موقع مِلے گا، کھا لوں گا۔ وہ کسی دوست کا مکان ہو یا ہوٹل، اور اگر کبھی کھانے کے وقت سے پہلے یہاں آ گیا تو آپ کے ساتھ کھا لوں گا۔

اختر نوجوان تھے، طبیعت بھی جوان تھی۔ ناک نقشہ بہت عمدہ تھا (صرف ہونٹ ذرا موٹے تھے) اس لیے اگر کسی سمجھ دار لڑکی نے اُن سے محبت شروع کی تو

کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ یہ اندازہ اُس وقت ہوا جب ہر دوسرے دن علی گڑھ سے ان کے نام دبیز خطوط آنے لگے جن کو وصول کرنے کے لیے وہ بیتاب نظر آتے تھے۔ اسی لیے دوسری ڈاک آنے کے وقت وہ ضرور دفتر میں آجاتے تھے۔

میرا معمول تھا کہ جمعے کی نماز مسجد فتح پوری میں پڑھتا تھا۔ میونسپل کمیٹی کے دفتر سے وہ جگہ زیادہ دُور نہیں تھی اور پھر شاہد کا مکان بھی قریب ہی تھا، اس لیے میں ذرا پہلے آکر اُن سے باتیں کرتا اور نماز پڑھنے کے بعد واپس اپنے دفتر چلا جاتا تھا۔

ایک روز جمعے کو جو وہاں پہنچا تو شاہد ایک لفافہ کانٹے پر رکھ کر تول رہے تھے۔ مَیں نے کہا: "کلرک کا کام بھی تم کرنے لگے ہو۔ ڈاک بھیجنا تو اس کا فرض ہے۔"

ہنس کر کہنے لگے "یہ باہر جانے والا خط نہیں ہے۔ علیگڑھ سے آیا ہے۔ بارہ آنے کے ٹکٹ لگے ہوئے ہیں۔ ہر ایک تولے پر ایک آنہ لگتا ہے۔"

مَیں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا اسے تول کر ٹکٹ لگائے گئے ہیں۔ وزن دس تولے ہے۔ احتیاطاً بارہ آنے کے ٹکٹ لگا دیے ہیں کہ کہیں بیرنگ نہ ہو جائے۔ مَیں نے تعجب سے کہا: "پھر بھی دس تولہ وزن کے کاغذوں پر کتنا طویل خط لکھا جاتا ہوگا۔ کہیں کوئی مضمون تو ملفوف نہیں ہے۔"

وہ بولے: "جی نہیں۔ اتنا ہی بڑا پلندہ ہر دفعہ آتا اور دوسرے دن اس کا جواب بھی اتنا ہی وزنی جاتا ہے۔ خدا جانے لوگوں کو اتنے طویل خط لکھنے کی فرصت کیسے مل جاتی ہے؟"

مَیں نے کہا: "جب زندگی میں اور کوئی کام نہ ہو، گھر کے کام کاج سے بھی فراغت ہو اور پھر معاملہ ہو دل و دماغ کا تو خط اتنے ہی طویل لکھے جاتے ہیں۔ تم کہیں دل لگا کے دیکھو۔ ساقی کی ادارت بھُول جاؤ گے۔"

انہوں نے قہقہہ لگا کر وہ خط اختر کے کمرے میں رکھوا دیا اور جب اختر آئے تو اُن کو یہ خوش خبری سُنا دی کہ ڈیڑھ پاؤ وزنی لفافہ آگیا ہے اور میز پر رکھا ہے۔ اختر کے چہرے پر بنی ہوئی سوالیہ علامت تبسّم کے ساتھ پھیل کر ایک حرفِ ندا بن گئی۔

دو چار دن میں شاہد نے جب دیکھا کہ اختر کسی طرح ساقی کے لیے افسانہ نہیں لکھتے اور اگلے شمارے کے دس صفحے، جو ان کے کہنے پر خالی چھوڑ رکھے ہیں، ایک دم بھرنے مشکل ہو جائیں گے تو انہوں نے ایک روز اختر کو خبردار کر دیا کہ آج مَیں آپ کو چھوٹے کمرے میں بند کر دوں گا اور جب تک افسانہ تیار نہیں ہو جائے گا، باہر نکلنے نہ دوں گا۔ انہوں نے اس دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا۔ ملازم کو ہدایت کی کہ ہر دس پندرہ منٹ بعد ایک پیالی چائے صاحب کو کمرے میں پہنچا دیا کرو۔ انہوں نے عمدہ سگریٹ کے دو پیکٹ بھی وہاں رکھوا دیے۔ اختر بھی بڑی ہمّت والے نکلے۔ صرف پندرہ پیالی چائے اور بیس سگریٹ پی کر ساڑھے تین گھنٹے میں ایک افسانہ لکھ دیا۔ عنوان تھا "مجھے جانے دو"۔ (یہ "محبت و نفرت" کے نام سے شائع ہونے والے مجموعے میں شامل ہے)۔

شام کو یہ افسانہ پنچوں کے سامنے پڑھا گیا۔ سب نے داد دی اختر اور شاہد دونوں کو۔ اختر کو اُن کے ایک عمدہ افسانے پر اور شاہد کو اُن کی ایک انوکھی ترکیب پر اور پھر شاہد کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ آئندہ ساقی کے لیے اور جتنے افسانے لکھوانے ہیں، اسی طرح لکھوالو، پھر یہ پنچھی اُڑ جائے گا اور مشکل سے ہاتھ آئے گا۔ چنانچہ اختر نے وہاں رہتے ہوئے تین افسانے اور لکھے۔ مَیں نے اختر کو رائے دی کہ دواؤں کے پیکٹ میں رکھے جانے والے پرچۂ ترکیبِ استعمال کی طرح اپنے افسانوں کے مجموعے میں بطور دیباچہ یہ ضرور لکھنا کہ ان کو چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر اور صرف چائے اور سگریٹ پی کر پڑھا جائے، کیوں کہ یہ ایسے ہی ماحول میں اور اتنی ہی مراعات کے ساتھ لکھے

گئے ہیں۔

لاہور کے رسالوں میں سے "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" خاص نمبر شائع کرنے کے اعتبار سے بہت شہرت رکھتے تھے، لیکن وہ سالناموں کے علاوہ عید نمبر اور بقر عید نمبر ہر سال نکالتے تھے اور پھر مو خرالذکر دو خاص نمبروں کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ تمام تر مضامین عید اور بقر عید سے متعلق ہوں۔ اس اعتبار سے خالص علمی اور ادبی حلقوں میں ان پر اعتراض ہوتا رہتا تھا۔ شاہد، جنہوں نے عرصۂ دراز تک ساقی کے سرورق کو حضرت علامہ اقبالؔ کے اس شعر سے زینت دی تھی ؎

اس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لُطف و کرم اور

اب خاص نمبروں کی اشاعت میں بھی نُدرت پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ حلقۂ احباب کے صلاح و مشورے اور قلمی اعانت کے وعدوں کی بنیاد پر انہوں نے سالناموں کے علاوہ افسانہ نمبر، ڈرامہ نمبر، ناولٹ نمبر، دِلّی نمبر، جاپان نمبر، ناصر علی نمبر اور چغتائی کی زندگی ہی میں چغتائی نمبر وغیرہ نکال کر ایسے سنگِ میل نصب کیے جو اب تک منزلِ ادب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کثیر تعداد میں چھپنے کے باوجود یہ نمبر ہمیشہ بہت جلد ایسے نایاب ہوتے کہ خود دفترِ ساقی میں ان کی کوئی جِلد ڈھونڈے نہ مِل سکی۔ جاپان نمبر شائع کرانے کا سہرا پروفیسر نورالحسن برلاس کے سر تھا۔ وہ شاہد کے عزیز تھے اور جاپان کی ٹوکیو یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے سربراہ —— انہوں نے یہ تجویز پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی قلمی اعانت کا وعدہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اور ان کی بیگم نے کسی لحاظ سے کوتاہی نہیں کی۔ یہ خاص نمبر تو اتنا مقبول ہوا کہ دوبارہ

شائع کرنا پڑ گیا، لیکن پس منظر کی اس حقیقت کو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شاہد کو دونوں دفعہ زبردست خسارے کا سامنا رہا۔ اس کا ایک خاص سبب تھا جو شاید میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

ساقی کی اوّلین اشاعت کے شاید تین چار سال بعد سیّد وصی اشرف نے، جو شاہد کے عزیزوں میں سے ہیں، ایک رسالہ "شاہجہان" کے نام سے نکالا۔ وہ خود کوئی مشہور ادیب نہیں تھے اور نہ اُس وقت تک ان کے بڑے بھائی سیّد ولی اشرف، جو بعد میں اشرف صبوحی کے نام سے دُنیائے ادب میں مشہور ہوئے، اس میدان میں پُوری طرح نمودار ہوئے تھے۔ تبرّکاً شاہد کا نام رسالے پر بطور سرپرست و نگران ڈال دیا گیا۔ یارانِ ساقی نے پُورے خلوص کے ساتھ اس رسالے کی بھی قلمی اعانت شروع کر دی اور وہ خوب مقبول ہو گیا۔ اس کے بل بوتے پر وصی اشرف نے جامع مسجد کے قریب اُردو بازار میں "کُتب خانۂ علم و ادب" بھی قائم کر لیا۔

"شاہجہان" کا دائرۂ عمل کسی حد تک علیحدہ رکھنے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس میں کچھ حصّہ فلمی مضامین اور تصاویر کا رکھا جائے، لیکن وصی اشرف جیسے صوفی منش انسان کے لیے اس روش کو نبھانا ممکن نہ تھا۔ فلم کے دو بڑے مرکز بمبئی اور کلکتہ تھے۔ وہ اپنی مختصر سی ڈاڑھی لے کر کبھی ایک بار بھی ان مرکزوں کا دَورہ نہ کر سکے اور جب قدرت کی طرف سے گُناہ کرنے کی توفیق عطا نہ ہو تو وصی بھائی اپنی مہم میں کس طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔

اس کے برعکس دوسرا میدان مذہبی تنقیدوں کا تھا جس پر طبع آزمائی کی گئی۔ اُن دنوں نیاز فتح پُوری کے خلاف ایک زبردست محاذ بن رہا تھا۔ نام نہاد علمائے دین ان

کے خلاف سازشیں کر کے ان کے درپئے آزار تھے۔ مَیں نیاز کے پرستاروں میں شامل تھا۔ یارانِ ساقی کی محفل میں ایک شام یہ موضوع زیرِ بحث آیا کہ اس محاذ کی کاٹ کرنے کے لیے تلوار کی بجائے نوکِ قلم سے کام لیا جائے۔ میرے رُجحانات کے پیشِ نظر یہ ذمّہ داری مجھ پر ڈالی گئی۔ اُس وقت میرا ایمان تھا اور اب بھی ہے کہ نیاز نے اسلام کے بنیادی اصولوں پر یا صحیح تعلیماتِ اسلام پر کبھی حملہ نہیں کیا، بلکہ خود ساختہ مولوی کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے یا ان مذمومات کا مذاق اُڑایا ہے جو گھُن کی طرح دین کو لگ کر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مَیں نے اسی اعتبار سے ایک سِلسلۂ مضامین "شاہجہان" میں شروع کر دیا۔ اس میں نیاز کے خیالات کی پوری طرح حمایت کرتے ہوئے صرف ننگِ مذہب اور صحیح علمِ دین سے بے بہرہ مولویوں کی خبر لی گئی۔

غالباً چھ اشاعتوں میں ایسے مضامین شاملِ اوراق ہوئے ہوں گے کہ ایک روز ایک بلائے ناگہانی آسمان سے ایوانِ ساقی تک پہنچ کر رہ گئی اور مَیں اس کی زد سے بال بال بچ گیا۔ مَیں اور ممتاز حسبِ معمول شام کے وقت دفترِ ساقی میں بیٹھے شاہد سے باتیں کر رہے تھے کہ مولوی ٹائپ کے ایک بزرگ بلا اجازت اُوپر کی منزل میں وارد ہوئے اور شاہد کے بارے میں دریافت کیا۔ مَیں نے فوراً ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ صرف اُن سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے۔ پھر اپنا تعارف کرائے یا مقصدِ آمد بتائے بغیر ایک دم پُوچھا:

"یہ فضل حق قریشی کہاں رہتا ہے؟ ہمیں اس کا پتہ بتایا جائے۔"

مجھے یہ محسوس ہوا کہ پانی سے بھرے ہوئے کئی سو فٹ گہرے تالاب میں پھینک دیا گیا ہوں اور تیزی سے اس کی تہ میں بیٹھتا چلا جا رہا ہوں۔ شاہد نے بھی اُن کے تیور دیکھ کر اور موقعے کی نزاکت کا اندازہ لگا کر اُس وقت دروغِ مصلحت آمیز کو روا رکھا۔ مجھے بعد میں ان کی حاضر دماغی کی داد دینی پڑی۔ انہوں نے فوراً کہا: "وہ دہلی میں

نہیں، لاہور میں رہتا ہے۔ وہیں ملازمت کرتا ہے۔"

وہ بولے: "لیکن "ساقی" اور "شاہجہان" میں اس کے مضامین برابر چھپتے ہیں اور دونوں رسالوں کا پتہ ایک ہے۔"

شاہد نے کہا: "اس سے کیا ہوتا ہے۔ آپ خود سوچیں، دِلّی کے اخبارات میں دُنیا بھر کی خبریں چھپتی ہیں۔ اب اگر ایسے ہی کسی اخبار کے دفتر میں جا کر آپ حکم دیں کہ وہ جاپان دکھاؤ جہاں زلزلہ آیا ہے، تو ظاہر ہے، آپ سے یہی کہا جائے گا کہ جاپان کا کرایہ خرچ کر کے وہاں چلے جائیے۔"

مولوی صاحب بولے: "تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہمیں لاہور جانا ہوگا؟"

"نہیں" شاہد نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اگر آپ خرچ برداشت کریں تو لاہور کو یہاں بُلا دیا جائے گا۔"

اُن کی تیوری پر کچھ بل پڑے۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں۔ مجھے لاہور سے کیا غرض۔ مَیں تو صرف فضل حق کی تلاش میں ہوں۔"

"آپ کا مقصد کیا ہے؟" آخر شاہد نے سوال کر ہی لیا۔

"ہم کو ہمارے حضرت صاحب نے حکم دیا ہے کہ اس مردُود کو ختم کر دو۔ ہم اسی کی تلاش میں آگرے سے یہاں آئے ہیں۔"

مَیں نے ممتاز کو اور ممتاز نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا، لیکن شاہد تو ہر خوف سے خالی الذہن ہو گئے تھے۔ انہوں نے قہقہہ لگا کر الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "اچھ..... چھا... یہ بات ہے، لیکن آپ کوئی گنڈا سا یا بھالا تو ساتھ لائے نہیں۔ آخر مقابلہ کس طرح سے ہو گا؟ کیا کوئی منتر پھُونک کر اسے مار ڈالیں گے؟"

مولوی صاحب پیٹ کے بڑے ہلکے تھے۔ خود ہی راز فاش کرتے ہوئے کہنے

لگے: "سب انتظام ہے۔ آگرے سے خالی ہاتھ کیسے آسکتے تھے؟"

"تو پھر میں آپ کو لاہور کا پتہ لکھ کر دوں" شاہد نے اطمینان سے کہا۔ "بس اسٹیشن سے اُترتے ہی وہ جگہ آپ کو آسانی سے مل جائے گی۔"

"جی ہاں۔ اب تو وہیں جانا ہوگا۔"

اور شاہد نے فوراً ایک پرچے پر میرا نام لکھے بغیر تحریر کیا —— مکان نمبر ۱۵ گلی اُستاد جُمن خاں۔ محلہ تمباکو فروشاں۔ لاہور چھاؤنی۔

وہ محترم پتہ لے کر اور شاہد سے ہاتھ ملا کر چلے گئے۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ وہ میری تلاش میں لاہور پہنچے یا واپس آگرے چلے گئے۔ شاہد نے پتہ ایسا لکھا تھا کہ ساری عمر سرگرداں رہنے کے باوجود وہ مکان انہیں مل نہیں سکتا تھا، کیوں کہ لاہور میں نہ اس نام کی کوئی گلی تھی اور نہ محلہ تھا۔ اُن کے چلے جانے کے بعد شاہد نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا: "میاں، مٹھائی بانٹو۔ جان بچالی۔ ورنہ مار ہی ڈالتا وہ تمہیں۔"

غالباً آگرے کے ان حضرت صاحب نے یا کسی اور نام نہاد مولوی نے مزید کارروائی کی تھی۔ تیسرے دن سی آئی ڈی کے ایک انسپکٹر شاہد کے پاس آئے اور مخلصانہ طور پر ہدایت کی کہ بس اگلے ہی مہینے سے یہ مذہبی تحریریں "شاہجہان" میں بند کر دی جائیں۔ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ورنہ ڈکلریشن ضبط ہونے کے علاوہ کچھ اور کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔ آج کل ہندو مُسلم فسادات ویسے ہی ہو رہے ہیں۔ حکومت کوئی اور انتشار اس موقعے پر نہیں چاہتی۔ چنانچہ پھر کوئی مضمون اس موضوع پر شائع نہیں ہوا، لیکن دراصل جو کچھ لکھنا تھا، وہ چھ سات مضامین میں لکھا جا چکا تھا۔ اب زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ اب بھی جب کبھی میں اس ادھورے ڈرامے پر غور کرتا ہوں تو سارے بدن میں ایک جھرجھری سی آجاتی ہے۔

شاہد کو ساقی یا ساقی بُک ڈپو سے کبھی آمدنی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ رسالہ عوام میں مقبول نہیں یا عمدہ کتابیں اُن کے ہاں سے نہیں چھپتی تھیں، بلکہ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ شاہد میں انتظامی صلاحیت نام کو نہیں تھی۔ پھر طبیعت بھی عجیب پائی تھی۔ جب ساقی نکلا ہے تو ٹیٹا گڑھ سے آنے والے بیس تیس سائز کے عمدہ سفید کاغذ کی قیمت صرف دو روپے دو آنے ریم اور ولایتی سفید کاغذ کی قیمت دو روپے چھ آنے فی ریم ہوتی تھی۔ وہ ہر بار ڈیڑھ دو سو روپے کا چیک کاغذی کو بھیجتے کہ اس کا کاغذ دلّی پرنٹنگ پریس کو بھیج دو اور جب پریس لکھ کر بھیجتا کہ آپ کا کاغذ ختم ہو گیا ہے تو وہ اسے دُرست مانتے ہوئے ایک اور چیک کاغذی کو بھیج دیتے۔ یہ سلسلہ بہت عرصے تک چلتا رہا۔ ایک بار خیال آیا کہ لاؤ پڑتال تو کرلیں۔ حساب لگایا تو زبردست فرق نکلا۔ گھپلا دونوں نے کیا تھا ـــــ کاغذی نے اور پریس نے بھی، لیکن اب شکایت کس طرح کریں۔ کیونکہ دریافت کرنے پر یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ دونوں کاغذ بھیج کر اور رسالہ چھاپ کر شاہد کے کلرک سے ایک کاغذ پر دستخط کرا لیتے تھے۔ اسے آٹے میں نمک کے برابر کچھ حصّہ دونوں جگہ سے مِل جاتا تھا۔

اسی طرح ایجنٹوں کے حسابات کی کبھی پڑتال نہیں کی۔ بس رسالہ بھیج دینے سے غرض تھی۔ شاہد کا کہنا تھا کہ اگر کلرک ان ایجنٹوں سے رقمیں اور پوری رقمیں وصول نہیں کرتا اور آنے والی رقمیں کھاتے میں دیانت داری کے ساتھ جمع نہیں کرتا تو وہ ذمّہ دار ہے۔ کتابیں چھاپی جاتیں تو کسی رجسٹر میں ان کا اندراج نہ ہوتا۔ کسی وقت بھی یہ بتانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا کہ فلاں کتاب کی کتنی جلدیں مُفت تقسیم ہوئیں، کتنی تبصرے کے لیے گئیں، کتنی کُتب فروشوں کو تبادلے میں یا نقد گئیں اور کتنی کتابوں کے وی پی گئے اور جب وی پی کی رقم وصول ہوئی تو وہ کہاں درج کی گئی۔

کبھی غلطی سے یعنی بلا طلب کوئی اشتہار چھپ گیا تو اس کا بل گیا یا نہیں، اور بل کی رقم وصول ہوئی یا نہیں؟ کلرک نے کہا کہ ڈاک کے ٹکٹ چاہییں تو پچھلا حساب چیک کیے بغیر اسے مزید روپے دے دیے۔ پھر یہ نہیں دیکھا کہ وہ اتنی رقم کے ٹکٹ لایا بھی یا نہیں۔

ایک بار وہ ٹکٹوں کے لیے ڈیڑھ سو روپے لے کر گیا۔ بسورتا ہوا واپس آیا کہ ٹکٹ تو خرید لیے تھے، لیکن جیب میں سے کہیں گر گئے۔ اسے جھوٹ بولنا بھی نہیں آیا۔ اگر یہ کہتا کہ روپے گر گئے تو بات قابلِ تسلیم ہوتی۔ ایک ایک پیسے والے ڈیڑھ سو روپے کے ٹکٹ چھوٹی سی جیب میں کیسے آ سکتے تھے۔ شاہد میں یہ سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ معاملہ ان کے ماموں اشتیاق چشتی کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے بیان سُن کر کلرک کو ملزم اور ذمّے دار ٹھہرایا۔ صاف کہہ دیا کہ ہم اس بیان کو صحیح تسلیم نہیں کرتے، لیکن معاملہ پولیس میں دینے کی بجائے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہر ماہ تمہاری تنخواہ میں سے پانچ روپے کٹ جایا کریں گے۔ یعنی مُبلغ ساٹھ روپے کی جگہ پچپن روپے تیس ماہ تک ملیں گے۔ کلرک نے یہ فیصلہ منظور کر لیا اور معاملہ ختم ہو گیا۔

ایک روز مَیں نے اس کلرک کو دیکھا کہ وہ نیتی پوری مسجد کے قریب پٹڑی پر بیٹھ کر رسالے اور کتابیں بیچنے والے شخص کے ہاتھ ساقی بُک ڈپو کی چار کتابیں بیچ رہا ہے۔ مَیں نے بعد میں جا کر فرید یعنی کُتب فروش سے پُوچھا تو اس نے اعتراف کیا کہ مَیں نے کتابیں آدھی قیمت پر خریدی ہیں جب کہ دفتر سے مجھے تین چوتھائی قیمت پر ملتی ہیں۔ (یہ ایجنٹ اب بھی کراچی کے صدر بازار میں حلوا سوہن والے کی دُکان کے سامنے پٹڑی پر انگریزی رسائل فروخت کرتا ہے)۔ مَیں نے شاہد کو مطلع کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کلرک کو ضرور الگ کر دیں گے، لیکن وہ ہنسنے ما کہنے لگے کہ "چشتی صاحب نے اس پر ظلم کیا ہے۔ تنخواہ میں سے پانچ روپے کم کر دینے کا فیصلہ کر دیا۔ اس کی

بوڑھی ماں ہے، بیوہ بہن ہے، بیوی اور ایک بچی ہے۔ خود بیڑی بھی پیتا ہے۔ گھر کا گزارا ساٹھ روپے میں بھی مشکل تھا۔ اب پچپن میں کس طرح کتر بیونت کریگا۔ آدھی قیمت پر کتابیں نہیں بیچے گا تو کیا کرے گا۔"

مَیں نے پُوچھا کہ اگر فیصلہ ماموں چشتی کی بجائے صرف تمہیں کرنا ہوتا تو کیا کرتے۔ کہنے لگے: "مَیں اس کی تنخواہ میں اضافہ کر کے یہ سزا دیتا کہ اضافے کے پانچ روپے تم کو بیس ماہ تک نہیں ملیں گے تاکہ اس طرح خسارہ پُورا ہو جائے۔"

اس فیصلے کا جواب نہیں تھا۔ جب مَیں نے بہت زور دیا کہ کتابوں کے معاملے میں اس سے باز پُرس ضرور کی جائے، ورنہ اس کا ہواؤ کھلتا جائے گا اور پھر زیادہ ہاتھ مارے گا تو انہوں نے اُسی وقت اسے بُلایا اور کہا: "دیکھو، ساقی بُک ڈپو کی ساکھ نہ بگڑنے پائے۔ یہاں دفتر سے پچیس فیصد کمیشن پر کتابیں جاتی ہیں۔ تم نجی طور پر ان کو دو تو زیادہ سے زیادہ تیس فیصد کمیشن دیا کرو۔ آدھی قیمت پر دینا زیادتی ہے۔ پھر یہاں آکر کوئی بھی نہیں خریدے گا۔ دوسرے یہ کہ جرم کرو تو پُورا فائدہ تو اُٹھاؤ۔ اچھّا خیر جاؤ، کام کرو۔ آج سارے پتے ختم کر کے جانا، شاید کل رسالہ چھپ کر آجائے۔"

ایک روز میرے سامنے ساقی کے ایک قلمی معاون آئے اور سالنامہ مانگ کر لے گئے۔ مَیں نے کہا: "سالنامہ چھپے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ یہ کس طرح کہتے ہیں کہ مجھے اب تک نہیں مِلا۔"

شاہد ہنسنے لگے۔ انہوں نے کہا: "مجھے بھی یاد ہے۔ تم کچھ دیر بعد اسی اخبار فروش سے جا کر پُوچھ لینا کہ آج ساقی کا کوئی سالنامہ آدھی قیمت پر خریدا ہے؟ یہ قلمی معاون صاحب تین بار سالنامے لے گئے ہیں اور ہر بار آدھی قیمت پر بیچ دیا

ہے۔ اپنے پاس ایک بھی پرچہ نہیں رکھا، حالانکہ اس میں ایک مضمون خود ان کا بھی شامل ہے۔ اب سوچو کہ کس قدر قابلِ رحم انسان ہے۔ پیسے کی مجبوری یہ سب کچھ کرا رہی ہے۔ آخر میں اسے کیوں نہ دُوں؟ اب جو سالنامے بچ گئے ہیں، انہیں کلرک بیچے گا یا دیمک کھائے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ قلمی معاون ہی کچھ فائدہ اُٹھا لے۔ اس سے آیندہ بھی تو مضمون لینا ہے۔ میرے پرچے کے لیے نہ کلرک مضمون لکھے گا نہ دیمک لکھے گی۔"

ایک روز کا ذکر ہے، میں شام کے پانچ بجے دفتر ساقی میں پہنچا۔ شاہد اپنے کمرے میں نہیں تھے، بلکہ کلرک والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کوئی اور شخص بھی موجود تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پیٹھ تھی، اس لیے مَیں پہچان نہ سکا کہ کون ہے۔ اس کے علاوہ ایک عورت اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت سی جوان لڑکی بھی بیٹھی تھی۔ میں مصلحتاً اس طرف نہیں گیا، بلکہ تنہا شاہد کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں وہ آئے۔ تیوری پر بل تھے۔ مجھ سے بولے بغیر الماری کھولی، چیک بُک نکالی، چیک لکھا اور پھر واپس اسی کمرے میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ بزرگ صورت انسان اور دونوں خواتین جانے کے ارادے سے اُدھر کے حصّے میں آئیں جہاں مَیں بیٹھا تھا۔ مختلف ملکوں کے لوک گیت لکھنے والے یہ ایک مشہور ادیب تھے جو بعد میں افسانے بھی لکھنے لگے تھے۔ عورتوں میں سے ایک اُن کی بیوی تھی اور دوسری لڑکی کھڑے کھڑے مجھ سے سرسری بات چیت ہوئی۔ پھر وہ چلے گئے۔

مَیں نے شاہد سے پُوچھا: "کتاب کا سودا ہو گیا۔"

بولے: "ہاں میاں ہو گیا، لیکن بیکار۔ مَیں اس کم بخت کی کتاب کبھی نہیں چھاپونگا۔ نہایت ذلیل انسان ہے۔ مَیں نے معاوضہ ادا کر دیا ہے۔ جملہ حقوق کے معاہدے پر دستخط لے لیے ہیں۔ ادھر یہی کارروائی ہو رہی تھی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا: "پھر ناراضگی اور خفگی کا سبب کیا ہے؟"

کہنے لگے: "خدا انسان سے ہر بُرا کام کرائے، لیکن اسے ناشر نہ بنائے۔ بعض بڑی مذموم منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایمان قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب اس شخص کو دیکھو۔ اتنی بڑی ڈاڑھی لگائے پھرتا ہے، ثقہ بنتا ہے۔ خط و کتابت کے ذریعے پانچ سو روپے کا فیصلہ ہُوا تھا۔ اب آئے تو کہنے لگے کہ مجھے سات سو روپے کی ضرورت ہے۔ اتنی رقم دے دیجیے۔ فاضل دو سو روپے مجھے نہیں دیتے تو میری بیوی کو دے دیجیے، میری لڑکی کو دے دیجیے۔ اب ممکن نہیں ہے تو یہ شام کو آ کر لے جائے گی۔ اس پر مَیں نے بگڑ کر پُوچھا کہ مجھے آپ کی بیوی اور بیٹی سے کیا واسطہ۔ یہ تو کوئی افسانہ یا مضمون نہیں لکھتیں، لیکن بیٹی نے ہاتھ جوڑ کر کہا، اس وقت پتاجی کو سخت ضرورت ہے۔ اب مَیں کیا کہتا۔ مَیں نے ساقی کے ذریعے ادب نوازی کی ہے، عیاشی نہیں کی۔ کوئی اور ہوتا تو لڑکی کو چیک دینے کے بہانے شام کو بُلا لیتا۔ مَیں نے وقت سے پہلے سات سو روپے کا چیک دے کر قصّہ ختم کر دیا، لیکن یہ فیصلہ ہے کہ اس کی کتاب نہیں چھاپوں گا۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ افسانوں کا یہ مجموعہ دس سال تک ان کے پاس مسوّدے کی صورت میں پڑا رہا۔ پھر انہوں نے مسوّدہ اور کاپی رائٹ کی دستاویز اس ادیب کو واپس بھیجتے ہوئے لکھا کہ تم جہاں چاہو، چھپوا لو۔ ساقی بُک ڈپو سے شائع کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس نے وہ مجموعہ فوراً ایک اور ناشر کے حوالے کر کے مزید رقم حاصل کر لی۔ کون جانتا ہے کہ وہاں بھی بیوی اور بیٹی کو ساتھ لے کر گیا تھا یا نہیں۔

ایک روز ہم سب دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ فلم میں جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ اتنے میں ایک اجنبی شخص آیا اور کہا: "مَیں شاہد صاحب سے مِلنا چاہتا

ہوں۔"

شاہد چاہتے تھے کہ سُدرشن والی ملاقات کی طرح ہم میں سے کوئی شخص شاہد کا کردار ادا کرے۔ مَیں نے یہ اندازہ لگا کر ایک دم اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہ ہیں شاہد صاحب!"

اس اجنبی نے علیٰحدگی میں باتیں کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ شاہد باہر صحن میں چلے گئے۔ اس نے بُری طرح بسور کر اپنی داستانِ غم سُنائی اور کہا کہ بچّے دو روز سے بھُوکے ہیں۔ شاہد نے الماری کھول کر ایک روپیہ نکالا اور دے دیا۔ اس نے کہا کہ اس سے گزارا نہیں ہوگا۔ شاہد بولے، فی الحال یہی لے جایئے۔ پھر دیکھا جائے گا۔ وہ شخص زینے تک گیا۔ پھر لوٹ کر آیا۔ کہنے لگا کہ یہ روپیہ (جو چاندی کا تھا) کسی قدر ٹھُس ہے۔ شاید دُکان دار نہ لے۔ شاہد نے الماری کھول کر دوسرا روپیہ نکالا اور پہلے روپے کے عوض دے دینا چاہا۔ اس شخص نے وہ روپیہ لے کر کہا، دونوں ہی رہنے دیجیے۔ مجھے اتنے ہی کی ضرورت ہے۔ شاہد خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد ہم سب دوست اُٹھ کر رائل سینما چلے گئے۔ ہمارا معمول تھا کہ آٹھ آنے والا ٹکٹ خریدتے تھے (اُس وقت کم سے کم ٹکٹ چار آنے کا اور زیادہ سے زیادہ سوا روپے کا ہوتا تھا)، لیکن اُس روز ہم نے بارہ آنے والا ٹکٹ خرید لیا کیونکہ نیا فلم شروع ہوا تھا اور صرف دو دن گزرنے کے باعث بہت بھیڑ تھی۔ جب وقفہ ہوا تو مَیں نے کسی خاص ارادے کے بغیر مُڑ کر پچھلے درجے میں دیکھا، وہی شخص جو شاہد کو داستانِ غم سُنا کر اور چکمہ دے کر دو روپے لے گیا تھا، ایک روپے والے درجے میں ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا اور کوئی ایسی بات لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ وہ زیرِ لب مُسکرا رہی تھی۔ ایک دم میرے مُنہ سے نِکلا: "شاہد! وہ مظلوم شخص، جس کے بچّے دو روز سے بھُوکے

مڑ رہے تھے، پیچھے بیٹھا ہے۔

شاہد اور دوسرے دوستوں نے مُڑ کر دیکھا۔ میری بلند آواز سے اس شخص کا انہماک بھی ختم ہو گیا تھا۔ شاہد سے اس کی نگاہ ملی اور گردن جُھک گئی۔ شاہد نے مجھے ٹھوکا دے کر کہا: "اب مت دیکھو۔ بُری بات ہے۔ وہ شرمندگی محسوس کرے گا اور کہیں یہ لڑکی کھٹک نہ جائے۔"

مَیں نے کہا: "لیکن یہ بڑی زیادتی ہے کہ مصیبت بیان کر کے زبردستی روپے وصول کیے اور یہاں عیش کیے جا رہے ہیں۔"

وہ بولے: "یہ توفیق، ہمّت اور صلاحیت جس میں پیدا ہو جاتی ہے، قدرت اسی کو نوازتی ہے۔ مَیں اور تم اس نعمت سے محروم ہیں۔ جوان لڑکی تو کیا، کسی بچّے والی کو بھی مَیں یا تم اپنے ساتھ نہیں لا سکتے۔ پھر اعتراض کیوں کرتے ہو۔ جو مزے اُڑانے جانتا ہے، اسے اُڑانے دو اور اس کے لیے یہی مناسب تھا کہ اس لڑکی کو لے کر ایک روپے والے درجے میں بیٹھتا۔ ورنہ تمہارا اور اس کا ساتھ جو ہو جاتا۔ بھلا سوچنے کی بات ہے، اس بارہ آنے والے درجے میں ایک بھی عورت نظر نہیں آتی پھر وہ بے چارہ غم کا مارا کسی لڑکی کو لے کر یہاں کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جھُوٹ اور فریب کے ذمّے دار خود ہم ہیں۔ اگر وہ سیدھے سبھاؤ آ کر ہم سے کہتا کہ مَیں ایک لڑکی کو لے کر فلم دیکھنے جاؤں گا، مجھے دو روپے درکار ہیں تو نہ تم دیتے اور نہ مَیں دیتا۔ آخر کیوں؟ اسے اپنی ضرورت پوری کرنی تھی اور ہماری ذہنیت بھی سمجھتا تھا۔ اس نے نفسیاتی اعتبار سے ہم کو مات دے دی۔ وہ تو انعام پانے کے لائق ہے۔"

وقفہ ختم ہُوا۔ دوبارہ اندھیرا چھا گیا۔ فلم چلتا رہا اور مَیں پچھلے درجے میں سے

چوڑیوں کی جھنکار سنتا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔

اب فلم کا ذکر چھڑا ہے تو بہتر ہے کہ ایک "افسوسناک لطیفہ" بھی یہاں قلمبند کر دیا جائے۔

ایک روز میں اور شاہد بازار چاندنی چوک میں فوارے کے سامنے میجسٹک سینما میں فلم دیکھنے گئے۔ اُس روز دفتر ساقی میں اور کوئی نہیں آیا تھا۔ ممتاز کے مدرسے میں سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ اُن کی مصروفیت بے پناہ تھی۔ درگاہ سید حسن میں سالانہ عُرس کا میلہ تھا۔ پیر ولایت اپنے والد کے ساتھ اہتمام میں لگے ہوئے تھے۔ انصار اپنے والدین سے ملنے فرخ نگر چلے گئے تھے۔ اُن کے والد محکمۂ نمک میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ فرخ نگر میں کنوؤں کے پانی سے بڑی مقدار میں نمک نکلتا تھا۔

شاہد کی ہمیشہ یہ عادت رہی کہ وہ کُرسی پر پاؤں لٹکا کر زیادہ دیر نہیں بیٹھتے تھے۔ جُوتی کُرسی کے نیچے رکھی اور پاؤں اُوپر کر کے بیٹھ گئے۔ وہ اکثر دونوں ٹانگوں میں قینچی ڈال کر بیٹھنے کے عادی تھے۔ انہیں اسی طرح آرام ملتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دفتر ساقی میں میز کُرسی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

اُس روز بھی وہ اپنی اس عادت پر عمل پیرا رہے۔ فلم عمدہ تھا اور آغا حشر کاشمیری کا مکالمہ لُطف دے رہا تھا، لیکن پچھلی قطار میں کچھ نامعقول قسم کے لوگ بیٹھے مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے۔ شاہد نے دو تین مرتبہ ٹوکا۔ آخری بار ذرا سختی سے کہا کہ تم عجیب آدمی ہو، فلم دیکھنے آتے ہو یا باتیں کرنے۔ دوسروں کا لُطف بھی کرکرا کر رہے ہو۔ ان میں سے ایک نے کہا، بہت اچھا، اب نہیں بولیں گے۔

جب فلم ختم ہوا اور شاہد نے چلنے کے لیے شیروانی کے دامن سنبھال کر کُرسی

کے نیچے جُوتی تلاش کی تو وہ غائب تھی۔ اور زیادہ جُھک کر آس پاس کی کُرسیوں کے نیچے نظر دوڑائی، لیکن کہیں پتہ نہیں تھا۔ پچھلی قطار کے لوگ پہلے ہی جا چکے تھے۔ باقی تماش بین قطار در قطار باہر نکل رہے تھے۔ شاہد کسی قدر پریشان ہوئے۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ بازار آٹھ بجے سے بند ہو جاتے تھے۔ فوراً دوسری جُوتی یا سلیپر کی خریداری ممکن نہیں تھی۔ زیادہ دیر سوچنے کا بھی موقع نہیں تھا۔ مَیں نے کہا: "تم دو تین منٹ بعد ہال سے نکلنا۔ میں پہلے باہر جا کر ایک تانگہ روک لیتا ہوں۔ تم کوچوان کے قریب اگلی سیٹ پر بیٹھنا تاکہ پاؤں کسی کو نظر نہ آئیں۔"

اس صورت میں ہم بازار کھاری باؤلی میں گلی بتاشان کے نکڑ تک پہنچے۔ مَیں نے فوراً اپنی جوتی شاہد کو پیش کی۔ اُن کی گلی میں مٹھائی بنانے والے کچھ لوگ آدھی رات تک کام میں مصروف رہتے تھے۔ ان میں سے بعض سرکاری زمین پر کپڑا بچھا کر کھانڈ کے بتاشے بنانے یا بڑے کڑھاؤ میں دال موٹھ بھی تلتے تھے۔ اُن کے لیے اطمینان کا وقت وہی ہوتا تھا جب آہر جاہر بالکل نہیں ہوتی تھی۔ وہ شاہد کو جانتے بھی تھے کہ یہ ڈپٹی صاحب کے پوتے اور مولوی صاحب کے بیٹے ہیں۔ میری رائے یہ تھی کہ اِن لوگوں کے سامنے سے ننگے پاؤں گزرنا مناسب نہیں ہے۔ عزّت کا سوال ہے۔ ہر شخص کو تفصیل بتانی ممکن نہیں تھی۔ میرا مکان قرولِ باغ میں تھا جہاں دس بجے کے بعد گلیاں بالکل سُنسان ہو جاتی تھیں۔ اُس وقت میرے ننگے پاؤں دیکھنے والا کوئی بھی گلی میں نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا مَیں نے زور دیا کہ تم میری جوتی پہن جاؤ۔ ان دنوں ہم دونوں سلیم شاہی جوتی پہنتے تھے اور دونوں کے پاؤں سات نمبر کے تھے۔ وہ بمشکل راضی ہوئے اور جُوتی پہن تانگے سے اُتر کر چلے گئے۔

مَیں نے تانگے والے سے آگے قرول باغ کی سمت چلنے کے لیے کہا۔ اس نے

راستے میں جُوتی بدلنے کا سبب پُوچھا۔ اسے بتا دینا پڑا۔ وہ بہت زور سے ہنسا اور بولا: "وہ لوگ بھی بڑے دیر تھے۔ جُوتی بغل میں دبا کر کیسے لے گئے۔ کوئی دیکھ لیتا تو کیا کہتا۔ کیسی بے عزتی ہوتی۔"

مَیں گھر پہنچا تو والدہ نے آ کر کُنڈی کھولی۔ وہ میرے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ مَیں چُپکے سے اپنے کمرے کی طرف لپکا، لیکن والدہ نے جوتی کی آواز نہیں سُنی تھی۔ وہ فوراً پیچھے پیچھے آئیں۔ حیرت سے پُوچھا کہ "جوتی کہاں ہے؟" مَیں نے کہا "صبح پُوچھ لینا۔ ابھی معلوم کرنا کیا ضروری ہے۔" انہیں اطمینان نہیں تھا۔ پھر پُوچھا: "کہیں کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا؟" مَیں نے کہا: "بالکل نہیں۔"

دوسرے روز مَیں پُرانی جوتی پہن کر دفتر گیا۔ واپسی میں حسبِ معمول دفتر ساقی میں پہنچا اور اپنی جوتی کاغذ میں لپیٹ کر گھر لے آیا۔ جب دوسرے دوستوں نے یہ "افسوس ناک لطیفہ" سُنا تو وہ بہت دن تک مزے لیتے رہے۔

شاہد میں ایک کھلنڈرا پن بھی تھا۔ وہ کبھی کبھی دوستوں کو آپس میں لڑا کر لُطف لیتے تھے۔ لیکن اُن کا منشا صرف دِل لگی ہوتا تھا۔ دِل میں کوئی بُرائی نہیں ہوتی تھی اور پھر ثالث بن کر فیصلہ کراتے اور فریقین پر جُرمانے بھی کرتے تھے۔ یونوں پر کیے جانے والے جرمانے کی رقم سے یارانِ ساقی فلم دیکھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی ان کی دِل لگی بدمزگی کی صورت اختیار کر لیتی، لیکن وہ کیفیت بھی زیادہ دن برقرار نہیں رہتی تھی۔

انصار ناصری کی منگنی ایک جگہ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ (قصہ طویل ہے اور یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کرنا بالکل خارج از بحث ہے) شاہد نے انصار کو صلاح دی

کہ تم ادبِ لطیف کے انداز میں ایک رُومانی مضمون لکھو جس میں مرد کی طرف سے عورت کو مطعون کیا جائے کہ وہ بے وفا اور وعدہ خلاف ہوتی ہے۔ جب لڑکی والے یہ مضمون پڑھیں گے تو ان پر اثر پڑے گا۔ انصار نے بڑی محنت سے ایک پُرسوز مضمون لکھ دیا۔ عنوان تھا "فغانِ نیم شبی"۔ جب مَیں شاہد کے ساتھ بیٹھا کاپیاں پڑھ رہا تھا تو اس مضمون پر ایک دم کھٹک گیا۔ میرے استفسار پر انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ کسی کو محسوس کرانے کے لیے لکھا گیا ہے، لیکن تم اس کا جواب عورت کی طرف سے لکھو اور شاکی مرد کو کم ہمّت، بُزدل اور ناقابلِ اعتماد ثابت کرو۔ اِن کے اصرار پر مَیں نے اِسی عنوان سے جواب تو لکھ دیا، لیکن تاکید کی کہ میرا نام اس کے ساتھ نہ چھاپا جائے۔ بلکہ میرا قلمی نام "شعر دہلوی" شائع کیا جائے۔ انہوں نے وعدہ کیا، لیکن کاتب کی غلطی سے میرا اصل نام چھپ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں کے مضامین کا اصل مقصد ایک خاص دائرے میں سمجھا گیا۔ باقی قارئین نے محض ادبی اعتبار سے ان کو پڑھا، لیکن انصار مجھ سے ناراض ہو گئے اور دو تین ہفتے ناراض رہے۔ اُن کی شکایت اپنی جگہ درست تھی۔

اِسی طرح ایک اور موقعے پر انصار سے ایک فرضی قصّہ ممتاز کے خلاف لکھوا کر ساقی میں چھاپ دیا۔ اسے پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ممتاز سے میری دوستی زیادہ پُرانی تھی۔ مجھے ناگوار گزرا۔ مَیں ساقی کا وہ شمارہ لے کر ممتاز کے گھر گیا۔ مَیں نے پُوچھا: "تم یہ مضمون پڑھ چکے ہو؟"

وہ بولے: "جی ہاں۔ مَیں نے پڑھ لیا ہے۔ انصار کی زیادتی ہے اور شاہد کی ان سے بھی زیادہ نادانی ہے۔"

مَیں نے کہا: "پھر کیا ارادہ ہے۔ اس کا جواب لکھو اور ساقی میں ہی چھپواؤ اور اگر تم نہیں لکھو گے تو پھر مجھے قلم اُٹھانا پڑے گا۔"

ممتاز کا خیال تھا کہ بس خاموشی اختیار کر لی جائے اور ستم یہ کیا کہ جب اس سلسلے میں شاہد سے گفتگو ہوئی تو میرا ذکر بھی کر دیا کہ وہ جواب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شاہد ذرا بگڑ کر بولے: "اچھا تو پھر اس سے کہہ دو کہ لکھے اور ضرور لکھے، لیکن پھر اس کا جواب بھی لکھا جائے گا اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔"

مَیں دو ماہ تک خاموش رہا۔ دفتر ساقی میں حسبِ معمول نشست ہوتی رہی۔ پھر ایک قصّہ لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے بغیر پڑھے کاتب کو اگلے شمارے کے لیے دے دیا۔ مَیں یہ نہیں چاہتا تھا کہ انھیں اس کی اصلیت بعد میں معلوم ہو۔ مَیں نے اصرار کیا کہ مسوّدے پر ایک نظر ڈال لو، لیکن وہ نہیں مانے۔ جب کتابت ہو گئی تو معمول کے مطابق کاپی میرے سامنے ڈال دی کہ اس میں تمہارا مضمون ہے، خود ہی پڑھو۔ مجبوراً مَیں نے کاپی پڑھی، لیکن جب پروف کی منزل آئی تو مَیں دو روز تک دفتر ساقی میں نہیں گیا۔ اس لیے پروف انھیں پڑھنا پڑا۔ وہ بہت ناراض ہوئے۔ میرے دفتر پرچہ بھیجا کہ آج تم ضرور آنا۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مَیں وقت سے ذرا پہلے پہنچ گیا تاکہ دوسروں کے آنے سے قبل تبادلۂ خیالات ہو جائے۔ شاہد سخت غصّے کے عالم میں تھے۔ نہایت بے رُخی کے ساتھ بات کی۔ بولے: "تم کیا چاہتے ہو۔ دو صورتیں ہیں۔ اصرار کرو گے تو مَیں یہ قصّہ ساقی میں چھاپ تو دُوں گا، لیکن دوستی اسی روز ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس کی اشاعت سے میری بدنامی ہوگی اور عزیز و اقارب بھی برہم ہو جائیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کی بجائے کوئی اور مضمون لکھوا کر دوسری پلیٹ بنوائی جائے۔ اِس میں ذرا زحمت ہے اور پرچہ نکلنے میں تاخیر بھی ہو جائے گی، لیکن مجھے یہ گوارا ہے۔"

مَیں نے کہا: "مَیں خود نہیں چاہتا تھا کہ یہ قصّہ بجنسہٖ شائع ہو۔ اگر میرے اصرار

پر تم مسوّدہ دیکھ لیتے تو یہ نوبت نہ آتی، تاہم پروف مجھے دے دو۔ مَیں چند الفاظ اور بعض جملے بدل دوں گا۔ سنگ ساز کو ذرا محنت کرنی ہوگی اور نفسِ مضمون بالکل بدل جائے گا۔"

دوسرے روز مَیں نے پروف دکھایا۔ وہ مان گئے کہ اب کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بات آئی گئی ہوگی۔ پھر کبھی اس کا ذکر تک زبان پر نہیں آیا۔

کچھ عرصے تک پیر ولایت حُسین کا یہ معمول رہا کہ ٹھیک بارہ بجے دفتر ساقی میں پہنچ جاتے اور جب شاہد اور چھجن دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھتے اور ان کی صلاح کرتے تو تکلفاً انکار کرتے ہوئے یہ بھی شریکِ طعام ہو جاتے تھے۔ شاہد کے بھائی کو یہ بات ذرا ناگوار گزرنے لگی۔ انہوں نے شاہد سے کہا کہ یہ روزانہ کی عِلّت اچھی نہیں ہے۔ اس پیرِ نابالغ سے کہہ دو کہ دو بجے کے بعد آیا کرے۔ شاہد ہنس کر بولے: "دوسری ترکیب یہ ہے کہ کھانے میں جمال گوٹے کے بیج مِلا کر کھلا دو۔ خود محسوس کر کے کنارہ کش ہو جائیگا۔"

چھجن کو یہ تدبیر اچھی معلوم ہوئی۔ اصل مقصد پُورا ہونے کے علاوہ ان کے نزدیک یہ ایک دِلچسپ کھیل بھی تھا۔ فوراً ملازم کو بھیج کر وہ بیج منگوائے اور چھیل کر کُتر کر پُڑیا میں رکھ لیے تاکہ وقتِ ضرورت کام آسکیں اور جب اسی روز ولایت حُسین کھانا کھانے بیٹھ گئے تو موقع پا کر اُن کی پلیٹ کے سالن میں بیج کے ٹکڑے مِلا دیے۔ مشکل سے دو منٹ گزرے ہوں گے کہ اِن بیجوں نے بے پناہ رنگ دکھایا۔ قے اور دست کا سِلسلہ شروع ہو گیا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ ڈولی میں ڈال کر انہیں گھر بھیجا گیا۔ سراج خود ساتھ گئے اور ولایت کی والدہ سے کہہ آئے مسلسل دہی کھلاتی رہو۔ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔

شام کے پانچ بجے مَیں حسبِ معمول دفتر ساقی میں پہنچا تو شاہد نے ہنس ہنس کر

ساری روئداد سُنائی اور کہا کہ تم بھی خیریت معلوم کر آؤ۔ میں فوراً ولایت کے گھر گیا۔ ان کی والدہ بُری طرح رو رہی تھیں۔ مجھے لے کر کمرے میں گئیں اور بتایا کہ بے شمار دست آچکے ہیں اور ہر بار قے بھی ہوئی ہے۔ بظاہر ہیضے کی علامات ہیں۔ خدا بھلا کرے سراج کا، وہ ترکیب بتا گئے ہیں جس سے کچھ افاقہ ہوا ہے۔ اب ان بڑی بی سے کون کہتا کہ یہ کرتُوت کس کے تھے۔ ولایت حُسین کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ بات کرنی دشوار تھی۔ میں نے واپس آکر شاہد سے کہا کہ معاملہ نازک ہو گیا ہے۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ لو۔ ورنہ جان کے لالے ہیں۔ وہ ڈاکٹر ایس اے ہاشمی کو ساتھ لے کر گئے۔ اصل سببِ مرض سے اُن کو آگاہ کیا۔ انہوں نے مناسب دوا دی۔ تقویت کے انجکشن بھی لگائے۔ پیر جی پندرہ دن تک پلنگ سے نہ اُٹھ سکے۔ کچھ ہی دن بعد شاہد نے تفصیل کے ساتھ انہیں بتا دیا کہ یہ دل لگی چھجّن نے کی تھی۔ پیر ولایت ان کے بھائی پر سخت ناراض ہوئے۔ بہت دن تک سراج سے بات چیت بند رہی۔ پھر ٹھیک ہو گئے۔

ساقی کے یارانِ میکدہ میں سے شاہد اور انصار کو اور مجھے خاص طور پر اداکاری کا شوق تھا۔ اسکول اور پھر کالج کے زمانے میں متعدّد ڈرامے اسٹیج کیے تھے۔ باقی دوستوں میں بھی یہ صلاحیت موجود تھی۔ ایک روز دفتر ساقی میں تجویز پیش ہوئی کہ ہم سب مل کر ایک کلب بنائیں اور اپنی پُرانی درس گاہ کو فائدہ پہنچانے کی خاطر عربک کالج بلڈنگ فنڈ کے لیے ڈرامے کریں۔ اتّفاق سے اُنہی دنوں مسجد فتح پوری کے قریب چاندنی چوک میں فوٹو گرافر کی ایک نئی دُکان کھُلی تھی۔ غنی اس کے مالک تھے جو کبھی پیشہ ور ایکٹر رہے تھے۔ اُن کے اسٹوڈیو میں ایک روپے کی آٹھ تصاویر بھی کھنچتی تھیں۔ ہم سب نے وہاں جا کر تصویریں کھنچوائیں اور رفتہ رفتہ غنی سے بے تکلّفی ہو گئی۔ ایک روز کچھ ڈراموں کا

ذکر آیا تو انہوں نے کلب قائم کرنے کی تائید کی۔ وہ میک اپ کرنے کے بھی ماہر تھے۔ اُنہوں نے پُوری طرح تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔

اُس وقت تک ہمارے مُلک کی لڑکیاں ٹیڈی گرل نہیں بنی تھیں۔ یعنی وہ شمعِ محفل نہیں، چراغِ خانہ تھیں۔ شوقیہ ڈرامے پیش کرنے والوں کے ساتھ اُن کا میل جول ممکن نہیں تھا۔ پُرانی روایات پسند کرنے والوں کے نزدیک مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ حوّا کی بیٹیوں سے ڈرامے کے ضمن میں دُور رہا جائے۔ اس طرح زنانہ پارٹ ایسے لڑکوں سے کرایا جاتا تھا جو خدّوخال کی رعنائی اور نرم و نازک اعضا کے لوچ کے باعث صنفِ نازک کی صف میں شمار کیے جانے کے لائق ہوتے تھے۔

کالج کے زمانے میں عموماً میں نے اور انصار نے ایسے ڈرامے لکھے تھے جن میں عورت کا کردار بالکل نہیں یا برائے نام ہوتا تھا۔ تعلیمی دَور کے جو ساتھی ایسے تھے کہ زنانہ پارٹ کر سکتے، وہ فارغ التحصیل ہو کر مختلف مشاغل میں لگ گئے تھے۔ انہیں فرصت نہیں ملتی تھی یا پھر اپنے اپنے وطن چلے گئے تھے اور اس طرح ہماری رسائی اُن تک نہیں ہو سکتی تھی۔ شاہد نے ڈرامے مشن کالج میں کیے تھے جہاں مخلوط تعلیم رائج تھی۔ بیشتر عیسائی اور ہندو لڑکیاں وہاں پڑھتی تھیں اور ڈراموں میں شریک ہو جاتی تھیں۔ اشتیاق حسین قریشی، جو اِس وقت کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، وہاں پڑھنے اور پھر پڑھانے کے دَوران میں ڈراموں کے روحِ رواں تھے۔ خود ڈرامے لکھتے اور بڑی خوبی کے ساتھ اسٹیج کرتے اور خود حصّہ بھی لیتے تھے۔ شاہد کو ڈرامہ کرنے کا چسکا انہی کے ساتھ رہ کر لگا تھا۔ وہاں ان کے ایک اور ساتھی عبدالجبّار غازی تھے جو فارغ التحصیل ہو کر مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ وہ کچھ عرصے جماعت اسلامی میں مولانا مودودی کے دستِ راست رہے اور نظریاتی اختلافات کی بنا پر اب

ان سے علیحدہ ہو کر اپنی ہی ایک مذہبی اور معاشرتی تحریک کے سربراہ ہیں۔

اشتیاق حسین قریشی تو ہمارے ساتھ اشتراکِ عمل نہ کر سکے، البتہ جبّار غازی شریکِ انجمن ہو گئے۔ وہ اپنے دو لڑکوں کو بھی ساتھ لے آئے۔ شاید اس لیے کہ جو کام پدر سے نہ ہو سکے، وہ پسر تمام کر دے۔ اُن کے لڑکے احمد سلمان اور احمد عرفان اس اعتبار سے ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔ جبّار غازی کو چپ سوانگ دپینٹومائم) تیار کرنے اور پیش کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ مشن کالج ہی کے ایک اور فنکار اقبال حسین بھی ہم سے آملے۔ اُن کے چھوٹے بھائی ہم سب کے ہم جماعت رہے تھے۔ انہوں نے اشتیاق قریشی اور جبّار غازی کے ساتھ بڑی خوبی سے کالج کے ڈراموں میں حصّہ لیا تھا۔ بھیس بدلنے کے بعد تو وہ بالکل ہی دوسرے انسان ہو جاتے تھے۔ کالج چھوڑنے کے بعد وہ بھی لیکچرار ہو گئے تھے، لیکن ڈرامہ کرنے کی جو بیماری وہاں لگی تھی، وہ انہیں بے چین کیے رہتی تھی۔ انہوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حصّہ لیا۔ اب وہ بھی جماعت اسلامی کے ایک سرگرم رُکن ہیں اور ایک مستند حکیم کی حیثیت سے کراچی میں مطب کرتے ہیں۔

جن حافظ یوسف نے اختر رائے پوری کے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی کہ "معشوق تو اچھا ہے مگر ہونٹ موٹے ہیں" اُن کے ایک بھائی عبدالعزیز ہاشمی بھی دفتر ساقی میں کبھی کبھی آتے تھے۔ شاہد کے توسط سے ہم سب سے واقفیت تھی۔ انہوں نے ڈراموں کا سُنا تو تڑپ اُٹھے اور شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ وہ ولایت سے آئے ہوئے فوجیوں کو اُردو پڑھانے پر مامور تھے۔ شاہد نے اپنے ایک واقف کار صحافی محمد مرزا آزاد کو بُلا بھیجا۔ انہیں بھی ڈراموں کا مرض لاحق تھا۔ وہ شریکِ محفل ہو گئے۔ غرض یہ کہ بھان متی نے کسی نہ کسی طرح کُنبہ جوڑ دیا۔ "بزمِ تہذیب" وجود میں آ گئی۔ شاہد اس کے سیکرٹری

منتخب ہو گئے۔ ڈرامے میں ہدایت کاری کا کام جبّار غازی کے سپرد کیا گیا۔ اس بزم کا دفتر بھی دفتر ساقی میں قائم ہو گیا۔ یہ طے پایا کہ اس بزم کے تحت دوسرے ادبی جلسے بھی ہوا کریں۔ ساقی میں اس کا اعلان کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا گیا، لیکن دوسرے اخبارات و رسائل نے بھی اس کی تشہیر کی۔

بزم کی طرف سے پیش کیے جانے کے لیے پہلا ڈرامہ لکھنے کی فرمائش مجھ سے کی گئی۔ اُن دنوں اُردو ہندی کا قضیہ ہندوستان کے سیاسی محاذ پر وجہ نزاع بنا ہوا تھا۔ گاندھی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ "اُردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے، مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور فروغ دیا ہے۔ مسلمان چاہیں تو اسے ترقّی دیں۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں"۔ اس بیان پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ ساقی نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ مَیں نے گاندھی کے بیان ہی کو سامنے رکھ کر ایک المیہ لکھ ڈالا۔ "لیڈر" اس کا نام رکھا گیا۔ ۱۹۲۸ء-۱۹۲۹ء-۱۹۳۰ء میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں رہ کر میں نے کانگریس تحریک کو اچھّی طرح سمجھا تھا۔ گاندھی، موتی لال نہرو، عبدالغفار خاں، مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری اور آصف علی سے مُلاقاتیں رہی تھیں۔ مجھے اس تحریک اور اس تحریک میں حصّہ لینے والوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ لہٰذا ڈرامے میں ایسے افراد کی ذہنیتوں کو بے نقاب کیا گیا۔ ڈرامے کے دو اہم کردار موہن داس اور کرم چند تھے۔ سمجھنے والے سمجھ گئے کہ گاندھی کی طرف اشارہ ہے۔ ڈرامہ لکھنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا گیا کہ براہِ راست کسی پر حملہ ثابت نہ ہو سکے۔ صرف ایمائی کیفیتوں سے اندازہ کر لیا جائے۔

ڈرامے میں ایک اور اہم کردار ڈاکٹر کا اور ایک اس کی نرس کا تھا۔ نرس کا پارٹ ادا کرنے کے لیے ظفر قریشی نے اپنے ایک گہرے دوست اخلاق احمد دہلوی کو

راضی کر لیا۔ وہ دوسرے ڈرامے میں ہیروئن کا پارٹ کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ دوسرے احباب سے اُس وقت تک اخلاق کی معمولی شناسائی تھی۔ وہ اُن دنوں چھریرے بدن کے بہت ہی خوبصورت نوجوان تھے۔ ان کی آواز سُریلی ہونے کے علاوہ ایک نوجوان لڑکی کی صوتی خصوصیات کی حامل تھی۔ اُن میں وہ جملہ صفات بھی موجود تھیں جو زنانہ پارٹ کرنے کے لائق لڑکے میں ضروری ہوتی ہیں اور اُوپر بیان کی گئی ہیں۔ اپنی رائے ان کے بارے میں یہ تھی کہ اُن کا قالب ڈھالتے وقت سانچے کے انتخاب میں شاید قدرت کے فن کاروں سے تھوڑی سی چُوک ہو گئی تھی۔ اسی لیے وہ عورت سے مرد بن گئے ہیں، لیکن جس خمیر سے بنائے گئے ہیں، وہ یکسر زنانہ حُسن و رعنائی کا حامل ہے۔ وہ شروع سے ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ آج کل ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہیں۔

"لیڈر" مشکل سے ایک گھنٹے کا المیہ ڈرامہ تھا۔ عوام کی دلچسپی کے خیال سے میں نے ایک مزاحیہ ڈرامہ "زبردستی کی شادی" بھی لکھا جو مولیئر کے ایک ڈرامے "فورسڈ میرج" سے اخذ کیا گیا تھا۔ اور جبّار غازی نے ایک چپ سوانگ کی تشکیل کی۔ "بطخوں کا پُل" اس کا نام رکھّا گیا۔ اس طرح مجوّزہ پیش کش نے ایک ورائٹی پروگرام کی صورت اختیار کر لی۔ ان تینوں میں افرادِ تمثیل کی تعداد زیادہ تھی اور کام کرنے والوں کی تعداد کم۔ اس لیے طے پایا کہ بعض ساتھی روپ بدل بدل کر سب چیزوں میں حصّہ لیں اور ایک سے زیادہ افراد کا پارٹ ادا کریں۔

بعد نمازِ مغرب ان سب کی ریہرسل دفتر ساقی میں ہونے لگی۔ یعنی ادارت کے فرائض ختم ہونے کے بعد اداکاری کی ذمّے داریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ ہم زرق برق لباس اور محیّر العقل سین سینریوں کے قائل نہیں تھے۔ سادگی پسندی ہمارا شیوہ

تھا۔ میں نے ایک برطانوی ڈرامہ کمپنی کی منتظمہ مونیکا ایور کی کتاب اس موضوع پر پڑھی تھی جس میں سادے پردے بنانے اور انہیں استعمال کرنے کی ہدایات درج تھیں۔ میری تجویز پر بزم کے اراکین نے ویسے ہی پردے بنوانے پسند کیے۔ دفتر ساقی کے حسابات میں سے بطور قرض کچھ رقم نکالی گئی۔ یہ طے پایا کہ ٹکٹوں کی فروخت کے بعد اخراجات نکال کر خالص آمدنی کالج کے بلڈنگ فنڈ میں دے دی جائے گی۔ اُس زمانے میں نہ تفریحی ٹیکس عائد ہوتا تھا اور نہ شوقیہ ڈراموں کی اجازت کسی محکمے سے لینی پڑتی تھی۔

پیشہ ور کمپنیاں جب ڈراموں کی تیاری کرتی ہیں تو بہت سی دقّتوں کا سامنا ہوتا ہے، چہ جائیکہ عطائی کمپنیاں کہ ان کے وسائل بہت ہی محدود ہوتے ہیں اور کام کرنے والوں کے اصل مشاغل اداکاری کے علاوہ کچھ اور ہوتے ہیں۔ وہ کبھی باقاعدگی سے ریہرسل میں حصّہ نہیں لیتے اور چونکہ انہیں عموماً کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا، اس لیے پابندیٔ وقت کا لحاظ رکھنے کے لیے انہیں زیادہ مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اخلاقی دباؤ کافی سمجھا جاتا ہے۔ ہماری بزم کے اراکین نے چند روز تو بڑے ذوق و شوق کا اظہار کیا، لیکن پھر ان چار پانچ احباب کے سوا جو روزانہ دفتر ساقی میں آنے والے تھے، باقی نے بے قاعدگی شروع کر دی۔ کبھی کبھی بالکل ناغہ ہونے لگی۔ کچھ ساتھی ایسے بھی تھے جنہوں نے صحیح سنجیدگی سے حصّہ لینا نہیں چاہا۔ وہ دفتر ساقی میں آتے اور ریہرسل میں معقولیت کے ساتھ حصّہ لینے کی بجائے کوئی رسالہ یا کتاب پڑھنے لگتے، گاؤ تکیے پہ سر رکھ کر ایک کونے میں لیٹ جاتے اور جب ان کی باری آتی تو وہیں سے مکالمے کے الفاظ بولنے لگتے۔ یقیناً ان کا یہ رویّہ دوسروں کو ناگوار گزرتا تھا۔ ایسے لوگوں میں ممتاز حسین سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ دراصل

انہیں ڈرامہ کرنے کا شوق ہی نہیں تھا۔ سب کے مجبور کرنے سے شریکِ محفل ہو گئے تھے۔ اُن کے قابلِ اعتراض رویّے پر کچھ ساتھی ناراض بھی ہونے لگتے اور ایک روز معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ان میں اور انصار ناصری میں سخت کلامی ہونے لگی اور نوبت ہاتھا پائی کی آگئی۔ ایک زوردار مُکّہ لگنے سے انصار کے دانتوں میں سے خون بہہ نکلا۔ ممتاز کی عینک شہید ہو گئی۔ غنیمت ہے کہ آنکھ بچ گئی، ورنہ آج ان کے اسکول کے شریر لڑکے اپنے پرنسپل کو موشے دایان کا بڑا بھائی کہتے۔

اس چپقلش کے بعد دو روز تک ریہرسل نہیں ہوئی۔ ابتدائے سفر ہی میں ہماری کشتی ڈوبتی نظر آئی تو شاہد نے اور مَیں نے چپّو لگا کر اسے منجدھار سے نکالا۔ طے پایا کہ آئندہ ریہرسل دفترِ ساقی میں نہیں، عربک کالج ہی کے ایک ہال میں ہُوا کرے گی۔ پرنسپل سے اس کی اجازت مل گئی۔ اس عمارت کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ بیشتر افراد کے لیے وہاں پہنچنا آسان تھا۔ پھر دفترِ ساقی کا سا آرام اور دوسری سہولتیں نہ ملنے کے باعث توجّہ ڈرامے کی طرف زیادہ مرکوز ہو سکتی تھی۔ وہاں ایک نوجوان عیسائی ایس ایم سنگھ اور عربک اسکول کے دو استاد محمود مظفر اور ابوالحسن بھی ہمارے ساتھ آملے۔ سنگھ، اخلاق احمد کی طرح ظفر قریشی کے دوست تھے اور انہی کے ساتھ گورنمنٹ پریس میں ملازم تھے۔ وہ انگریزی زبان کے بعض مذہبی ڈراموں میں حصّہ لیتے رہے تھے۔ ان تین افراد کی شرکت سے بعض دوسروں کا بوجھ ذرا ہلکا ہو گیا جنہیں ایک سے زیادہ کردار تفویض کیے گئے تھے۔

جب عربک کالج میں ریہرسل شروع ہوئی تو مَیں نے چند دن غیر حاضر رہنے کی اجازت مانگی۔ ڈرامے مَیں نے لکھے تھے اور مکالمے مجھے ازبر تھے۔ لہٰذا مجھے اجازت مل گئی، لیکن ریہرسل باقاعدہ ہوتی رہی۔ ایک ہفتے بعد مَیں پھر شامل ہُوا

تو یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا کہ میری عدم موجودگی میں ڈراموں کے مسوّدات میں غیر معمولی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ مثلاً ایس ایم سنگھ، جو عیسائی تھے، اُردو ذرا کم جانتے تھے، بعض الفاظ اور جُملے روانی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ تبدیل کر دیے گئے۔ محمود مظفر اور ابوالحسن ادیب نہیں تھے اور نہ ادب کو اچھی طرح سمجھتے تھے، ایک ریاضی کے اور دوسرے سائنس کے اُستاد تھے۔ ہر تحریر پر اصلاح دینا اور اُستادی کی شان دکھانا اُن کی عادت میں شامل تھا، لہٰذا ان کے مشورے سے بھی چند جملے بدل دیے گئے۔ غرض یہ کہ جس نے جو تجویز پیش کی، مان لی گئی۔ سب سے بڑا ستم یہ ہُوا کہ میرے ڈرامے "لیڈر" میں ڈاکٹر کا کردار جبّار غازی کی رائے کے مطابق اس طرح مسخ کیا گیا کہ المیہ ایک دم مزاحیہ بن کر رہ گیا۔ مَیں نے سخت احتجاج کیا۔ مَیں خاص طور پر ڈاکٹر کے کردار میں کسی تبدیلی کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ آخر پنچوں کی رائے سے یہ معاملہ ایک عالم ڈاکٹر ایس اے ہاشمی کے سپرد ہُوا۔ وہ اُن دنوں دِلّی کے اچھے معالجین میں شمار ہوتے تھے اور خود ادیب بھی تھے۔ آج کل کراچی میں مطب کرتے ہیں۔ اُن سے یہ استفسار کیا گیا کہ ڈرامے کے نفس مضمون اور اس میں پیش کی ہوئی صورتِ حالات کی روشنی میں جو الفاظ ڈاکٹر کی زبان سے ادا کرائے گئے ہیں، وہ فطری ہیں یا غیر فطری۔ ثالث کا فیصلہ میرے حق میں ہو گیا اور اس طرح ڈرامے بالکل اصل مسوّدات کے مطابق پیش کر دیے گئے۔ تین دن یعنی ۵ تا ۷ رفروری ۱۹۴۰ء یہ ڈرامے عوام کے سامنے پیش کیے گئے۔ اخبارات میں خوب چرچا ہوتا رہا۔ دوسری انجمنوں نے ہم سب کو مبارکباد دی اور تعریف کے پھُول برسائے گئے۔

ڈراموں کی کامیابی نے سابقہ بدمزگیوں کو دُور کر دیا۔ آپس کی شکایت خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ ویسے مَیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے ہر طرح تیار تھا۔ اگر پنچوں کی رائے سے ثالث مقرر نہ ہوتا اور یہ فیصلہ کیا جاتا کہ مسوّدے حسبِ ضرورت تبدیل کیے

جائیں گے تو میں مصلحتاً اسے مان لیتا، کیونکہ ابتدائی اخراجات کے سلسلے میں شاہد نے دفترِ ساقی کے حسابات میں سے ایک بڑی رقم اس مد میں صرف کر دی تھی۔ اگر بزم کے ڈرامے نہ ہوتے تو انہیں بڑا نقصان اُٹھانا پڑتا۔

تین دن تک بکنگ غیر معمولی رہی اور مصارف نکال کر ہم نے کالج فنڈ میں ساڑھے تین ہزار روپے دے دیے۔ ہمارے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ آئندہ بھی ڈرامے کرتے رہنے کے منصوبے فوراً بننے لگے۔

جب شاہد کی زیادہ توجہ پکے گانے کی طرف مبذول ہوئی اور غزل گانے کو ایک حد تک وہ تضیعِ اوقات سمجھنے لگے تو دفتر ساقی میں شام کے وقت موسیقی کی محفلیں بالکل ختم ہو گئیں۔ وہ رات کا کھانا ذرا سویرے سے کھا کر اُستاد چاند خاں کے ہاں چلے جاتے اور گیارہ بارہ بجے وہاں رہ کر خوب ریاض کر کے واپس آتے تھے۔ اس طرح فلم دیکھنے کے شوق میں بھی نسبتاً کمی ہو گئی تھی اور جوتے غائب ہو جانے کا اندیشہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود شام کے وقت دفترِ ساقی میں ہم لوگوں کی نشست کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ کبھی حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوتا ——— کیوں کہ دوسری جنگِ عظیم تیزی پکڑتی جا رہی تھی اور یورپ کے مختلف محاذوں کی ہولناک خبریں ریڈیو سے سُنائی دیتی تھیں ——— اور کبھی کوئی علمی بحث چھڑ جاتی تھی۔ ممتاز سب سے زیادہ فلسفہ بگھارتے اور شاہد چھیڑ خانی کر کے مزا لیتے تھے۔

ایک روز شاہد کو خیال آیا کہ ہم لوگ اپنی صحت کی طرف مطلقاً کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اب نہیں تو کچھ عرصے میں اس غفلت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ لہٰذا تجویز پیش ہوئی کہ روزانہ شام کو ایک یا ڈیڑھ گھنٹے تک پہلوانوں کی طرح باقاعدہ کسرت ہوا

کرے۔ ہر شخص اپنا اپنا لنگوٹ، تولیہ اور صابن لے آیا۔ وہ چھوٹا سا کمرہ، جس میں بند ہو کر اختر رائے پوری نے کئی افسانے لکھے تھے، یہ سامان رکھنے کے لیے مخصوص ہو گیا۔ مالش کے لیے کڑوا تیل بھی منگا کر رکھ لیا گیا۔ ملازم کو ہدایت کر دی گئی کہ تم روزانہ مکان کے صدر دروازے پر بیٹھا کرو تاکہ کوئی شخص بغیر اطلاع اُوپر نہ آسکے۔ ہم کاغذی پہلوانوں کے اس اکھاڑے میں شاہد کے بھائی چھجّن (سراج الدین احمد) بطورِ خاص حصّہ لیتے تھے۔ وہ اس فن کے اُستاد مان لیے گئے تھے، کیونکہ ان کا جسم ہم سب سے زیادہ تگڑا اور پہلے سے کسی قدر کسرتی معلوم ہوتا تھا۔

پانچ بجے تک ہم سب جمع ہو جاتے، سب کے لباس اُتر کر کھونٹیوں پر لٹک جاتے۔ ایک دوسرے کے جسم پر مالش کی جاتی اور دفترِ ساقی کے اکھاڑے میں جو کچّی زمین پر نہیں پکّے فرش پر تھا، سب مِل کر ڈنٹر پیلتے، بیٹھکیاں لگاتے اور باقاعدہ ریاض کرنے لگے۔ ہم میں صرف شاہد کے گلے میں ایک موٹا سا تعویذ کالے ڈورے میں منسلک پڑا رہتا تھا جو تیل مالش کے وقت ذرا پریشان کرتا، لیکن شاہد اسے عارضی طور پر بھی اُتار دینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ نہ جانے کس کی منّت کا تھا اور کس نے ان کی گردن میں کس کی تسخیر کے لیے ڈالا تھا جو ہر وقت ان کے سینے پر اپنا نقش جمائے رکھتا تھا —— اُن کے چوڑے چکلے سینے پر اُس وقت بھی جب وہ ورزش کے لیے کُرتہ اور بنیان اُتار کر اسے عُریاں کر دیتے تھے۔

اصولاً یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اس نئے شوق پر احتساب کا انکس ضرور لگا یا جائے یعنی ورزش اتنی نہ ہو کہ بجائے فائدے کے نقصان اُٹھانا پڑے، لیکن ایک ہفتے تک تو تھکن ایسی محسوس ہوئی کہ سب کا بُرا حال ہو گیا۔ پھر کچھ کچھ عادی ہونے لگے۔ کسرت ختم کر کے سب لوگ وہیں حمّام میں نہاتے اور گرم گرم دُودھ پی کر کچھ دیر کے لیے لیٹ جاتے

تھے۔ فوراً گھروں کو جانے کی ہمت کسی میں نہ ہوتی تھی، لیکن یہ مشغلہ زیادہ عرصے نہ چل سکا۔ پیر ولایت حسین کے سوا باقی سب دوستوں کی صحت بننے کی بجائے بگڑنے لگی۔ بھلا قلم کو ورزش کرانے والے اپنے جسموں کو ورزش کرا کے کس طرح پنپ سکتے تھے۔ دراصل وہ وقت ہم لوگوں کے لیے مناسب بھی نہیں تھا۔ شاہد گیارہ بجے تک موسیقی کی محفل میں شریک رہتے اور دن بھر ساقی کا کام کرتے تو شام تک تھک جاتے تھے۔ انصار دن کو عدالتوں میں قانونی موشگافیاں کرتے اور رات کو گیارہ بجے تک موکلوں کے بیانات سُن کر جھوٹ کو سچ اور حقیقت کو فریب بنانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ممتاز کا سارا دن طالبِ علموں کو درس دینے اور ان کے دماغوں پر صیقل کرنے میں گزرتا تھا۔ میری مصروفیات بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ البتّہ پیر جی مزے کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بکری تک نہیں پالی جس کا غم ہوتا۔ پیروں کی طرح کھاتے اور ملنگوں کی طرح دندناتے تھے۔

اس مشغلے میں مشکل سے دو ماہ گزرے ہوں گے کہ چھٹن شکار کھیلنے کے لیے اپنے بڑے بھائی منذر کے ساتھ نجیب آباد کے جنگلوں میں چلے گئے۔ ممتاز کو بخار آنے لگا۔ انصار کی وکالت نے کچھ زیادہ رنگ جمانا شروع کیا۔ لہٰذا اکھاڑا ویران ہوگیا۔ سب نے اپنے تولیے اور صابن کی ٹکیاں شاہد کے ملازم کو بخش دیں۔ مالش کا تیل موری میں بہا دیا گیا۔ شام کی نشستیں گنڈے دار ہونے لگیں۔ کبھی کوئی آتا، کبھی کوئی اور بارہا شاہد نہ ملتے تو آنے والوں کو مایوس ہو کر لوٹ جانا پڑتا۔

اِس دَورِ زندگی کے ستائیس سال بعد جب تابش دہلوی نے اچانک ٹیلیفون پر شاہد کے سانحۂ ارتحال کی خبر سُنائی اور مَیں اُن کو ہمیشہ کے لیے رخصت کرنے کی غرض سے اُن کے گھر پہنچ کر ایک کمرۂ انتظار میں بیٹھ گیا اور ایک بار ان کے ہم زلف عبدالعزیز

کی غلطی سے درمیانی کواڑ کھل گئے تو وہی چوڑا چکلا سینہ عریاں نظر آگیا جس پر ۱۹۴۰ء میں ہم سب باری باری تیل ملا کرتے تھے۔ انہیں نہلانے کے لیے اُسی وقت تختے پر لٹایا گیا تھا۔ گلے میں پڑا ہوا تعویز اُس وقت بھی ان کے سینے پر مچل رہا تھا جو شاید بعد میں غسّال نے اُتار دیا ہوگا۔ اُن کے نصف حصّہ جسم پر تہمد لپٹا ہوا تھا ـــــ اسی جیسا تہمد جو دفتر ساقی میں سُدرشن کی آمد کے وقت وہ باندھے شیو کر رہے تھے۔ اُن کا سینہ دیکھ کر میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھی، سرد آہ کو مَیں ضبط نہ کر سکا اور وہ آنسو جو بڑی کوشش سے روک رکھے تھے، صورتِ سیلاب بہہ نکلے۔

۱۹۴۰ء کے وسط میں شاہد و ساقی کی زندگی کا پہلا دَور ختم ہُوا۔ دُوسرے اور تیسرے دَور کی یاد پھر کسی اور موقعہ پر تازہ کی جائے گی، بشرطیکہ خود میری زندگی نے اُس وقت تک میرا ساتھ دیا۔ شاہد مجھ سے صرف ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ وہ فوت ہو گئے تو اپنی باری بھی قریب آ ہی گئی ہے۔

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں

عشرت رحمانی

یادش بخیر —— یہ اُس زمانے کی بات ہے کہ مَیں دہلی میں زیرِ تعلیم تھا۔ رامپور سے میرے ایک فاضل دوست مولانا عزیز اللہ خاں تنقیدی ماہنامہ "نیرنگ" نکالتے تھے۔ وہ اپنی شدید علالت کے سبب رسالہ جاری رکھنے سے معذور ہوئے اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ نیرنگ کو دہلی منتقل کر دیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ دہلی میں رامپور کے مقابلے میں طباعتی سہولتیں بہتر اسلوب سے میسّر آسکتی تھیں۔ مَیں نے اُن کی اس خواہش کے احترام میں سرِ تسلیم خم کیا اور دہلی کے چند بزرگوں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ، بھیّا فقیر عشقی مرحوم، مُلّا واحدی صاحب، پروفیسر اکبر حیدری مرحوم اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی مرحوم سے مشورہ کر کے "نیرنگ" اپنی ملکیت اور ادارت میں نکالنے کا اہتمام کر لیا۔ مَیں کالج کے ابتدائی ایّام سے گیسوئے ادب کا شیدائی تھا اور تعلیمی مصروفیات سے جو وقت بچتا، وہ اربابِ علم و ادب کی خدمت میں اکتسابِ فیض کی غرض سے گزارتا اور بزعمِ خود قلم گھسنے میں مصروف

رہتا۔ یہ ذکر ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان کا ہے۔

نیرنگ اُس دَور کا تنقیدی مجلّہ تھا جس میں اُردو شعر و ادب پر بے لاگ تنقیدی مضامین اور تبصرے شائع ہوا کرتے تھے اور مُلک کے نامور نقادانِ ادب اسے اپنے گرامی افکار و خیالات سے نوازتے، جن میں متذکرہ بالا حضرات کے علاوہ خصوصیت سے لسانُ الہند مولانا عزیز لکھنوی، حضرت صفی لکھنوی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، حضرت آرزو لکھنوی، حضرت محشر لکھنوی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، میر ناصر نذیر فراق دہلوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، پروفیسر اولاد حسین شاداں بلگرامی، پروفیسر محمد نقی شادماں لکھنوی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی نعمانی رامپوری، حضرت بیخود دہلوی، نواب سراج الدّین احمد خاں سائل دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی اور دیگر اکابرینِ علم و ادب کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر تھے۔ اسی دَوران شاہد احمد دہلوی نے رسالہ 'ساقی' جاری کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں نئے لکھنے والوں کا ایک حلقہ ان کے گِرد جمع ہو گیا جن میں اُس دَور کے وہ نوجوان اصحاب شریک تھے جنہوں نے کالج کی تعلیم سے فراغت کر کے اپنی زندگی کا نیا دَور شروع کیا تھا۔ اُن میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے مختلف مقامات کے خوش ذوق اصحاب شامل تھے۔ ان کے علاوہ دہلی کی تمام بزرگ ہستیوں نے 'ساقی' اور شاہد کی سرپرستی کمال خلوص و محبّت سے قبول کی اور اُسی زمانے میں میری ملاقات شاہد صاحب سے ہوئی۔ وہ اُس وقت بہت کم سُخن اور کم آمیز ہونے کے ساتھ لکھنے لکھانے کی طرف بھی بہت کم مائل تھے۔ اُن کی فرمائش پر میں نے 'ساقی' کے ابتدائی شماروں کے لیے چند مضامین اور نظمیں پیش کیں جو شائع ہوئیں۔ اس طرح 'نیرنگ' اور

'ساقی'، کے درمیان معاصرانہ تعلّقات کا سلسلہ قائم ہوا اور شاہد صاحب کی اور میری ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد شاہد صاحب کے حلقۂ احباب میں 'نیرنگ'، کی نسبت یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی کہ نیرنگ، ساقی کا حریف ہے، حالانکہ اس کی کوئی معقول وجہ اور بنیاد نظر نہ آتی تھی، تاہم نتیجہ یہ ہوا کہ 'ساقی' میں جس طرح "نیاز مندانِ لاہور" کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے، 'نیرنگ' پر بھی طعنہ زنی کی جانے لگی اور اس طرح خواہ مخواہ 'نیرنگ' اور 'ساقی'، کے دو مختلف حلقے بن گئے اور اِن دونوں میں ٹھن گئی - اس کا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ ساقی اور 'نیاز مندانِ لاہور'، کی ادبی نوک جھونک کو معقولیت سے ختم کرنے کی غرض سے مَیں نے 'نیرنگ' میں ایک مقالہ شائع کر کے مصالحت کرانی چاہی جس پر 'ساقی'، کے ناقدین نے برافروختگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے مطعون قرار دیا اور جب مَیں نے ایک مقالے میں ان کی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے صفائی پیش کی اور عرض کیا کہ ؏

ہم سخن فہم ہیں ساقی کے طرفدار نہیں

تو اس پر خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا اور شاہد صاحب کے طرف داروں نے انہیں میرے خلاف طرح طرح سے اُکسا کر یہ یقین دلانے کی سعئ بے جا کی کہ مَیں دہلی والوں اور "ساقی" کا مخالف ہوں - اس طرح شاہد صاحب سے میری جو شناسائی 'ساقی'، کی بدولت ہوئی تھی وہ اسی 'ساقی'، کے حوالے سے معاندانہ چشمک کی صورت اختیار کر گئی - دراصل شاہد صاحب فطرۃً نہایت سادہ لوح اور سادہ دل واقع ہوئے تھے - نامور خاندان کے چشم و چراغ —— برگزیدہ عالم و ادیب شمس العلماء علّامہ نذیر احمد کے پوتے اور فاضل وقائع نگار و مؤرّخ

مولوی بشیر الدین احمد کے صاحب زادے ہونے کے ساتھ وافر علمی ادبی ورثے کے مالک تھے۔ باپ دادا کا علمی ذخیرہ اور معقول جائداد اُنہیں فکرِ معاش سے آزاد کیے ہوئے تھی۔ اُن کے برادرِ بزرگ منذر احمد صاحب حکومتِ ہند کے ایک اعلیٰ عہدیدار تھے۔ شاہد احمد خاندانی مطبوعاتِ علمیہ کے واحد منتظم تھے اور کتابوں کے منافع کا ایک قلیل حصّہ 'ساقی' پر بے دریغ خرچ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسی لیے ان کے گرد جمع ہونے والے بعض نوخیز ادیبوں نے اُنہیں اپنے زیرِ اثر رکھنے میں اپنی عافیت سمجھی اور اُن کی سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھا کر شاہد و ساقی کو اپنی ذات کے لیے محدود و مخصوص کرنا مناسب سمجھا۔ لُطف یہ ہے کہ جن اصحاب نے شاہد احمد کو میری مخالفت پر آمادہ کیا، اُن میں سے اکثر مجھ سے ملتے اور خلوص کا اظہار کرتے نظر آتے تھے۔ نیز "بزمِ نیرنگ" میں شریک تھے۔ قصّہ مختصر عشرت و شاہد اور نیرنگ و ساقی بمصداق "عیسیٰ بدینِ خود موسیٰ بدینِ خود" اپنے اپنے اسلوب و روش کے مطابق چلتے رہے اور خدمتِ زبان و ادب میں مصروف —— اس کے ساتھ شاہد صاحب کے بعض مخصوص نیازمند خدمتِ ذات کو مطمحِ نظر بنائے ساقی کی روشِ لُطف و کرم سے مستفید ہوتے رہے۔ ان آنکھوں نے بزمِ شاہد کی روز کی رونقیں بھی دیکھی ہیں اور احباب کو شاہد صاحب کے دسترخوان پر ہر طرح ہاتھ صاف کرتے بھی پایا ہے، کیونکہ یہ مجلس آرائیاں اُن کے روز کے معمولات میں شامل سرِ بازار نظر آتی تھیں اور جیسا عرض کیا جا چکا ہے ان میں شریک ہونے والے اکثر حضرات میری دوستی کا نہیں تو شناسائی کا دَم ضرور بھرتے تھے اور ملاقات کے دَوران اپنی محفل کا ذکر سُناتے رہتے تھے، البتّہ ان میں بعض

مخلص اصحاب مثلاً محبیؔ سید انصار ناصری بھی شامل تھے جو رفع شر کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے، مگر شاہد صاحب ان سے اتنے متاثر نہ تھے جتنے دوسرے چکنی چپڑی باتیں بنانے والے ظاہردار بیگ قسم کے لوگوں سے، اور انہیں کے زیرِ اثر وہ ایسی باتیں بھی کر گزرتے جو ان کی شان کے شایان تھیں نہ اُفتادِ طبع کے مطابق۔ غرض یہ کہ شاہد صاحب ابتدا سے دل کے صاف اور کانوں کے کچّے رہے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ 'ساقی گری' کے پردے میں خوشامد پسندوں نے انہیں خوب بنایا اور ان کی بدولت صرف شہرت ہی حاصل نہیں کی، بلکہ اپنے ہم قسم اغراض و مقاصد کے حصول کی غرض سے شاہد صاحب کو ایک موثّر ذریعہ بنایا، اور بعد میں یہی حضرات ان کو بدنام کرنے کے بھی درپے ہوئے۔

تمہیدی سطور میں راقم الحروف نے اپنا اور 'نیرنگ' کا ذکر محض اس لیے ضروری سمجھا کہ ایک تو اس ذیل میں یہ واضح کرنا تھا کہ مَیں نے شاہد صاحب کو کب سے اور کس کس طرح جانا، علاوہ ازیں اس سلسلے میں ان کی ذات و صفات کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور ان حقائق کو سامنے رکھ کر لامحالہ یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ شاہد احمد ایک ایسی ہستی کا نام تھا جس کے مصفّا و مجلّا آئینۂ دل میں اگر کبھی کوئی بال یا تکدّر کا میل آیا تو اس کے ذمّہ دار ان کے گرد و پیش کے بعض حالات اور ان کے احباب کی غلط کوشیاں رہی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل بیان کروں تو طوالت کا خوف ہے۔ مختصراً یہ اظہار کافی ہے کہ مَیں تعلیم سے فارغ ہو کر دہلی ہی میں محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو گیا اور نیرنگ بھی جاری رہا۔ یہ مدّت اکتوبر ۱۹۳۲ء سے مئی ۱۹۳۹ء تک کی تھی اور اس دَوران میرے اور شاہد صاحب کے درمیان جو معاصرانہ چشمک تھی وہ اغراض پرست دوستوں کی بدولت

جاری رہی اور جوں ہی میں نے آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو کر غیر معمولی مصروفیات کی بنا پر نیرنگ بند کیا اور لکھنؤ تبادلہ ہونے کے سبب دہلی سے رخصت ہوا، شاہد صاحب نے از خود دوستانہ تعلقات کی تجدید کے لیے ہاتھ بڑھایا اور رفتہ رفتہ سارا تکدر دُور ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی سادہ دلی نے مجھ پر ساقی اور نیرنگ کے اختلافی دَور کے سارے حالات منکشف کر دیے۔ مَیں نے اندازہ لگایا کہ شاہد صاحب کتنے صاف گو اور یار باش انسان ہیں۔ انہیں اپنے بعض ساتھیوں کے خلاف شکایت تھی جو بہ ظاہر اپنے کو ان کا ادنیٰ نیاز مند اور مخلص دوست کہتے، مگر در پردہ ان کے نفع و نقصان سے بے پروا اُن کی غیبت میں مصروف نظر آتے۔ ان کا مذاق اُڑاتے اور اِدھر اُدھر یہ جتانے سے بھی باز نہ آتے کہ 'ساقی گری' کی زیادہ تر ذمّہ داری ان نیاز مندوں ہی کے سر ہے۔ شاہد صاحب تو بس اپنے نام کے لیے سرمایہ لگاتے ہیں اور بس۔ رفتہ رفتہ ان حضرات کی یہ باتیں شاہد صاحب کے کانوں میں بھی پڑیں، مگر ان کی عالی ظرفی نے ہنس کر ٹالا اور کبھی پیشانی پر بل نہ آنے دیا۔ ظاہر پرستوں کے 'مدارا' کا جواب خندہ پیشانی سے ہی دیتے اور ان کی فرمائشوں کی ہنسی خوشی تعمیل کرتے رہے، اور مجھے یہ کہتے دُکھ ہی ہوتا ہے کہ آج ان میں سے اکثر اپنے اس محسن کو طرح طرح سے مطعون کر رہے ہیں۔ اُن کے اَن گنت احسانات اور اُن کی خوبیوں کا ذکر کرنے کے بجائے نہایت مدبّرانہ انداز میں غلط باتیں کرتے اور جو کچھ اُن کے سامنے کہنے کی جراٴت نہ کر سکتے تھے، اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی ڈھٹائی سے بیان کر کے اپنے باطن کو فاش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر آدمی میں خوبیوں اور بھلائیوں کے ساتھ کچھ کمیاں اور کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔

کسی آدمی کی برتری پر اس کی کمزوریوں کے اظہار سے خاک نہیں پڑتی۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ خوبیوں اور بُرائیوں میں کِن کا پلّہ زیادہ بھاری ہے۔ اگر خوبیاں زیادہ ہیں تو کمزوریوں اور بُرائیوں کا پلّہ خود بخود جُھک جاتا اور اس آدمی کو خوب سے خوب تر جتانا نظر آتا ہے، لیکن ہمارے ہاں یہ عجیب دستور ہے کہ کسی نامور یا مشہور شخصیت کا جب اس کے واقف کار یا ساتھی ذکر کرنے بیٹھتے ہیں تو یا تو اس کی خُوبیوں کو گِناتے ہوئے اسے مافوق البشر قرار دینے کی سعئ لاحاصل کرتے ہیں اور یا اس کی زندگی کی کسی کوتاہی کا جس کا تعلق خود ذکر کرنے والوں کی ذات سے رہا ہو، انتقام لینے کے نامبارک جذبے کے تحت اس انداز سے ذکر کرتے ہیں کہ جیسے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موصوف میں جو صفات تھیں اُن میں ہماری ذات کا پرتَو تھا یعنی ہماری صحبت نے اسے اس لائق بنا دیا تھا ورنہ بُنیادی طور پر تو اس میں ایسی ایسی خامیاں اور کمزوریاں تھیں کہ ہماری تربیّت کے فیض نے اس کی ذاتی کمزوری کو دُور نہ کیا۔ ہم نے لاکھ منع کیا کہ فلاں بات نہ کرو، مگر اُس اللہ کے بندے نے اپنی ضد میں ہماری ایک نہ مانی اور اس کمزوری کے سبب ان تمام صفات پر جو ہمارے اثر سے اس میں پیدا ہوئیں، پانی پھیرنے کی کوشش کی۔

شاہد صاحب کے تذکرہ نویسوں میں سے بعض نام نہاد 'مخلصین' ان کا ذکر اسی اسلوب سے کرتے نظر آئے، گویا وہ اس انتظار میں تھے کہ کب اس شخص کی آنکھیں بند ہوں اور ہم اپنی بھڑاس نکالیں۔ میں نے اس مضمون کی تمہید میں اسی غرض سے ان حالات کا مختصراً تذکرہ مناسب، بلکہ ضروری سمجھا کہ میں برملا حقائق کا اظہار کر دوں تو میرے قارئین اس مغالطے میں مبتلا نہ

ہوں کہ تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرنے پر مُصر ہوں اور شاہد صاحب کی مدّاحی میں جانب داری سے کام لے کر مبالغہ کر رہا ہوں۔ مَیں جو کچھ شاہد صاحب کی حیات میں انہیں سمجھتا اور کہتا رہا وہی ان کی ذات و صفات کی نسبت بیان کر رہا ہوں اور ہر حال میں یہی ایمان رکھتا ہوں کہ ع

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں

شاہد صاحب کی سادہ دلی اور صفائی قلب کا اظہار کر چکا ہوں اس کی بہت سی مثالیں ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات ہیں جن کو تفصیل سے بیان کروں تو ایک کتاب کی طوالت چاہیے۔ "مُشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق چند باتیں یہاں پیش کرتا ہوں۔

شاہد صاحب عام طور پر بہت کم طیش میں آتے تھے۔ اگر کسی معمولی بات پر انہیں کبھی غصّہ آتا تو اکثر یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے کہ "چلیے چھوڑیے" لیکن جب وہ کبھی کسی سنجیدہ معاملے میں کسی کے خلاف جوش میں آتے تو کچھ دیر جلے بھُنے رہتے اور اس کی مخالفت پر آمادہ رہتے۔ پھر یہ جوش خود بخود ٹھنڈا پڑ جاتا، لیکن اگر اس دوران میں کوئی ان کے غُصّے کی آگ پر تیل چھڑکنے کی کوشش کرتا اور لگائی بُجھائی سے انہیں بار بار مشتعل کرتا رہتا تو وہ اپنے مخالف کو زک دینا اپنی ذات کا ایک اہم مسئلہ بنا لیتے، خواہ بعد میں انہیں اپنے کیے پر پچھتانا ہی پڑے، مگر وہ جو کچھ کر سکتے کر گزرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ اس کی ایک نمایاں مثال حضرت جوش ملیح آبادی کے خلاف ہنگامہ آرائی ہے جو ہماری ادبی تاریخ کا ایک تاریک باب بن گئی اور جن کی بنیاد ان کے دوست نما دشمنوں کے ہاتھوں رکھی گئی، لیکن اس سلسلے میں شاہد صاحب کی صاف دِلی اور خلوصِ نیّت کا اظہار اس حقیقت سے

ہوتا ہے کہ "جوش نمبر" کی اشاعت کے پیسے جس زمانے میں وہ زور شور سے تیاریاں کر رہے تھے، مَیں اور کئی مخلص احباب نے انہیں زبانی اور تحریری طور پر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس مسئلے کو جس حد تک طول دے رہے ہیں اور جو طریقے اختیار کر رہے ہیں، یہ آپ کی شان کے شایان نہیں۔ گو شاہد صاحب اس نمبر کی اشاعت سے باز نہ آتے، مگر اُنھوں نے نہایت بیباکی اور دیانت سے بعض وہ خطوط ساقی میں شائع کر دیے جن میں ان کی مخالفت کی گئی تھی۔

بعض اوقات شاہد صاحب کسی کمزور قابلِ امداد ہستی پر کسی کی زیادتی دیکھ کر ایسے برافروختہ ہو جاتے کہ ظالم کی مخالفت فرض سمجھ کر اپنے ذمّے لے لیتے اور ہر قیمت پر دامے درمے قلمے سخنے اس ذمّے داری کو نبھانے کی کوشش کرتے، چنانچہ اس قسم کی ایک ادنیٰ مثال ایک مشہور مرحوم ادیب کے سلسلے میں ہمارے سامنے ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ ان ادیب نے ایک خاتون کے ساتھ ربط ضبط قائم کیا اور کسی وجہ سے تمام وعدے بھلا کر یہ تعلّق قطع کر دیا۔ شاہد صاحب کو اس واقعہ کا علم تھا۔

عرصہ دراز پہلے جب شاہد صاحب قیامِ پاکستان کے بعد بھارت میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہزاروں کی جائداد لٹا کر مصائب کا پہاڑ سر پر اُٹھائے پریشان حال خاندان کے ساتھ پاکستان پہنچے تھے اور اپنا اشاعتی کاروبار کسی نہ کسی طرح شروع کرنے کی فکر میں تھے، تو انھوں نے میری وساطت سے اس ادیب سے ایک ناول کا مسوّدہ حاصل کرنا چاہا تھا اور جوں توں کر کے ان کی فرمائش پر میرے ہاتھوں مُنہ مانگی معاوضے کی رقم ادا کرنے کے باوجود کئی سال گزر جانے پر بھی مسوّدہ وصول کر سکے تھے اور نہ معاوضہ کی رقم واپس ہو سکی تھی تو اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر

ضبط سے کام لیا تھا اور ادیب کے خلاف کوئی کارروائی کی تھی نہ کسی قسم کی معاندانہ روش اختیار کرتے نظر آئے تھے، بلکہ ساقی کے اجرا کے بعد ادیب موصوف سے اس ادا شدہ معاوضے کے عوض ساقی کے لیے چند مضامین لکھ دینے کی فرمائش میں بھی ناکام ہو کر صبر کر بیٹھے تھے۔ اگر شاہد صاحب کو بات بات میں کسی سے اُلجھنے یا ذاتی معاملات میں بگڑ کر تشدّد اختیار کرنے کی یہ عادت ہوتی تو یہ واقعہ انہیں برافروختہ کر کے ان ادیب کے خلاف ایک محاذ قائم کر لینے کے لیے کافی تھا اور انہیں بہرحال اپنی رقم واپس لینے یا بدمعاملگی کے خلاف ہر قسم کی چارہ جوئی کرنے پر حق بجانب سمجھا جا سکتا تھا، مگر اپنی ہنگامی بدحالی کے باوجود انہوں نے فراخ دِلی سے اس معاملے کو رفع وگزشت تصوّر کر لیا، البتّہ جب ایک مدّت بعد مذکورہ خاتون کی حمایت میں قلم اُٹھانے کے لیے انہیں کہا گیا تو انہوں نے درگزر سے کام لینا مناسب نہ سمجھا اور اس کے باوجود واقعات بیان کرتے ہوئے اپنے اور ادیب موصوف کے درمیان پیش آنے والے واقعے کو درمیان میں لانا مناسب نہ سمجھا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے واقعات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ شاہد صاحب اپنی ذات کے لیے کبھی کسی کے درپے آزار نہیں ہوئے، بلکہ اپنی خوش حالی کے زمانے میں انہوں نے مختلف حیلے بہانے سے پریشان حال ادیبوں اور شاعروں کی ہر ممکن اعانت اپنا فرض سمجھا۔ شاہد صاحب نے آنکھ کھولی تو فارغ البالی کا دَور دَورہ تھا۔ آرام وراحت کے آغوش میں پرورش پائی۔ تعلیم وتربیّت کا زمانہ اطمینان وفراغت سے بسر کیا اور ساقی کے اجراء کے ساتھ جب اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تو انہیں قیامِ پاکستان تک ہر قسم کی آسائش میسّر تھی۔

ساقی کے ذریعے نوجوان ادیبوں، شاعروں اور انشاپردازوں کی ایک بڑی تعداد ان کے زیرِ اثر میدانِ عمل میں آئی جو سب کے سب دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کے مالک ہو گئے، لیکن شاہد صاحب کی زبان سے کبھی اس کا ذکر نہیں سُنا گیا کہ ان کے فیضِ صحبت کا کیا اثر ہوا۔ وہ خاموشی کے ساتھ خدمتِ زبان و ادب میں مصروف پرورشِ لوح و قلم کرتے رہے، حالانکہ ۱۹۴۷ء کے بعد آخر دم تک اُن کو فراغت کا سانس لینے کی مہلت نہ مل سکی۔ شاہد صاحب کی ابتدائی خوش حالی اور دَورِ جدید کی بدحالی کا مقابلہ کیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے بیش و کم کی پروا کیے بغیر ایک درویش صفت انسان کا مزاج پایا تھا اور اسی کے سہارے اپنی ساری زندگی بسر کر دی۔ جن لوگوں پر اُنہوں نے اپنے دَورِ فراغت میں بہت سے احسان کیے تھے، ان کی کم نگاہی کے چرکے بھی کھائے، لیکن اُف تک نہ کیا اور نہ کبھی ان سے معاوضے کے طالب یا شکر گزاری کے متمنی ہوئے۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے دَوران شاہد صاحب کو کئی بار اذیت بخش لمحات سے دوچار ہونا پڑا۔ زمانہ ساز افسروں کی آنکھیں دیکھنا پڑیں، مگر صبر کرتے رہے اور وضعداری کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ آخر زمانے میں حالات کی ستم ظریفی نے شاہد صاحب کے مزاج میں کسی قدر چڑچڑا پن پیدا کر دیا تھا، لیکن انہوں نے خودداری اور خاندانی وضع کا ہر لحاظ میں پُورا پُورا لحاظ رکھا۔ اُردو زبان کی ترویج اور ترقیٔ ادب کے لیے ہر ممکن سعی و جہد کو بھی انہوں نے اپنی وضع بنا لیا تھا اور زندگی بھر اس پر قائم رہے۔ 'ساقی' درحقیقت ان کی ایک عادتِ ثانیہ بن گیا تھا جسے ہر حال میں برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے نفع و نقصان کا لحاظ

نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ جس استقامت کے ساتھ 'ساقی' بہرطور شائع ہوتا رہا اُردو دنیا میں کسی دوسرے جریدے کی ایسی مثال موجود نہیں ملتی۔ شاہد صاحب ایک زمانے میں یہ سمجھتے تھے کہ 'ساقی' اب وہ ساقی نہیں جو تھا یا وہ اسے جس رنگ رُوپ میں دیکھنے کے خواہش مند تھے، تاہم وہ تو اپنی اس عادتِ جاریہ کو نبھانے پر مستعد تھے، کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صِلے کی پروا!
گر نہیں ہیں مِرے اشعار میں معنی نہ سہی

شاہد صاحب کی وسیع القلبی اور فراخ حوصلگی کی داستان بیان کرنا ایک محدود و مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مبسوط انداز میں روشنی ڈالنا بھی یہاں دُشوار ہے۔ جستہ جستہ واقعات بیان کرنے پر ہی اکتفا کیا جا سکتا ہے۔

شاہد صاحب نے ساقی بُک ڈپو کے دَورِ عروج میں اپنے دَور کے نامور ادیبوں کی تصانیف شائع کی تھیں۔ ان سب کے دائمی حقوقِ طباعت و اشاعت انہوں نے خرید لیے تھے۔ پاکستان میں یہ تمام کتابیں ان کے عبوری انحطاطی دَور میں کاروباری فروغ اور خوش حالی کی ضامن ثابت ہو سکتی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ تصانیف اُن کے لیے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ابتدا میں محدود مالی ذرائع نے شاہد صاحب کو ان کی طباعت کی اجازت نہ دی، لیکن جب ان کے حالات نسبتاً بہتر ہوئے اور وہ وقت آیا کہ وہ انہیں اپنے لیے منفعت کا ذریعہ بنائیں، سُوءِ اتّفاق اور قضاءِ الٰہی سے ان میں سے اکثر مصنّفین نے وفات پائی اور شاہد صاحب نے کسی بیرونی تحریک

یا مطالبے کے بغیر از خود یہ فیصلہ کیا کہ ان مرحومین کی ان تصانیف کے اشاعتی حقوق ان کے پسماندگان کے سپرد کر دیں تاکہ وہ ان کو جہاں چاہیں ناشرین کو معقول معاوضوں پر دے کر خود کفیل ہو سکیں - شاہد صاحب کا یہ اقدام یقیناً طباعت و اشاعت کی کاروباری دنیا میں انفرادیت کا حامل اور اپنے عوامل و عواقب کے لحاظ سے نہایت مبارک و ما بہ الامتیاز تصوّر کیا جاتے گا۔

میں اس مختصر مضمون میں شاہد صاحب کے ادبی کمالات کا جائزہ نہیں، بلکہ ان کے ذاتی خصائص اور شخصیت کی چند جھلکیاں پیش کر رہا ہوں اور بعض ان حالات کا مختصر ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو میرے علم و یقین میں ہیں - ان میں ادیب شاہد احمد بھی شامل ہے 'ساقی' کا مالک و مدیر بھی اور ایک وضعدار دلّی کا شریف زادہ، جس نے ادب اور موسیقی کے عشق میں "عزّتِ سادات" بھی کھوئی اور دولت و فراغت کا سرمایہ بھی۔

شاہد صاحب کا دہلوی ہونا ایک ایسی خصوصیت تھی جو ان کی ذات و صفات میں کلیتاً رچ بس گئی اور یہی وجہ تھی کہ دلّی چھوڑ کر وہ "کہیں کے نہ رہے" دلّی کے اوراقِ مصوّر گلی کوچوں کی یاد میں جو نثری مرثیہ "دلّی کی بپتا" لکھا، وہ حقیقت میں ان کی ہی نہیں بے شمار مہاجرین دہلی کی سرگذشت تھی جسے وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی داستان بھی سمجھتے تھے اور خونِ جگر سے رقم کی ہوئی ایک دلدوز حیاتِ دردبھی — میں سمجھتا ہوں کہ کراچی کی پیر الٰہی بخش کالونی کے کوارٹر نما مکان میں بسنے والا مہاجر شاہد احمد "مجسّم دلّی کی بپتا" تھا جس کا بچپن اور جوانی کا بڑا حصّہ دلّی کے محل دو محلوں میں کروٹ کروٹ چین اور بے فکری میں گزرا اور اس نے عمر کے انحطاطی دَور میں معاش کی فکر، گھٹنے کا غم، زمانے کی کج رَوی، اپنوں پرایوں کی بے رُخی غرض

طرح طرح کے صدمے اور وہ تلخیاں سہیں جن کا گمان بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود اس مہاجر شاہد احمد نے اپنی دہلوی وضع اور خودداری کو جان سے زیادہ عزیز رکھا اور عزم و استقلال سے زمانے کے نئے گرم و سرد کا مقابلہ کیا، لیکن بدلے ہوئے زمانے میں بدلی ہوئی اقدار سے "وضع و خودداری" کی قیمت پر کبھی سمجھوتا نہ کیا۔ شاہد صاحب بلاشبہ مشرقی تہذیب و تمدّن کا ایک باوقار اور سادہ و پُرکشش نمونہ تھے۔ ان کے اکثر ہم جماعت اور ساتھی نئی اقدار کو اپنا شعار بنا کر کہیں سے کہیں پہنچے، لیکن شاہد صاحب کی جو چال بے ڈھنگی شروع سے تھی آخر دم تک قائم رہی اور یہی ان کی شان اور عزّ و وقار کا موجب تھی۔ فنِ موسیقی جو ابتدا سے ہجرت کے زمانے تک اُن کا شوق تھا، پاکستان میں ان کا ذریعۂ معاش بن گیا اور وہ بھی اس لیے کہ شاہد صاحب نے شروع سے موسیقی اور اس کے فن کاروں کو نہایت عزّت و احترام کی نظر سے دیکھا اور ہمیشہ اس فن کی تقدیس سے خلوص کے ساتھ پیار کیا۔

شاہد صاحب فطری طور پر زُود رنج واقع ہوئے تھے۔ وہ معمولی بات پر کبیدہ خاطر ہو جاتے، لیکن یہ رنج اور کبیدگی دیر پا نہ ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ شاہد صاحب دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن تھے۔ ساتھ وہ ایک خاص وضع کے پابند ہونے کی بنا پر ع

با دوستاں تلطّف با دُشمناں مدارا

کے دل سے قائل اور اسی پر عمل پیرا تھے۔ اگر کسی دوست سے انہیں کبھی کسی اختلافی مسئلے پر شکایت پیدا ہوتی تو اس کا اظہار فوراً برملا کر دیتے اور غلط فہمی دُور ہو جانے پر دل میں مَیل نہ رکھتے۔ جیسا کہ تمہیدی سطور میں بیان کر چکا ہوں

خود میرے اور ان کے درمیان ایک عرصہ تک اختلافات کی خلیج حائل رہی، لیکن جب تعلّقات میں ہمواری اور یگانگت پیدا ہوئی تو انہوں نے ہمیشہ برادرانہ خلوص کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود کئی بار بعض معاملات میں میرے اور ان کے درمیان اختلافِ رائے پیدا ہوا۔ زیرِ بحث مسئلے پر گفتگو کے دَوران میں دُرشتی کی نوبت بھی آئی، لیکن یہ سب کچھ ہنگامی تھا اور معقولیت کا یقین ہونے پر جب انہوں نے مجھ سے یا مَیں نے اُن سے اتّفاق کر لیا تو بغیر کسی ناگواری کے احساس کے ہمارے دل صاف رہے۔

شاہد صاحب مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ مَیں ان کو 'بھائی شاہد' کہا کرتا، مگر ان کی وضعداری کا تقاضا تھا کہ انہوں نے ہمیشہ مجھے عزّت سے یاد کیا اور جس محبّت کا اظہار تعلّقات استوار ہونے کے ساتھ کیا وہ برابر کرتے رہے۔ مَیں آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی کے دَوران جب لکھنؤ میں مقیم تھا اور شاہد صاحب نے دہلی ریڈیو سے موسیقی کے پروگرام میں حصّہ لینا شروع کیا تو اکثر معاملات میں وہ مجھ سے خط و کتابت کے ذریعے مشورہ کرتے رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ہمیشہ دفتری ضوابط کے جھگڑوں سے اُلجھن محسوس کیا کرتے اور جب کوئی ضابطے کی پیچیدگی ریڈیو اسٹیشن سے تعلّقات کے سلسلے میں پیدا ہوتی، وہ مجھے تمام خطوط بھیج کر لکھتے کہ ان کا جواب لکھ کر بھیج دو۔ چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دہلی ریڈیو کے ارکان سے کسی دفتری معاملے میں اُن سے ٹھن گئی۔ شاہد صاحب نے کمال خودداری سے کام لیتے ہوئے پروگرام بند کر دیے اور تعلّق منقطع کر لیا۔ چنانچہ مَیں نے انہیں اصرار کر کے لکھنؤ ریڈیو سے پروگرام نشر کرنے پر آمادہ کر لیا اور میری خواہش پر انہوں نے ایک نہیں ہر ماہ دو تین پروگرام نشر کرنا منظور

کر لیا۔ اس پر دہلی ریڈیو کے اربابِ اختیار نے اعتراض کیا اور لکھنؤ اسٹیشن سے احتجاج کیا۔ نیز ڈائرکٹر جنرل (جو اُس وقت مرحوم پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس تھے) سے شکایت کی۔ جواب طلبی پر ہم نے لکھ دیا کہ "شاہد صاحب سے اور دہلی ریڈیو سے مقامی طور پر جو اختلافات ہیں ان کی بنا پر دوسرے اسٹیشن ان کے جوہر سے فائدہ اٹھانے سے محروم نہیں رہ سکتے اور اگر ڈائرکٹر جنرل شاہد صاحب کو "باضابطہ" قصوروار قرار دیتے ہیں تو اعلان کریں کہ انہیں تمام مُلک کے ریڈیو سے بند (BAN) کیا جاتا ہے"۔ ایسا کرنا ضابطے میں ممکن نہ تھا اور پطرس مرحوم کسی قسم کی بے جا کارروائی کو محض کسی ایک کارکن کی ذاتی خوشنودی کے لیے گوارا نہ کر سکتے تھے، چنانچہ لکھنؤ کو اجازت مل گئی جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ دہلی ریڈیو کے اراکین بھی شاہد صاحب کی معقول پسندی کے قائل ہو کر ان سے مصالحت پر رضامند ہو گئے۔

پاکستان آنے کے بعد شاہد صاحب کئی سال تک ریڈیو پاکستان سے موسیقی کے پروگرام اور تقاریر نشر کرتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ کراچی ریڈیو میں مستقل آرٹسٹ کی حیثیت سے ملازم ہو گئے، لیکن میرے نزدیک جو کام انہیں اسٹیشن پر تفویض ہؤا تھا وہ اِن کے شایانِ شان نہ تھا۔ مَیں اس زمانے میں ریڈیو مطبوعات کا اڈیٹر انچارج ہونے کی حیثیت سے ہیڈ کوارٹر میں تعینات تھا، چنانچہ مَیں نے سیّد ذوالفقار علی بخاری (ڈائرکٹر جنرل) سے کہہ کر انہیں زمرۂ مطبوعات سے وابستہ کرا لیا اور اس طرح شاہد صاحب اور میں ایک عرصہ تک مِل کر کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں برِّصغیر کے ایک قدیم صحافی قاری عباس حسین دہلوی بھی اس ادارے سے متسلک رہے اور یوں کچھ دیر کے لیے

رمٹتی ہوئی دلّی کی یادیں تازہ کرنے کے بے بہا موقعے مِل گئے، مگر شاہد صاحب کا دل بُجھ گیا تھا۔ اُن میں وہ اگلی سی شگفتگی رہی تھی نہ اُمنگ، تاہم یہ اُن ہی کا دِل گُردہ تھا کہ عزم و ہمّت سے ساری کٹھنائیوں کو جھیلتے رہے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ ان کے معاملے میں ایک مغربی مفکّر کا یہ قول بڑی حد تک درست آتا ہے کہ "جب کسی مُلک کی تہذیب مِٹتی ہے تو شاعری کو عروج ہوتا ہے۔" شاہد صاحب کی ادبی زندگی کے عروج کا دَور پاکستان ہی میں شروع ہوا اور یہیں ان کی انشا پردازی کے نقش و نگار نکھرے اور اُبھرے اور "گنجینۂ گوہر" بن کر غیر فانی ہوئے۔

شاہد صاحب اور مَیں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۵ء تک کسی نہ کسی حیثیت سے کئی اداروں میں ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ ریڈیو کے عہد میں تو یہ قربت بعد میں کسی حد تک معنوی یا ثانوی بن گئی تھی، لیکن علمی ادبی اداروں میں شامل رہ کر ہم دونوں نے زیادہ قریب ہو کر کام کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سلسلے میں کم اور انجمن ادبی جرائد پاکستان کے سلسلے میں زیادہ قُربت حاصل ہوئی۔ موخر الذکر انجمن کے شاہد صاحب سیکرٹری جنرل تھے اور مَیں ذیلی شاخ کا سیکرٹری تھا۔ گو میری یہ گرفتاری بعض احباب کے جبر کی بدولت تھی، تاہم دوسرے احباب عہدیداروں اور اراکین کے ساتھ شامل ہو کر لاہور، کراچی، راولپنڈی اور مشرقی پاکستان وغیرہ کے مختلف اجلاس میں میرا اُن کا ساتھ رہا۔ کئی بار بحث مباحثے کے دَوران ہم دونوں میں بعض امور پر اختلافات بھی ہوئے، لیکن نہایت خندہ پیشانی سے دونوں نے ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے، سوچنے اور ردّ یا قبول کرنے کی کوشش کی اور ذاتی تعلقات پر ان کا کبھی کوئی اثر نہ پڑا۔ اس سے واضح ہوتا

ہے کہ شاہد صاحب خواہ مخواہ کسی کے خلاف رنجش یا کد گوارا نہ کرتے، سوائے اُس وقت کے جب انہیں یہ یقین ہو جائے کہ ان کا مقابل ان سے جو سلوک یا بات کر رہا ہے اس میں واقعی طور پر کسی رنجش یا دلی کاوش کا شائبہ ہے۔

۱۹۶۵ء میں مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران انجمن ادبی جرائد کے اجلاس کے موقع پر کئی مرحلے ایسے آئے کہ دوسرے اراکین عہدیداروں کے ساتھ میرے اور شاہد صاحب کے درمیان شدید اختلاف کی صورت پیش آئی اور گرما گرم بحث ہوئی، لیکن مباحثے کے اختتام پر ہنس بول کر اس عارضی تلخی کو رفع کر لیا۔

ڈھاکہ کا اجلاس الطاف گوہر صاحب سیکرٹری وزارتِ اطلاعات و نشریات کی زیرِ صدارت منعقد ہونے والا تھا۔ مغربی پاکستان کے اداراتی وفد میں مولانا رازقُ الخیری مدیر 'عصمت' (صدر انجمن ادبی جرائد پاکستان) برادرم محمد طفیل مدیر نقوش، حکیم محمد یوسف حسن مدیر نیرنگ خیال، بھائی شاہد اور راقم الحروف شامل تھے۔ ہم سب کو اجلاس سے خطاب کرنا اور کچھ نہ کچھ کہنا تھا۔ بھائی شاہد نے جو مقالہ لکھا تھا، جلسے سے پہلے ہم سب کو سُنایا۔ مَیں نے چند اختلافی مسائل حذف کرنے کی تجویز پیش کی۔ دوسرے احباب نے دبی زبان سے میری تائید کی۔ بھائی شاہد مُصر تھے کہ کوئی لفظ نہ بدلیں گے۔ اس موقع پر سب کو گونہ پریشانی تھی، کیونکہ بعض مصالح ان باتوں کے اظہار کے مانع تھیں۔ آخر میں میرے اصرار پر بھائی شاہد بگڑ گئے اور بولے:

"میاں، یہ تیس سالہ تجربہ کار اڈیٹر کے خیالات ہیں کسی گاؤدی کے نہیں۔ مَیں انہیں ہرگز نہیں بدلوں گا۔"

مَیں نے جواباً کہہ دیا کہ:

"جو رائے آپ کو دی گئی ہے یہ بھی تیس سال کے تجربے کی بنا پر ہے کسی گاؤدی کی نہیں۔"

احباب کو خوف ہوا کہ بات کچھ زیادہ نہ بگڑ جائے، مگر بھائی شاہد خاموش ہو گئے اور ہم دونوں وہاں سے ہٹ کر الگ الگ ٹہلنے لگے۔ ہم سب ہوٹل میں مقیم تھے۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور جلسے میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ استنے میں شاہد صاحب میرے کمرے میں آئے اور مضمون میز پر رکھتے ہوئے بولے: "اس میں جہاں جو کچھ مناسب سمجھو ردّ و بدل کر لو۔ میں نیا آرہو نے جارہا ہوں۔" اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے بڑھ کر انہیں روکا اور پوچھا "آپ رُوٹھے تو نہیں ہیں؟"

ہنس کر بولے "لاحول ولاقوۃ ——" اور پھر ہم سب خوشی خوشی اجلاس میں شریک ہونے روانہ ہو گئے۔ اسی طرح اس انجمن کے اکثر معاملات میں کئی مواقع اس قسم کی اَن بَن کے آئے، لیکن ہر بار آخر میں اس کا احساس ہوا کہ کسی بات میں کدورت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ بس ایک اصول پر بحث تھی۔

میں شاہد صاحب کو ہمیشہ خط و کتابت میں "بھائی شاہد۔ تسلیم" لکھا کرتا تھا اور وہ مجھے "برادرم۔ سلام مسنون" سے خطاب کیا کرتے اور ہم دونو کے درمیان یہ "برادرانہ" سلسلۂ موانست تادمِ آخر برقرار رہا۔ لکھنؤ کے قیام کے دوران غالباً ۱۹۴۳ء میں مجھ پر قلبی عارضے کا خفیف سا دورہ ہوا۔ بھائی شاہد کو اطلاع ہوئی تو مجھے خیریت دریافت کرنے کے لیے جو خط لکھا اس میں سختی سے آرام کرنے اور مصروفیت کم کرنے کی تاکید کرتے ہوئے لکھا:

"میں جانتا ہوں آپ کام کی کثرت سے باز نہ آئیں گے،

مگر بھائی، جان ہے تو جہان ہے ——— کام ہوتے رہتے ہیں۔ آخر زندہ رہنے کے لیے نہیں تو صحت کے لیے آرام بھی ضروری ہے۔ اپنا خیال رکھیے، اپنے لیے نہیں تو اپنے اہلِ خاندان اور احباب کی خاطر ہی سہی۔"

اور ستم ظریفی دیکھیے کہ جب شاہد صاحب قلبی عارضے میں مبتلا ہوئے اور مَیں نے انہیں بار بار آرام کی تاکید لکھی تو انہوں نے اس کے جواب میں ابدی خاموشی اختیار کر لی۔ اب مَیں یہ کس سے کہتا ہوں کہ:

"بھائی شاہد، دیگراں را نصیحت خود را فضیحت ———
اپنا خیال رکھیے اپنے لیے نہیں تو اپنے اہلِ خاندان اور احباب کی خاطر ہی سہی۔"

مگر شاہد صاحب نے تو اہلِ خاندان اور احباب کی خاطر ہی اپنی زندگی کی پروا نہ کی۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ اس طرح عزیزوں اور دوستوں کو یُوں تڑپتا چھوڑ کر کہیں مُنہ موڑنے والے تھے۔ ان کا رُوٹھنا اور بگڑنا تو عارضی ہوتا تھا، مگر آخری بار رُوٹھنے کی کیفیت تو ناگفتہ بہ ہو گئی اور اگر انہیں کہنے سُننے کی اجازت مِل سکے تو وہ اب بھی اپنے سوگواروں کی تسلّی سے باز نہ آئیں اور شاید انہیں یہ کہہ کر سمجھائیں کہ ؏

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں

شاہد صاحب کا ذکر چھیڑ کر جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان کی باتیں، ان کی سادگی، صُلح جوئی اور رُوٹھنے بگڑنے اور منانے، من جانے کی داستانیں سُناتا رہوں تاکہ ان کے بعض بزعم خود غلط "دوستوں" کا باطون بھی دُھل کر صاف ہو

جائے اور وہ صرف ایک ہی بات یاد رکھیں کہ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

شاہد بھائی

یوسف ظفر

گزشتہ تیس برس کے تعلقات کا قرض ادا کرنے کے لیے میں نے قلم اُٹھایا تو معًا خیال آیا کہ میں کس مُنہ سے مرحوم کو بھائی کہنے چلا ہوں۔ وہ جمنا تٹ کے بسیا دہلوی۔ میں پانچ دریاؤں کا رہنے والا گوجرانوالے کا دیہاتی۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے۔ میں غریب کس کھیت کی مُولی۔ وہ شرافت و نجابت میں اپنی مثال آپ۔ میں اکھڑ پن اور جہالت کا مُرقّع۔ اُنہیں بھائی کہوں تو کیسے؟ لیکن میں نے انہیں ہمیشہ بھائی کہا، تو اب کیوں نہ کہوں۔ میرے بھائی کہنے سے اُن کی ذات پر حرف آتا تھا، لیکن انہوں نے کبھی کسی کا بُرا نہیں مانا، تو پھر میں اس نسبتِ عزّت کو کیسے ترک کر دوں۔ نہیں صاحب، میں انہیں بھائی ہی کہوں گا اور اس شرف کو اپنا طرۂ امتیاز بنائے رکھوں گا۔

۱۹۳۷ء کے اوائل میں مَیں جب دِلّی پہنچا تو کسی گنتی شُمار میں نہ تھا۔

ایک مفلوک الحال، بدنصیب نیم نوجوان جس کے پاس تن کے کپڑوں اور پنجاب یونیورسٹی کی ڈگری کی سند کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ چند دن فاقہ کشی پر گزارہ کیا۔ سڑکیں ناپتا پھرا۔ جامع مسجد دِلّی کو مرکز مان کر دِلّی کا طواف کرتا رہا، لیکن جب حد ہو گئی تو بیچارگی نے انجمن احمدیہ (لاہور) کے سالانہ اجلاس میں اسٹیج پر لا کھڑا کیا اور ایک نعت پڑھوا کر اپنی شب بسری کا سامان کیا۔ یہ سالانہ اجلاس جامع مسجد کے بالمقابل میدان میں ہوا تھا جس کے قریب ہی اُردو بازار میں اس انجمن کا دفتر ایک چوبارہ میں تھا جس کے نیچے دُکان میں مکتبۂ علم و ادب قائم تھا۔ اِس دُکان کے دروازوں پر جو بورڈ آویزاں تھے اُن پر ساقی بُک ڈپو اور ماہ نامہ ساقی کے اشتہار بھی تھے۔ دُکان کے متّصل انجمن کے دفتر کا زینہ تھا جس کی دوسری طرف "میرٹھ ہوٹل" کے نام سے کسی صاحب نے کھانوں کی دُکان کھول رکھی تھی۔

میری فاقہ مستی کو ایک طرف کھانوں کی خوشبُو اپنی طرف کھینچتی اور دُوسری طرف ادبی ذوق کو مکتبۂ علم و ادب کی شاموں کی محفل بُلاتی کہ ہر شام وہاں شاہد احمد دہلوی، فہیم بیگ چُغتائی، جنہیں مَیں نے لاہور میں دیکھا تھا اور کئی اہلِ قلم حضرات جمع رہتے۔ اُن کی آوازیں تیرتی ہوئی بالاخانے میں پہنچتیں۔ رنگا رنگ آوازیں، قہقہے جنہیں مَیں سمجھنے سے قاصر ہوتا، لیکن جن میں شامل ہونے کی خواہش مجھے بے چین کر دیتی۔ فطری طور پر کم آمیز اور شرمیلے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بے بضاعتی کے احساس نے مجھے اُس محفل تک پہنچنے نہیں دیا، لیکن مَیں نے شاہد احمد دہلوی کو دیکھا اور بار بار دیکھا اور یُوں دیکھا کہ انہیں اپنے دیکھنے والے کا پتہ بھی نہ چلا۔ ایک دن مَیں نے ایک غزل اپنے

ایک رفیق بالاخانہ کے ہاتھ مُدیرِ ساقی کو بھجوائی کہ اگر ان کی دانست میں یہ غزل قابلِ اشاعت ہو اور وہ اس کا معاوضہ بھی دے سکیں تو قبول فرمائیں۔ انہوں نے غزل کی تعریف کی، لیکن اس کے لیے معاوضہ نہ دے سکنے کی معذرت کر کے لوٹا دی۔ میراجی چاہتا تھا کہ اگر کلام سے صاحبِ کلام کی طرف رجوع کریں تو میرے پیسے ملنے کی راہ نکل سکتی تھی، لیکن مجھے کیا معلوم کہ مجھ سے بھی زیادہ کم آمیز اور بسترِ میلے واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنی حد میں رہے اور مَیں اپنی حد میں، چناں چہ ملاقات نہ ہو سکی۔

مَیں ۱۹۳۸ء کے اواخر میں لاہور آ گیا۔ ملازم ہو گیا۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو ادبی ذوق کو تسکین دینے کی سُوجھی۔ کچھ نظمیں 'ادبی دنیا' اور 'ہمایوں' میں شائع ہوئیں۔ 'زمانہ' کانپور سے میری رسم و راہ ۱۹۳۷ء سے قائم ہو چکی تھی۔ آنجہانی منشی دیا نرائن نگم مجھے باقاعدگی سے یاد فرماتے اور ہر نظم کی رسید کے ساتھ لکھ بھیجتے کہ "زمانہ آپ کا ہی پرچہ ہے" بیرونِ لاہور نظموں کی اشاعت کے لیے میری نظر پھر شاہد صاحب پر پڑی۔ مَیں نے نظم بھیجی۔ انہوں نے پوسٹ کارڈ پر اس کی رسید اور شکریہ بھیج دیا۔ سفید روغنی کارڈ کی پیشانی پر ساقی مطبوعہ تھا اور نیچے دستخط کرتے ہوئے شاہد احمد کی "ش" کو اتنا طُول دے رکھا تھا کہ اس سے آدھا کارڈ مزیّن تھا۔

شاہد احمد

آج اٹھائیس برس کے بعد بھی مجھے وہ دستخط یاد ہیں۔ میری آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور وہ مُسکراتا ہوا چہرہ اور اس کی فطری ذہانت، متانت، لطافت اور وقار جسے میں دلی سے اپنے حافظے میں لگا لایا تھا ——— یہ

تعلق ۱۹۴۲ء کے اوائل تک قائم رہا۔ ساقی باقاعدگی سے میرے نام آتا۔ اگر میں نظم بھیجنے میں کوتاہی کرتا تو یاددہانی کا کارڈ آتا اور میرے ذہن میں مسکراتا، متین، پُروقار اور شریف چہرہ مجھے سرزنش کرتا۔

۱۹۴۳ء کی فروری میں میں نے ہمایوں کی ادارت سنبھالی اور ارادہ کر لیا کہ اپنے شعر کو اسی کے دامن کے لیے مخصوص کر لوں گا، لیکن شاہد بھائی کو یہ منظور نہ ہوا۔ یہی حال مولانا صلاح الدّین مرحوم کا تھا۔ دونوں نے اپنی طبعی شرافت سے مجھے مجبور کیا۔ مولانا مرحوم نے تو ہمایوں کے لیے مجھے اپنے مضمون عطا کرنے شروع کر دیے۔ یہ حُسنِ طلب کا انداز مجھے بہت بھایا اور میں نے جوابی کارروائی کے طور پر ادبی دنیا کے ساتھ تعلق قائم کیا، لیکن شاہد بھائی نے مجھے ایک دن کے لیے بھی اپنا حریف تسلیم نہ کیا۔ اُن کا کارڈ اسی باقاعدگی سے آتا اور اُن کے اندازِ تحریر میں وہی تمکنت اور سادگی ہوتی جو اس سے پہلے تھی۔ میں نے ان کے آگے بھی ہتھیار ڈالنے میں اپنی خیریت دیکھی۔

میں ۱۹۴۳ء سے پنجاب یونیورسٹی کے ادیب فاضل کے ایک پرچے کا ممتحن تھا۔ اس سلسلے نے مجھے سب سے پہلے مولانا عبدالسّلام ندوی (مرحوم) سے اور پھر ۱۹۴۴ء میں سر عبدالقادر مرحوم سے متعلّق کر دیا۔ ۱۹۴۵ء میں شاہد بھائی کی باری آئی۔ پرچوں کا ایک طومار تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ لاہور کی شدید گرمی۔ گھریلو اور کاروباری مصروفیات کے ساتھ پرچے پڑھے۔ طلبہ کی ذہنی پستی، لاعلمی، کم علمی اور طرح طرح کی فریب دہی کی کوششوں کا مشاہدہ کرنے، نمبر لگانے، لگا کر پیشانی پر لکھنے، لکھ کر گننے اور گن کر لکھنے کے چکّر میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ شاہد بھائی کی طرف سے تقاضے شروع ہو گئے۔ میں

نے پرچوں کی بوری بند ھوائی، پسنجر گاڑی میں سیکنڈ کلاس سیٹ حاصل کی اور سفر کے دَوران اس مشکل کو آسان کرنے کی سبیل نکالی۔ دِلّی پہنچا تو ابھی کچھ مراحل باقی تھے۔ مَیں نے کھاری باؤلی میں مکان ڈپٹی نذیر احمد کا پتہ چلایا اور یُوں پہلی مرتبہ دفترِ ساقی میں پہنچا۔ خوش قسمتی سے شاہد بھائی موجود نہ تھے۔ مَیں نے اُن کے کمرے میں بیٹھ کر کاپیوں کو مُرتّب کیا اور اُن کے آنے سے پہلے پہلے کام مکمّل کر کے اطمینان کا سانس لیا۔

شاہد بھائی آئے اور بے حد تپاک سے ملے آٹھ برس کی دُوری مِٹی۔ عدم ممتحن اور ممتحن کے فاصلے طے ہوئے تو ادبی رسائل کے مُدیر مل بیٹھے۔ ادب کی بے بسی، ادیبوں کی بے سروسامانی، وسائل کی کمی، قوم کی غربت اور اسی قبیل کے مسائل کا رونا رویا گیا۔ طے پایا کہ شام شاہد بھائی کے ہاں گزاری جائے۔ شام کے پانچ بجے ہوں گے کہ ہم ساقی کے دفتر سے نکلے۔ بازاروں کی گہما گہمی، ٹریموں اور کاروں سے بچتے بچاتے ہم دونوں چلے جا رہے تھے۔ مجھے منزل کا پتہ نہ تھا اور شاہد بھائی اپنی خاندانی روایت کے مطابق راستے میں بات چیت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اُنھوں نے پیدل چلنے کو زیادہ مناسب سمجھا ہو گا، چنانچہ راستہ خاموشی سے کٹا۔ ہم جامع مسجد پہنچے، وہاں سے چتلی قبر کا رُخ کیا گیا۔ چتلی قبر کے بالمقابل ایک گلی میں داخل ہوئے اور پھر شاہد بھائی کا مکان آگیا۔ مکان، جو اپنی سابقہ روایات کو زندہ رکھنے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔ مردانہ الگ جس میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ ہم پہنچے تو اِدھر اُدھر سے احباب بھی آنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے آنے والوں میں شاہد لطیف مرحوم اور اُن کی بیگم عصمت چغتائی تھے۔ عصمت تو زنانے میں چلی گئیں؛ البتہ

شاہد لطیف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اسی محفل میں پہلی مرتبہ محمد حسن عسکری سے مُلاقات ہوئی۔ وہ ساقی میں "باتیں" کے عنوان سے مستقل لکھا کرتے تھے اور اُن کی باتوں کی نشتریت ادبی حلقوں کے لیے باتیں بہم پہنچاتی تھی۔ شام ہوتے تک اچھی خاصی محفل قائم ہوگئی۔ نہایت مکلّف چائے ہوئی۔ نمکین ہوں یا میٹھی کھانے کی تمام چیزیں گھر کی پکّی ہوئی تھیں۔ چائے کے بعد شاہد بھائی تانپورہ لے کر بیٹھ گئے۔ مَیں نے تھوڑی دیر حظ اُٹھایا اور اس لیے اُٹھ کر چلا آیا کہ مجھے رات کا کھانا میرا جی مرحوم کے ساتھ کھانا تھا۔ یہ تھی شاہد بھائی سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد جب بھی دِلّی گیا، شاہد بھائی سے مِلنا مجھ پر فرض ہو گیا۔ مَیں ان کی بھرپُور شخصیت، خلوص، ماپے تُلے انداز، روایات پرستی، شرافت اور خالص دہلوی اسلوبِ حیات سے بہت متاثر ہوا۔ دہلی باتوں کے لیے خاص طور پر مشہور تھا۔ بات کو اس طرح پھیلا کر بیان کرنا کہ اس کا کرارا پن نمایاں ہو جائے یہ تھا عام طور پر لوگوں کا خاصہ۔ مَیں خود بھی ڈیڑھ ایک برس دِلّی میں گزار آیا تھا اور مجھے اس کا پُوری طرح شعور تھا، لیکن شاہد بھائی اِس کے برعکس نہایت کم گو اور نکتہ رَس تھے۔ بات وہ بھی نہایت پُر مزا کرتے، لیکن کم سے کم الفاظ میں، گردن کی حرکت، آنکھوں کے اُتار چڑھاؤ، ہاتھوں کی جُنبش کے ساتھ۔ کبھی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پڑی ہوتی انگوٹھی کو گھُما کر، لیکن اختصار پسندی اُن کا شیوہ تھا۔ یہ بات شاہد بھائی کے لیے مخصوص تھی۔ وہ سُنتے زیادہ توجہ سے تھے اور بولتے اس متانت اور دبی دبی آواز میں جیسے محبّت کا اظہار کر رہے ہوں۔

پاکستان قائم ہوا۔ پہلے لاہور اور پھر دِلّی میں قیامت برپا ہوئی۔ ایک کو ایک کی خبر نہ تھی کہ مَیں نے سُنا شاہد بھائی لاہور آ گئے۔ سُن کر افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی۔ افسوس اس بات کا کہ اگر وہ دِلّی میں نہ رہے تو وہاں کون رہ گیا ہوگا۔ وہ تو دِلّی کی جان تھے اور پھر لاہور ——— لاہور کی اپنی روایات ہیں۔ اپنی زندگی۔ وہ ان روایات اور اس زندگی پر دِلّی کی مخصوص روایات کو کیسے قربان کریں گے۔ وہ اِن دونوں روایات کے ڈانڈے کیسے ملا سکیں گے۔ خوشی اس بات کی کہ شاید مَیں اُن کے کسی کام آسکوں۔ ایک دن انارکلی کی نُکڑ پر ملاقات ہوئی۔ لپٹ گئے۔ مَیں نے عرض کی: "میرے حُکّام بالا سے گہرے مراسم ہیں، جہاں تک ممکن ہوا ہے اپنے پناہ گزین ادیب دوستوں کے کام آ رہا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ چلیں۔" گھر آنے کی دعوت دی، لیکن انہوں نے مجبوری کا اظہار کیا اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا۔ چند دِن اور گزرے ہوں گے کہ پتہ چلا شاہد بھائی کراچی چلے گئے۔ لاہور کی فضا اُنہیں راس نہ آئی۔ اس کا مجھے آج بھی افسوس ہے۔ حق تو یہ ہے کہ لاہور کو اُن کی ضرورت تھی۔

اگر وہ لاہور میں قیام کرتے تو ساقی لاہور سے نکلتا۔ میرے خیال میں اس میں دونوں کی بہتری تھی، لیکن وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا انہیں عُمر بھر نہ آیا۔ کسی کی اعانت اور دست گیری کو انہوں نے طبعًا قبول نہ کیا اور خودداری کی دولت کو سینے سے لگائے بیٹھے رہے۔ اِس دولت کے آگے ہر دولت کو ہیچ سمجھتے رہے۔

مَیں ۱۹۴۹ء کے اواخر میں بسلسلہ ملازمت مری پہنچا - وہاں شاہد بھائی کے صاحبزادے مشہود احمد بھی اسی دفتر میں تھے - مَیں نے اُن کے آئینے میں شاہد بھائی کا عکس دیکھا تو جی خوش ہو گیا - وہی چال ڈھال، وہی ناک نقشہ، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی عزّتِ نفس - اُن کی وساطت سے شاہد بھائی اور ساقی سے پھر رشتہ قائم ہوا، لیکن چند ماہ کے بعد وہ بھی کراچی چلے گئے اور کم و بیش سات برس تک کے لیے ہم ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئے - ساقی اُسی وضع داری کے ساتھ آتا، لیکن وہ روغنی پوسٹ کارڈ جس کی پیشانی پر قطب مینار کا نقشہ اور جس کے نیچے آدھے کارڈ تک پھیلی ہوئی "ش" کی کشش تھی نہ آیا - وہی حال ادبی دُنیا کا تھا - وہ بھی ہر مہینے باقاعدگی سے آتا، لیکن تقاضے کا خط مولانا مرحوم کی طرف سے نہ آیا - ڈاکٹر وزیر آغا اُن سے مُنسلک ہوئے تو یہ کام انہوں نے اپنے ذمّے لے لیا - شاہد بھائی کے ساتھ بھی کوئی ڈاکٹر وزیر آغا لگ جاتے تو یقیناً یہ خط آنے لگتا - ان کی خودداری تقاضا نہ بن سکی - میری خود پسندی بلا تقاضا اعانت نہ کر سکی، چناں چہ گزشتہ ۱۰ برس میں ساقی میرے لیے بیگانہ رہا -

---

مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاہد بھائی ۱۹۵۷ء میں پہلی مرتبہ پنڈی تشریف لائے - یہاں کرنل نذیر احمد اور ان کی بیگم صاحبہ سے ان کی ایک قدر مشترک تھی، موسیقی —— کرنل صاحب سے میری بھی یاد اللہ ہے ؛ چنانچہ شاہد بھائی کی تشریف آوری پر جو محفل جمی، اس میں میرے کرم فرما فضل صاحب، نواب اشک رام پوری مرحوم، میرے مرحوم دوست ملک نسیم الظفر کے ساتھ مَیں بھی

شریک تھا۔ رات گئے تک ساز سنگیت کے ساتھ خیالوں اور ٹھمریوں کی بارش ہوئی۔ موسیقی سے اُن کے والہانہ شغف اور فن کارانہ تعلق کی مجھے خبر تو تھی، لیکن اس کا بھرپور احساس پہلی مرتبہ ہوا۔ اغلباً اگلے ہی برس کرنل صاحب کے ہاں استاد برکت علی مرحوم آئے تو شاہد بھائی کراچی سے بھاگم بھاگ پہنچے۔

ایک دو تین دن قیام رہا۔ یہاں ریڈیو اسٹیشن میں سید انصار ناصری صاحب ریجنل ڈائرکٹر تھے جن سے مرحوم کے عمر بھر کے مراسم تھے، چنانچہ شاہد بھائی اسٹیشن پر بھی تشریف لاتے رہے۔ اُن کی نغمہ بار آواز کانوں پر اور اُن کی سراپا نغمہ صورت آنکھوں پر احسان کرتی رہی، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بالوں کو مہندی اور وسمہ سے بھی نوازتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء کا نوجوان شاہد احمد دہلوی اب اپنی ڈھلتی ہوئی عمر سے لڑنے لگا۔

رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ شاہد بھائی اس برات کے دُولہا بن گئے۔ کراچی میں اہلِ قلم حضرات کا اجتماع تھا۔ شاہد بھائی یہاں بھی ہوتے اور وہاں بھی۔ اُن کی ہر جگہ مانگ تھی۔ مجھے شدید طور پر احساس تھا کہ اگر اہلِ قلم حضرات نے احتیاط نہ برتی تو اہلِ اقتدار اس جماعت سے فن کاروں کو خریدنے اور اُن کے قلم کو مفادات کی خاطر سُولی پر چڑھانے کا کام لیں گے۔ میں نے کراچی پہنچ کر اکثر حضرات سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا، لیکن کسی کو اس پریشانی میں مُبتلا نہ پایا۔ اس سے اہم تر سوال یہ تھا کہ اگر میں اپنی بیس پچیس سالہ ریاضتِ فن کو گلڈ کی جھولی میں ڈالتا ہوں تو ان بیس پچیس سالہ نوجوانوں کو جنھیں ولادت ہی سے فخرِ رکنیت حاصل ہو گیا ہے، میں اپنا ہم سِن اور ہم شعور کیوں سمجھوں،

لیکن اس ضمن میں بھی کسی کو کوئی تکلیف نہ تھی، چناں چہ میں نے شاہد بھائی کو اپنا ہدف بنایا اور اُن پر اپنا غصّہ نکالا۔ یہ اُن کے ظرف کا کمال تھا کہ اُنھوں نے میرے دونوں وار نہایت خندہ پیشانی سے سہے اور جواب دیا تو اتنا کہ آپ کے ایثار ہی پر گلڈ کا دارومدار ہے۔ گلڈ کا قائم ہونا ہی آپ کی خدمات کا صلہ ہے۔ مجھے آج ان کے اُس جواب سے اتّفاق نہیں۔ مَیں اُن کے خلوص اور سادہ لوحی کو اس جواب کے لیے ذمّہ دار سمجھتا ہوں کہ آج میرے اعتراضات حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہے ہیں اور گِلڈ فی الواقع چند اغراض پرست خودنگر لوگوں کا اکھاڑہ بن کر رہ گیا ہے جنھیں یاری نباہنے کا فن خوب آتا ہے، لیکن شاہد بھائی کے جواب نے مجھے مطمئن کیا۔ وہ اُنھی کا حصّہ تھا اور اُنھوں نے اپنے فریب میں مجھے جس طرح شریک کیا، وہ انھی کا کمال تھا۔

۱۹۶۳ء میں صدرِ پاکستان نے انھیں تمغۂ افتخار عطا فرمایا تو شاہد بھائی پنڈی تشریف لائے اور مجھ سے مِلے۔ یہ میری اُن کی آخری مُلاقات ثابت ہوئی، لیکن یہ مُلاقات جو گھنٹوں جاری رہی، ایک اور وجہ سے بھی یادگار ہے کہ اس میں مسلسل میراجی مرحوم کا ذکر چھڑا رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ مَیں مرحوم سے اپنے زمانۂ لاہور کے تعلّقات پر روشنی ڈالوں تاکہ ۴۲ء کے بعد کے اُن مراسم سے وابستہ کر کے تصویر مکمّل کر لیں جو دِلّی میں دونوں کے درمیان قائم ہوئے۔ سُوئے اتّفاق کہ مجھے اب تک اس کا اندازہ نہ تھا کہ میراجی مرحوم کی یاد بھی اُن کے لیے کچھ تلخیاں لیے ہوئے ہے، چناں چہ مَیں تو نہایت سادگی سے ۳۹ء سے ۴۲ء تک کے واقعات سے پردہ اُٹھاتا رہا اور وہ اپنی یادداشت کے لیے اُنھیں محفوظ کرتے رہے، لیکن جب انھوں نے انھیں سُپردِ قلم کیا

اور یوم میراجی پر کراچی کے جلسے میں پڑھا تو میراجی مرحوم کے احباب نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ بعض واقعات میں وہ خلش داخل ہو گئی جو اُن کے سینے میں تھی اور جو میرے سان گمان میں بھی نہ تھا، لیکن جب یاروں نے اُن سے باز پُرس کی تو وہ میرا نام لے کر کنّی کاٹ گئے! چناں چہ وہ خلش بھی مجھ سے منسوب ہو گئی جو اُن کی تحریر میں تھی۔ مَیں اس انتظار میں رہا کہ وہ ملیں تو مَیں ان سے گِلہ کروں اور ازالہ کی کوئی صورت نکل آئے، لیکن اُن کی موت نے مجھے اجازت نہ دی اور اب مَیں اس صورتِ حال کو واضح کرنے کے لیے رہ گیا ہوں۔

گزشتہ تیس برس کے سفر پر غور کرتا ہوں تو مجھے اُردو بازار دہلی کے شاہد بھائی اور کراچی کے مرحوم شاہد بھائی میں کچھ عجیب سا بُعد نظر آتا ہے۔ وہ ہنستی ہوتی مُنہ بولتی تصویر زمانے کی گردش سے اپنے حالات پر ایک لطیف سی طنز بن کر رہ گئی اور وہ جن باتوں کو نظرانداز کرنے کے عادی تھے، وہ ان کی یاد میں اُبھر کر ان کی تحریر کی تلخی کی صورت میں نمایاں ہوتی چلی گئی۔ یہ بات بھی اُن کے اور مولانا صلاح الدّین مرحوم کے درمیان مشترک ہے۔ دونوں مرنجان مرنج، شریف النّفس، خلیق اور میدانِ نثر کے شہسوار، دونوں کی تحریر میں کُشادگی اور نظر میں بلا کی وُسعت، لیکن دونوں کے آخری ایّام کی تحریروں میں تلخاب کی آمیزش ضرورت سے کُچھ زیادہ ہی ہے۔ مولانا صلاح الدّین احمد کی بدقسمتی یہ ہے کہ اُن کے باکمال فرزندوں کی مصروفیات نے اپنے ورثۂ عظیم کو سنبھالنے کی مُہلت نہیں دی اور وہ اس کام کو جاری نہ رکھ سکے جو مولانا مرحوم نے عُمر بھر اپنے خُون کی روشنائی

سے کیا تھا۔

شاہد بھائی خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے مزاج اور تصوّر کے مطابق محمد حسن عسکری جیسا بُت تراشا۔ یہ فرض اُن کا ہے کہ شاہد بھائی کی حیات اور اُن کے کارناموں کو مُرتّب کریں اور زمانے کی آندھیوں سے ان کے چراغ کو محفوظ کرلیں، تاہم شاہد بھائی اپنے وقت کا وہ قطب مینار ہیں جسے تاریخ خود زندہ رکھنے کے لیے بے تاب ہو گی اور جس کے نُور سے آنے والی صدیاں جلا پائیں گی۔

شاہد بھائی ہم میں نہیں اور ہم بھی کب تک ہیں دُنیا نام ہی اس آمدورفت کا ہے، لیکن خوش نصیب ہیں وہ جو اپنے ہاتھوں اپنی تاریخ مُرتّب کرتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش میں زندگی کے سوتے پھیلاتے ہیں اور حیاتِ باقی پا جاتے ہیں۔ شاہد بھائی کو اُن کے دوست کبھی نہیں بھُول سکیں گے۔ مدّتوں اُن کی صُورت نگاہوں میں پھرتی رہے گی اور اُن کی باتیں ذہنوں میں تازہ رہیں گی کہ وہ اپنے پیچھے زندگی کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں۔

اِک مغنّی، اِک ادیب

شمس زبیری

حالات کی ستم ظریفی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ۲۰ مئی ۱۹۶۷ء کی رات کو یونائیٹڈ بنک کا مشاعرہ تھا۔ دو ڈھائی بجے تک تو شعر خوانی کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو ایک دوست بڑے اصرار سے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں چار بجے تک محفل جمی رہی۔ وہاں سے اُٹھا تو تھکا ماندہ دفتر ہی میں آکر سو گیا۔ صبح آٹھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی سے آنکھ کھلی۔ دوسری طرف سے جمیل صاحب بول رہے تھے۔ خلافِ معمول جالبی صاحب کی آواز میں گھبراہٹ اور اُداسی تھی بڑے عجیب لہجے میں اُنھوں نے کہا شاہد بھائی کا انتقال ہو گیا ——— شاہد بھائی کا انتقال ہو گیا۔ یہ سُن کر ایسا محسوس ہوا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو اور ہر چیز بالکل ساکت ہو گئی ہو۔ شاہد صاحب رخصت ہو گئے ——— یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اُبھرتا رہا اور اس کے ساتھ ہی یادوں کا ایک پورا سلسلہ میرے ذہن میں اُبھر آیا۔

غالباً ۳۹ء کی بات ہے، میری نو عمری کا زمانہ تھا اور میں دہلی ٹرامویز کمپنی

میں ٹریفک انسپکٹر تھا۔ اُن دنوں میں نیا نیا بس سروس سے تبدیل ہو کر ٹراموے میں آیا تھا۔ ایک شام ٹرام فتح پوری سے حوض قاضی ہوتی ہوئی جامع مسجد جا رہی تھی کہ ایک صاحب کٹرہ بڑیاں سے فرسٹ کلاس میں سوار ہوئے، لیکن اصول کے مطابق کنڈکٹر ان کے پاس ٹکٹ دینے نہیں گیا۔ مَیں نے کنڈکٹر سے باز پُرس کی فرسٹ کلاس میں جو صاحب سوار ہوئے ہیں، انہیں ٹکٹ کیوں نہیں دیا۔ کنڈکٹر نے کہا ان صاحب کے پاس پاس ہے اور پڑھانے پاس ہولڈروں سے اگر پاس دکھانے کو کہا جائے تو وہ بُرا مانتے ہیں۔ مَیں خود اُن صاحب کے پاس گیا اور پاس دکھانے کی درخواست کی۔ ان صاحب نے پہلے بڑی خاص نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر پاس دکھایا۔ پاس پر لکھّا ہوُا تھا "شاہد احمد دہلوی"۔ نام سے تو مَیں پہلے ہی واقف تھا صورت آشنا نہ تھا۔ یہ تھی شاہد بھائی سے پہلی مُلاقات جو مجھے مرتے دم تک یاد رہے گی۔

انہیں دیکھنے کا ہر چند یہ پہلا اتفاق تھا، لیکن وہ نقش آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ تُرکی ٹوپی، تازہ استری کی ہوئی شیروانی، پاس نکالنے کے لیے بٹن جو کھولے تو گلے میں بیل لگا ہوُا کُرتہ نظر آیا۔ چھوٹی موری کا پاجامہ اور پاؤں میں پمپ۔ اُس وقت سے اُن کی زندگی تک مَیں نے شاہد بھائی کے لباس میں صرف ایک تبدیلی دیکھی۔ بعد میں تُرکی ٹوپی کے بجائے وہ جناح کیپ اوڑھنے لگے تھے۔ باقی لباس وہی رہا اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد مَیں نے دِلّی میں انہیں متعدّد بار دیکھا، لیکن تفصیلی ملاقات کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ وقت گزرتا گیا۔ پاکستان کی نئی مملکت وجود میں آگئی۔ ہم لوگ دِلّی سے ترکِ وطن کر کے کراچی آگئے۔ یہاں آکر معلوم ہوُا کہ شاہد صاحب نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں سیّد ذوالفقار علی صاحب

بخاری کی مہربانی سے مجھے ریڈیو پاکستان میں فن کاروں کا تلفظ درست کرنے کی جگہ مِل گئی۔ وہاں پہلے ہی روز شاہد صاحب سے ملاقات ہوئی ابتدا میں تو انہوں نے مجھے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا، لیکن پھر ایسی گھُٹی کہ انہیں میرے بغیر اور مجھے اُن کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کی رات کو انہوں نے ایسی بے اعتنائی برتی جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

شاہد بھائی کا قیام پیر الٰہی بخش کالونی میں تھا اور مَیں اُن دنوں جہانگیر روڈ کے ایک کوارٹر میں مقیم تھا۔ ریڈیو اسٹیشن یہاں سے کالے کوسوں تھا اس لیے روزانہ صبح ہم دونوں سائیکلوں پر سوار ہو کر ریڈیو اسٹیشن جاتے اور یہی واپسی میں ہوتا۔ کچھ دنوں کے بعد ہم لوگوں نے ایک پُرانی موٹر سائیکل خرید لی۔ شاہد بھائی پیچھے بیٹھتے۔ اور مَیں موٹر سائیکل چلاتا۔ اس سلسلے میں دو واقعات اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ایک بار یہ ہوا کہ مجھے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ پیچھے کی سیٹ خالی ہے۔ مَیں نے گھبرا کر دیکھا تو شاہد صاحب سیٹ پر نہیں تھے مَیں فوراً پیچھے مُڑا تھوڑی دُور جا کر دیکھا تو شاہد بھائی فٹ پاتھ پر بیٹھے ہنس رہے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ مَیں نے سامنے سے ایک دم آجانے والے دو بچّوں کو بچانے کی کوشش کی تھی اس جھٹکے میں شاہد بھائی نیچے گر گئے اور مجھے کوئی خبر نہ ہوئی، لیکن شاہد صاحب نے اپنے گرنے کو ہنسی میں ٹال دیا اور مجھ سے کچھ نہ کہا۔ اسی طرح ایک دن ہم دونوں بندر روڈ سے گزر رہے تھے کہ بہت موٹی سی بلّی سامنے آگئی۔ مَیں نے بلّی کو بچانے کی کوشش کی اور وہ سامنے سے بھاگی، لیکن سامنے ہی سے محمد علی ٹراموے کی بھاری بس آ رہی تھی جو اسے کچلتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ شاہد بھائی یہ واقعہ کئی دن تک ریڈیو اسٹیشن پر لوگوں کو سُناتے رہے اور کہتے رہے بیچاری کی جان

مفت میں چلی گئی۔

شاہد بھائی کی قربت کے ساتھ ساتھ میں ساقی سے بھی قریب تر ہوتا گیا، لیکن یہاں میں ایک بات خاص طور سے اور زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ قربت کے باوجود شاہد صاحب پرچے کی ترتیب میں کسی قسم کی مداخلت گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ خود پرچہ مُرتّب کرتے تھے اور خود ہی کاپیوں کی تصحیح کرتے تھے۔ اس کے بعد کا سارا کام میرے ذمّہ تھا۔

دنیا کا دستور بہت عجیب ہے۔ مَیں نے بارہا دیکھا کہ جب کوئی نیا آدمی رسالہ نکالنے کا ارادہ کرتا ہے تو پُرانے لوگ یا تو اس پر ہنستے ہیں یا اس کی ہمّت شکنی کرتے ہیں۔ ایک بار شاہد صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ جب اُنہوں نے ساقی نکالنے کا ارادہ کیا تھا تو ان کے خاندان کے ایک صاحب نے، جن کا ایک رسالہ پہلے سے شائع ہوتا تھا، اُنہیں روکا اور کہا: "میاں کیا کروگے رسالہ نکال کر۔" انہوں نے جواب دیا کہ دلّی سے ایک اچھّا ادبی پرچہ نکلنا چاہیے۔ اُن کے عزیز نے کہا کیا یہ ادبی پرچہ نہیں ہے؟ میاں شاہد احمد، اگر تمہیں شوق ہی پُورا کرنا ہے تو اسی میں لکھ لیا کرو۔ شاہد بھائی یہ سُن کر خاموش تو ہو گئے، لیکن انہوں نے ساقی نکالنے کا ارادہ ترک نہیں کیا اور انہی میں مَیں نے یہ خاص بات دیکھی کہ اگر کوئی شخص رسالہ نکالنے کے سلسلے میں اُن سے مشورہ کرتا تو وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، لیکن اُسے تاریکی میں نہیں رکھتے تھے بلکہ صحافت کے نشیب و فراز پُوری طرح واضح کر دیتے تھے اور اُن ہی بزرگ عزیز کا اب بھی یہ حال ہے کہ بھابی کے پاس تعزیت کے لیے پہنچے تو فرمایا: "آپ اب ساقی بند کر دیجیے۔"

مَیں نے اور اسلم نے ۱۹۵۰ء میں نقش جاری کرنے کا ارادہ کیا تو شاہد صاحب

نے نہ صرف ہماری ہمت بندھائی، بلکہ ہمیں ضروری مشورے بھی دیے۔ مئی ۱۹۵۱ء میں نقش کا پہلا شمارہ شائع ہوا جس کی ادارت میں اُن کا نام بھی شامل تھا۔

شاہد بھائی کے مزاج میں بڑی بے نیازی تھی۔ دُوسرے ایڈیٹروں کی طرح وہ اشتہارات کے لیے تگ و دَو نہیں کرتے تھے۔ ساقی کے اشتہارات کے لیے مَیں اپنی مرضی سے کسی کے پاس چلا جاؤں یا کوئی اشتہار بھیج دے تو چھپ جاتا تھا، لیکن مشتہرین سے ملنا شاہد صاحب نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ مَیں کبھی کبھی کہتا بھی تھا کہ شاہد بھائی فلاں جگہ سے اشتہار مل سکتا ہے اگر ایک دفعہ آپ وہاں ہو آئیں تو اشتہار مستقل ہو جائے تو وہ بڑی صاف گوئی سے جواب دیتے کہ ساقی اور شاہد احمد دو دو نہیں ہیں تم یہ چاہتے ہو کہ مَیں بھیک مانگنے نکلوں۔ جب تک چل سکے گا چلاؤں گا ورنہ بند کر دوں گا۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیتے تھے، لیکن کڑی سے کڑی مشکل میں بھی اُنھوں نے ساقی بند کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اسی قناعت پسندی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ بڑے صاف گو تھے کسی بڑے افسر یا صاحبِ ثروت کی ہاں میں ہاں ملانا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ کسی محفل میں اگر کوئی ایسی بات ہوتی جس سے وہ متفق نہ ہوتے تو عام طور پر خاموشی اختیار کرتے اور اگر کوئی اُن کی رائے پُوچھ لیتا تو جھجک کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر دیتے اور کبھی کبھی انہیں اس صاف گوئی کی وجہ سے نقصان اُٹھانا پڑا، چنانچہ اسی کی وجہ سے ایک دفعہ ریڈیو سے اُن کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔

شاہد بھائی کو اپنی ادبی خدمات پر کوئی غرور نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ لوگوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں ہم نے کون سا تیر مار لیا ہے جو لوگ ہمیں یاد رکھیں گے، لیکن آنکھوں دیکھی بات تو یہ ہے کہ مُلک کے

باشعور طبقے میں اُن کی بڑی اہمیت تھی اور ہر مکتبۂ خیال کے لوگ اُن کی بات مانتے تھے۔ یہاں میرے ذہن میں ایک واقعہ آتا ہے۔ رائٹرز گلڈ کے قیام کے سلسلے میں مصنفّوں کا ایک کنونشن منعقد ہوا تھا۔ اس کے صدر استقبالیہ خود شاہد بھائی تھے۔ ضروری کارروائیوں کے بعد انتخابات شروع ہوئے۔ باہر سے آنے والے تمام نمائندے خود اپنے لیے یا اپنے دوستوں کے لیے کوشاں تھے، لیکن کراچی کے تمام ادیبوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ کراچی کے سلسلے میں انتخابات نہیں ہوں گے اور شاہد صاحب سے کہا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے نام منتخب کر کے اعلان کر دیں۔ شاہد بھائی نے اصرار کیا کہ ہم سب بیٹھ کر آپس میں طے کیے لیتے ہیں، لیکن کوئی شخص اس پر تیار نہیں ہوا اور شاہد بھائی ایک طرف جا کر نام لکھنے لگے۔ اتنے میں ایک بہت بڑے شاعر جھومتے ہوئے اُن کے پاس پہنچے اور فرمانے لگے کہ میں کچھ مشورہ دُوں اتنے میں کراچی کے تمام ادیبوں نے شور مچایا کہ ان صاحب کو ہٹایئے اور شاہد بھائی نے بھی تیوری بدل کر انہیں اشارہ کیا کہ آپ دوسری طرف تشریف لے جائیں اور وہ عظیم شاعر اپنا سا مُنہ لے کر وہاں سے چلے آئے۔

فہرست مکمّل کرنے کے بعد شاہد صاحب نے کہا کہ پہلے سب لوگ اس فہرست کو دیکھیں، لیکن سب لوگوں نے نعرہ لگایا کہ دیکھنے کی ضرورت نہیں آپ کا فیصلہ ہمارا فیصلہ ہے، چنانچہ شاہد بھائی نے کراچی ریجن کی طرف سے ناموں کا اعلان کر دیا اور کراچی کے تمام ادیبوں نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

شاہد بھائی پہلی ملاقات میں کچھ خشک اور مغرور نظر آتے تھے اور نئے ملنے والے اُن کی سنجیدہ اور مختصر گفتگو سے کوئی اچھّا تاثر لے کر نہ اُٹھتے۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ نئے آدمیوں سے مِلتے ہوئے گھبراتے تھے اور گھبرانا بھی چاہیے۔

صبح سے شام تک پچاسوں آدمی ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ کوئی دیوان پر دیباچہ لکھوانے کوئی افسانے پر اصلاح کرانے اور کوئی صرف انہیں دیکھنے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں کوئی بھی انسان نئے آنے والوں سے سنجیدہ اور مختصر گفتگو ہی کر سکتا ہے، لیکن دوستوں کی محفل میں وہ سراپا بہار تھے اور اُن کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ خود بھی فقرے کستے اور دوسروں کے دلچسپ فقروں کی داد بھی دیتے اور اگر ان کا کوئی چھوٹا بھی اُن پر اچھّا فقرہ چُست کر دیتا تو وہ مزہ لیتے تھے۔

مہمان نوازی شاہد صاحب کی خاندانی میراث تھی۔ باہر سے آنے والے ادیب اور فن کار کو اپنے گھر بُلانا اور دعوت کرنا گویا شاہد صاحب کے فرائض میں داخل تھا۔ ان دعوتوں میں کچھ اور لوگ بھی شریک ہوتے تھے، لیکن جمیل صاحب، اسلم اور میری شرکت ضروری تھی۔ کھانے کے بعد گانے کی محفل بھی جمتی اور بعض اوقات تو ایسی یادگار محفلیں منعقد ہوئیں جس میں بیک وقت دو ڈھائی سو آدمی شریک ہوتے۔ ادیبوں اور شاعروں کی دعوت میں کھانے کے بعد گفتگو ہوتی رہتی، لیکن شعروشاعری کا سلسلہ نہیں ہوتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ شعر کے معاملے میں شاہد صاحب بڑے باذوق تھے فارسی اور اُردو کے بے شمار شعر انہیں یاد تھے اور شعر فہمی کا انہیں بڑا سلیقہ تھا، لیکن وہ شعر سُنتے ہوئے بہت گھبراتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شاعر نے شاہد صاحب کو اپنے شعر سُنانے شروع کر دیے اور ہم لوگوں نے تفریح کی خاطر اشعار پر داد دینی شروع کی۔ اُس وقت تو شاہد صاحب مروّت میں کچھ نہ کہتے تھے، لیکن بعد میں وہ اپنی برہمی کا اظہار ضرور کرتے تھے اور کہتے کہ اسے شعر پلانے کے لیے میرے علاوہ

کوئی اور نہیں ملا تھا۔

ذہن کے سامنے پے در پے یادوں کا ایک سلسلہ اُبھرتا چلا آرہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کسے لکھوں اور کسے نہ لکھوں۔ بیس سال کی رفاقت کے یہ نقوش شاید میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ آج سوچتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاہد صاحب کی تمام خوبیوں سے قطع نظر ان کی یہ خوبی کس طرح بیان کروں کہ وہ دراصل پارس پتھر تھے جو چھُو گیا کندن بن گیا۔ وہ نہیں رہے، لیکن اُن کا نام اور کام دونوں ہمیشہ اُن کی یاد تازہ رکھیں گے اور پھر اس "نقش" میں بھی انہی کے نام سے رنگِ ثباتِ دوام جھلکنا شروع ہؤا۔ کاش یہ رنگ اور گہرا ہو جاتے۔

آہ شدّو بھائی

پیر ولایت حسین خمار دہلوی

آج مئی کی ۲۰ تاریخ ہے ۔ اس منحوس دن کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ پورے ایک سال پہلے آج ہی کے دن ریڈیو پاکستان کراچی نے اپنی صبح کی خبروں میں مولانا شاہد احمد دہلوی کے انتقالِ پُرملال کی خبر نشر کی تھی۔ آج ہی کے منحوس دن میرا دیرینہ رفیق، میرا عزیز دوست، میرا محسن، ادب کا پرستار، اُردو زبان کا سچّا بہی خواہ چالیس سال کی پُرخلوص دوستی کو نظر انداز کرکے اِس دیارِ فانی سے رخصت ہوگیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

شاہد بھائی تقریباً آٹھ دس ماہ سے علیل تھے۔ اُن کی علالت اور بے وقت موت کا سبب چند ایسے سانحات تھے جو یکے بعد دیگرے ۱۹۶۶ء میں اُنہیں پیش آئے اور اُن کی کمرِ ہمّت توڑ کر رکھ دی۔ ان سانحات کا ذکر اکتوبر ۱۹۶۶ء میں وہ اپنے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

میاں خمار۔ دُعا

تم آجکل کہاں ہو کچھ پتہ نہیں چلتا؟ ہم پر تو اس سال قیامت گزر گئی۔ فروری میں بہن نمبرہ (عشو) کے میاں نواب احمد نے یکایک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔ سینتیس اڑتیس سال کی عُمر ہوگی۔ دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ اس سانحے کے چند روز بعد عبدالعزیز میرے ہم زُلف نے لاہور سے اطلاع دی کہ اُن کا بائیس تیئس سال کا لڑکا تسنیم ایک حادثے میں ختم ہو گیا۔ ۱۱ مارچ کو میری ٹانگ کا اپریشن ہوا۔ اِس کا دورانِ خون بند ہو گیا تھا۔ دو مہینے یاور و دلاور عباس کے مطب میں پڑا رہا۔ اب بھی لکڑی کے سہارے چل لیتا ہوں۔ مارچ ہی میں میری لڑکی نمبر ۳ (مُنّی) کا ایک ہاتھ اور پیر رہ گیا۔ جناح ہسپتال میں ڈاکٹر (ڈاکٹر کا نام نہیں پڑھا گیا) نے دماغ کا اپریشن کیا۔ سات مہینے کی اذیت ناک علالت کے بعد مُنّی ۱۲ اکتوبر کو سدھار گئی۔ تین چھوٹی چھوٹی بچّیاں چھوڑ گئی۔ غرض یہ سال ہمارے لیے ابتلا اور پریشانیاں ہی لایا۔ اللہ خیر کرے۔

تبدیلیٔ ماحول کی غرض سے میں ۲۳ اکتوبر اتوار کو لاہور سے پہلی ریل کار سے پنڈی پہنچوں گا۔ ممکن ہو تو اسٹیشن پر ملو، ورنہ اس پتے سے میری آمد و قیام کے بارے میں دریافت کرو (مخدوم احمد 6/2 .9 - E - ۲۰۲ اسلام آباد) یہ منظور صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ منظور جو ہمارے گانے کے پرانے ساتھی اور ہم جماعت تھے۔ اگر تم نہیں ملے تو میں پیر کو تمہیں تلاش کرنے ریڈیو پاکستان راولپنڈی جاؤں گا۔ پنڈی میں چار پانچ دن قیام رہے گا۔

باقی بروقت ملاقات۔ رحمت (میری بیگم)، سلمٰی کو دُعا۔

دُعاگو۔ شاہد احمد

خط ملتے ہی میں اس خیال سے کہ اُنہیں اپنے ساتھ مظفر آباد لے آؤں۔ یہاں اُن کی طبیعت بہل جائے گی، راولپنڈی پہنچا، مگر تین دن کی تلاش بسیار کے بعد میں ناکام لوٹ آیا۔ ایک ماہ بعد مجھے اُن ہی کے ایک خط سے معلوم ہُوا کہ لاہور میں ایکاایکی اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہُوئی اور وہ فوراً واپس کراچی چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر دل کا دورہ پڑا۔ گو وہ اِس دورے کے بعد کچھ سنبھلے، مگر صحت بحال نہیں ہُوئی؛ چنانچہ اپریل میں پھر دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں کے مشورے سے جناح ہسپتال میں داخل کر دیا گیا، جہاں تین دن آکسیجن دی جاتی رہی اور وہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ ایک ماہ بعد ہسپتال سے گھر آئے۔ ڈاکٹروں نے مکمّل آرام کا مشورہ دیا، مگر جس کی جان خدمتِ ادب اور زبان اُردو کی ترویج و ترقّی میں اَٹکی ہُوئی ہو، اُسے چین کہاں؛ چنانچہ اپنی جان لیوا بیماری کو نظر انداز کر کے کام میں جُٹ گئے۔ نتیجہ یہ کہ ۲۷ مئی کی رات کو ایکاایکی پھر دل کا دورہ پڑا اور اس سے پہلے کہ ڈاکٹر گھر پہنچے، وہ مردِ میدان زبان و ادب۔ ہاتھ میں قلم، دماغ میں زبان کا سودا، اور دل میں خدمتِ ادب کا جذبہ لیے اِس دیارِ فانی سے رخصت ہو گیا۔

اِتنے جانکاہ حادثات، مسلسل علالت، ضعیفی، دوستوں کی بے مروّتی، بیس پچیس افراد کا خاندان۔ پیسے کی نا ہوتی موت نہ آتی تو اور کیا ہوتا!

شاہد بھائی سے مری یوں تو ننہیال اور ددھیال دونوں طرف سے عزیزداری تھی اور اُنہیں دیکھا بھی تھا، مگر اُن سے براہِ راست ملاقات ۱۹۲۸ء میں اپنے حقیقی ماموں زاد بھائی سیّد انصار ناصری سابق ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کے ساتھ خان بہادر میر ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام (انصار کے دادا۔ میرے نانا) کے مکان پر ایک موسیقی کی محفل میں ہُوئی اور یہ پہلی ملاقات ہی انتہائی پُرخلوص دوستی کا سبب

بنی۔ اِن چالیس سال میں باوجود چند خود غرض حاسد احباب کی ریشہ دوانیوں ، منافقانہ سرگرمیوں کے میرے اُن کے درمیان نہ کبھی بدمزگی ہُوئی اور نہ اختلاف رائے۔ جس انداز سے دوستی شروع ہُوئی تھی اُسی انداز سے اُن کی وفات تک قائم رہی۔ اِس کا سبب بے غرض محبّت اور خلوص تھا۔ جس رات اُن کا انتقال ہُوا اُسی دن اُنھوں نے مجھے آخری خط تحریر کیا جو مجھے اُن کے انتقال کے تین دن بعد ملا۔

مولانا شاہد احمد صاحب، ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور ڈپٹی بشیر احمد کے صاحبزادے تھے۔ اُن کی تاریخ پیدائش ۲؍مئی ۱۹۰۶ء، میری ۱۲؍جنوری ۱۹۱۱ء اور انصار ناصری کی ۶؍جنوری ۱۹۱۱ء ہے۔ اِس طرح شاہد ہم سے پانچ سال بڑے تھے۔ وہ رشتے میں انصار ناصری کے نانا ہوتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں سراج الدّین احمد (شاہد کے برادرِ خورد) انصار ناصری اور میرے مشورے سے شاہد صاحب نے دِلّی سے رسالہ ساقی جاری کیا۔ شاہد مدیر اور انصار ناصری مُدیرِ مسئول قرار پائے۔ انصار و سراج بی۔اے اور شاہد بی۔اے آنرز کرنے کے بعد ایم۔اے کی تیّاریوں میں مصروف تھے۔ اِن دونوں کی مصروفیت کی بنا پر ساقی کی اشاعت کا تمام تر کام میرے سپرد ہُوا اور آج مجھے یہ کہتے ہُوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۳۰ء میں دِلّی سے ساقی کا پہلا پرچہ میرے ہاتھوں شائع ہُوا اور اس طرح میرے اور شاہد کے مراسم اِس قدر بڑھے کہ ہم ایک عرصے تک ایک ساتھ کھاتے پیتے، اُٹھتے بیٹھتے اور سوتے تھے۔

ساقی کے شروع کے پرچوں میں میرے مضامین بھی شائع ہُوئے مگر ساقی کی دیگر اشاعتی مصروفیات اور ذمّے داریوں کی وجہ سے جن میں کاتبوں کو مضامین پہنچانے، کاپیاں واپس لانی، دیکھنی، پریس پہنچانی، پروف لانے پڑھنے، پریس پہنچانے،

پریس کے چکر، بائنڈنگ کرانی یہاں تک کہ رسالہ چھپنے کے بعد خریداروں کے پتے لکھنے، ٹکٹ چپکانے اور پھر ڈاکخانے جاکر ساقی پوسٹ کرانا بھی شامل تھا، مجھے اپنے ادبی ذوق شوق کو قربان کرنا پڑا۔ یہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اُس وقت ادارۂ ساقی میں صرف دو ہستیاں شامل تھیں شاہد و انصار۔ انصار ناصری اپنی تعلیمی مصروفیات کی بناء پر اشاعتِ ساقی پر بہت کم وقت دے پاتے تھے، مگر باوجود اِس کے ساقی دن دُونی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ جُوں جُوں ساقی کی اشاعت حیرت انگیز طریقے پر بڑھتی رہی، کام بھی بڑھتا چلا گیا۔ اُدھر انصار ناصری اپنے تعلیمی مشاغل کی وجہ سے تقریباً ساقی سے کنارہ کش ہو گئے۔ شاہد صاحب نے اِن حالات سے مجبور ہو کر ادارہ میں سے انصار ناصری کا نام حذف کر کے اُن کی جگہ میرا نام لانے کی کوشش کی، مگر میں نے خاندانی چپقلشوں سے بچنے کے لیے اُن کی یہ تجویز رَد کردی۔ میں ساقی کی خدمت نام یا پیسے کے لالچ سے نہیں ۔ بلکہ شاہد کی دوستی اور اپنے ذوقِ ادب کی وجہ سے کر رہا تھا۔ میں نے ساقی کی مذکورہ خدمات کے علاوہ ایک عرصے تک ساقی میں چھپنے والے مضامین کی لوحیں تک خود بنائی ہیں۔ لوح کے نیچے رسُول نمائی S.W.H. RASOOL NAMI لکھا ہوتا تھا۔

ساقی کے ادارے میں اُس وقت بطورِ منشی ایک نام اشتیاق حُسین چشتی کا بھی تھا۔ یہ شاہد صاحب کے والد کے سالے کے سالے تھے۔ یہ اُن کی جائیداد کے سیاہ وسفید کے مالک اور اپنے آپ کو ڈپٹی سمجھتے تھے۔ بہ این وجہ یہ رسالے کے کام میں کبھی کوئی حِصّہ نہ لے سکے۔ بجز اس کے کہ ساقی کے لیے روپیہ فراہم کردیں اور کاغذ وغیرہ دلوادیں۔

اس مضمون میں اِن تمام باتوں کا ذکر میں نے اس لیے ضروری سمجھا کہ ساقی

کے دو ایک بہت بعد کے مضمون نگار جو اب بڑے ادیبوں اور شاہد بھائی کے قریبی دوستوں میں شمار کیے جانے لگے ہیں (جن کے نام اخلاقاً میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا) اپنے دو ایک مضامین میں میرا ذکر مضحکہ خیز انداز میں کر چکے ہیں۔ میرے پاس شاہد بھائی کے شروع زمانے کے ایسے خطوط بھی محفوظ ہیں جن سے میری واضح حیثیت سامنے آجاتی ہے۔

سانولی رنگت، کتابی چہرہ، ہنستی آنکھیں، مناسب موزوں پتلی ناک، سفید موتی جیسے دانت، پان کھاتے تو کیا مجال جو دانتوں پر سُرخی جم جائے۔ نچلا ہونٹ البتّہ قدرے بھاری تھا، مگر ایسا نہیں کہ بدنُما معلوم ہو۔ درمیانہ قد، اکھرا بدن، پشت میں خفیف ساخَم جو ہمیشہ گردن جھکائے چلنے سے پیدا ہو گیا تھا کہ شریفوں کا شیوہ نظریں جھکا کے چلنا تھا۔ آنکھوں پر ہلکے آسمانی رنگ کے شیشوں کی عینک لگی رہتی۔ دُور کی نگاہ قدرے کمزور تھی۔ سَر پر شیر گولہ مارکہ ترکی ٹوپی۔ گھر میں حیدرآبادی تہمد، باہر نکلتے تو سیدھی موری کا پاجامہ، پائینچے کی موریوں میں جالی بنی ہوئی، کُرتا، اُس پر سیدھے سادھے سوتی کپڑے کی اچکن، پیر میں سلیم شاہی جے پوری جوتی۔ بازار میں تنہا نکلتے بہت گھبراتے، کوئی نہ کوئی ساتھ ہوتا۔ ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنا ان کی خاص عادت تھی جو مرتے دم تک قائم رہی۔

شاہد بھائی انتہائی سیدھی سادھی اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ مزاج میں شوخی اور بذلہ سنجی کُوٹ کوٹ کر بھری ہُوئی تھی۔ حد درجہ حاضر جواب تھے۔ فقرے چُست کرنے اور ضلع جگت میں ماہر۔ بظاہر سنجیدہ اور لیے دیے رہتے کہ ہما شما کو بات کرنے کی ہمّت نہ پڑتی، مگر نجی محفلوں میں باغ و بہار۔ مزاج میں خاکساری بدرجۂ اتم تھی۔ لہجے میں ایسی مٹھاس و حلاوت کہ جس سے ایک دفعہ بات کرتے اُن

کا گرویدہ ہو جاتا۔ اخلاق کا یہ عالم کہ ہر شخص اُن کے گُن گاتا۔ چہرے میں ایسی جاذبیت کہ جو ایک دفعہ دیکھ لیتا، عورت ہو یا مرد، اُن کا ہو رہتا۔ اکثر شادی بیاہ کی تقریبوں میں مَیں نے لڑکیاں کیا بیاہیوں کو بڑی حریص نظروں سے گھورتے دیکھا ہے۔

بقول جوشؔ صاحب یہ صحیح ہے کہ آواز اچھّی نہیں تھی، مگر پھر بھی آواز میں ایسی کشش ایسی حلاوت تھی کہ حسین کانوں کو اپنی طرف متوجّہ کیے بغیر نہ چھوڑتی تھی اور یہ بات صرف میں ہی کہہ سکتا ہُوں اس لیے کہ میرے اُن کے درمیان کوئی راز نہ تھا۔ میرے بغیر مشورے اُنھوں نے محبّت بھی نہیں کی۔ بیک وقت چار چار پانچ پانچ لڑکیاں یہ جانتے ہُوئے بھی کہ وہ بال بچّوں والے ہیں، اُن کی محبّت میں گرفتار اُن کا دم بھرتی رہیں اور یہ حُسن پرستی کی حد تک اُن سے کھیلتے رہے۔

شاہد اُونچے لوگوں سے ملتے ہُوئے ہمیشہ کتراتے اور چھوٹے لوگوں سے ہمیشہ جُھک کے مِلتے۔ اپنے مُنہ میاں مٹھّو بننے والوں سے وہ بہت جلتے تھے۔ طبیعت کی خاکساری اُن کا طرّۂ امتیاز تھی۔ مزاج شاہانہ پایا تھا۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرتے۔ غریبوں، ناداروں کی امداد ان کا ایمان، اور دوست احباب کے ساتھ سلوک فرض جانتے تھے۔ سادگی کا یہ عالم کہ گرمی ہو یا جاڑا کبھی بیش قیمت لباس نہیں پہنا۔ بیش قیمت لباس پہننے والوں پر دولہا میاں کی پھبتی کستے۔ گھر میں اکثر حُقّہ یا بیڑی اور باہر ہمیشہ بیڑیاں پیتے۔ کبھی کسی محفل میں کوئی میزبان سگرٹ پیش کرتا تو فوراً اچکن کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر دکھاتے ہُوئے کہتے:

"میں تو یہ پیتا ہوں۔"

سینما بہت کم دیکھتے تھے وہ بھی دو چار کے ہمراہ اور چھوٹے درجے میں۔ خواتین کے ساتھ اپنی ہوں یا پرائی باہر نکلتے اُن کی جان نکلتی۔ گھر کی خواتین کو جب

بھی سینما یا نمائش دیکھنی ہوتی تو مجھے ساتھ بھیجتے۔ یہاں تک کہ عاصمہ بیگم (موجودہ بیگم شاہد) شاہد کے نکاح میں آنے سے پہلے بریلی میں ٹیچر ٹریننگ لے رہی تھیں۔ جب شاہد اُنہیں بریلی چھوڑنے جاتے مجھے ساتھ لے جاتے۔ عاصمہ بیگم اُن کی بڑی سالی کی لڑکی تھیں۔

شرم و حیا کا یہ عالم کہ کنواری لڑکیوں کو مات کرتے۔ نظر اُٹھا کر بات کرنا تو کُجا، کبھی گاتے وقت بھی اُن کی نظر اُوپر نہ اُٹھتی۔ محفل واہ واہ کے ڈونگرے برساتی تو اور گردن جُھکا لیتے اور نیچی شرمائی نظروں سے شکریہ ادا کرتے۔ ہاتھ کی اُنگلیاں بھی نرم و نازک تھیں۔ اس لیے ہارمونیم بہت اچھّا بجاتے۔ دُور دُور سے لوگ سُننے آتے۔ اُنگلیوں میں صبا کی سی روانی اور قند کی سی مٹھاس تھی۔ دِلّی کے بڑے بڑے باعزّت خاندانوں کی لڑکیاں اُن سے ہارمونیم سیکھتی تھیں۔ میں نے بچشم خود دیکھا کہ سکھاتے وقت نہ سَر اُٹھاتے نہ آنکھ ملاتے، بلکہ بہت سنجیدہ رہتے۔ غلطی پر ڈانٹتے اور ہاتھوں پر فُٹے سے جو اسی مقصد کے لیے پاس رکھّا رہتا تھا، ضربات پہنچاتے۔ خود کم بولتے اور لڑکیوں کے مذاق پر شرم سے گردن جھکا لیتے اور لڑکیاں اُن کے اِس شرمیلے پن پر مَر مٹتیں۔

بقول شاہد صاحب کے "میں دس سال کی عُمر سے افلاطونی عاشق مزاج ہوں" مگر اس افلاطونی عاشق مزاج پر ہمیشہ خاندان کی عزّت غالب رہی اور کبھی بے راہروی اختیار نہیں کی۔

پکّی گائیکی میں اُن کا مقام اتنا بلند تھا کہ بیشتر پیشہ ور فنکار راگ راگنیوں کی صحّت کے لیے اُن کے پاس آتے تھے اور بڑے بڑے اُستاد اُن کے فن کا لوہا مانتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو اور پھر ریڈیو پاکستان کے تمام اسٹیشنوں سے

ایس۔احمد کے نام سے موسیقی کے پروگرام نشر کرتے رہے، مگر دِلّی میں کبھی چیک کو ہاتھ نہیں لگایا یا تو اُسی وقت سازندوں کو یا اپنے دیرینہ استاد بشیر کو جن سے کبھی اُنہوں نے ابتدا میں گانا سیکھا تھا، چیک بھجوا دیتے۔ پاکستان آکر ریڈیو پاکستان کراچی کے شعبۂ موسیقی سے منسلک ہو گئے تھے۔ کراچی میں شاہد اور بیگم شاہد نے (بیگم شاہد بھی فنِ موسیقی سے اچھی واقفیت رکھتی ہیں اور خود ستار بھی اچھا بجاتی ہیں) خود اپنا بھی موسیقی سکھانے کا ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جہاں ہر مذہب و ملّت کے اُمرا کی لڑکیاں اُن سے فنِّ موسیقی کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ خود اُن کے بقول:

"جس نے کبھی موسیقی سے حاصل کردہ پیسے کو ہاتھ نہیں لگایا اُس نے باقی عمر اُس کی روٹی کھائی"۔ مگر خودداری اور پاکستان سے محبت کا یہ عالم تھا کہ یہ ذلّت گوارا کی، مگر پلٹ کر بھارت واپس نہ گئے۔ اگر وہ واپس جاتے تو بھارت سرکار اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیتی اور وہاں خود اپنی جائیداد کیا کم تھی۔ جب لاہور میں چھ مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد بھی ساقی کا ڈیکلیریشن نہیں ملا تو کراچی چلے گئے:

حالانکہ بددِل ہو کر بھارت جا سکتے تھے، مگر اُن کی حُبُّ الوطنی نے یہ گوارا نہیں کیا۔

یہ کون نہیں جانتا کہ شاہد پونڈوں کے امیر تھے۔ پھر اس پر خود اپنی آمدنی دو ڈھائی ہزار رُوپے ماہوار تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب روپے کا سولہ سیر آٹا اور رُوپے کا سیر بھر گھی ملتا تھا، مگر غرور چھو نہیں گیا تھا۔ جتنی امیروں سے نفرت تھی اُتنی ہی غریبوں سے محبّت۔ اپنے آپ کو ہر شخص سے کمتر سمجھتے۔ بلا کے خوددار تھے۔ یہاں مجھے بہت پُرانا ایک واقعہ یاد آیا۔ دِلّی کے ایک رئیس ادیب خلیقی دہلوی کے صاحبزادے آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہو کر لندن جانے لگے، تو خلیقی صاحب نے دِلّی کے بہت بڑے انگریزی ہوٹل میں چاء دی۔ ہم لوگ بھی مدعو تھے (سہ پہر کو شاہد صاحب

کی جائیداد کے منتظم اشتیاق حُسین صاحب (جن کا ذکر میں شروع میں بھی کر چکا ہوں۔ جن کی ماہوار تنخواہ تو اُن کے والد کے وقت سے تیس روپے تھی، مگر دو عدد بیگموں کے مالک تھے۔ اپنا ذاتی مکان، بلکہ حویلی تھی۔ رہن سہن نوابوں جیسا تھا۔ ساری دِلّی انھی کو ڈپٹی صاحب جانتی تھی۔ لین دین کا کاروبار بھی کرتے تھے) شاہد صاحب کے پاس آئے اور چلنے کا تقاضا کیا۔ ہم سب روزمرّہ کا لباس پہن کر چلنے لگے، تو منشی جی بڑی حیرت اور تعجّب سے بولے :

"یہ کیا؟ ارے بھئی دِلّی کے ایک رئیس نے چاء دی ہے۔ اپنے نہیں تو میزبان کے شایانِ شان تو لباس پہنیے۔" وہ خود نفیس قیمتی لباس میں ملبوس تھے۔ شاہد کا مزاج بگڑ گیا۔ بولے :

"اچھّا! لباس مدعو ہیں۔ انسان نہیں۔ خدا حافظ مُنشی جی، آپ تشریف لے جائیے۔" یہ کہہ کر بیٹھ گئے اور پھر منشی جی کے لاکھ اصرار اور خوشامد پر بھی دعوت میں نہیں گئے۔

یوں تو شاہد بھائی کے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا، چاہتے تو ایک چھوڑ دو موٹریں لے لیتے۔ بڑے بھائی کے پاس ایک بڑی موٹر تھی بھی، مگر شاہد ساری دِلّی میں کالج کے زمانے میں سائیکل پر اور پھر پیدل ہی پھرتے۔ بہت ہُوا تو دو پیسے کا ٹکٹ لے کر ٹرام میں بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے زندگی بھر کسی کا احسان نہیں لیا جب کہ تمام دوست احباب کسی نہ کسی صُورت میں اُن کے مرہونِ منّت تھے۔ شاعروں اور خاص طور پر ادیبوں کو جتنا اُنھوں نے بھَرا ہے، شاید ہی کسی نے بھَرا ہو۔ گمنام سے گمنام شاعروں اور ادیبوں کی مدد کی۔ اُن کے مضامین دُرست کر کے ساقی میں شائع کیے اُن کے مجموعے چھاپے اَور اُنہیں بقائے دوام عطا کی۔

مرحوم ناصر نذیر فراق دہلوی نبیرۂ خواجہ میر دردؔ دلی کی مٹتی نشانیوں میں سے تھے۔ شاہد چاہتے تھے کہ ان سے اس وقت جو کچھ حاصل ہو جائے غنیمت ہے کہ پھر یہ لوگ کہاں۔ اُدھر ان کی حالت یہ تھی کہ بادی سے جسم پھولا ہُوا، کھال تنکر چٹخنے لگی تھی۔ آنکھیں سُوجھی ہُوئی، پپوٹے لٹکے ہوئے۔ ہاتھوں میں رعشہ، نہ چل سکتے تھے نہ ٹھیک سے بیٹھ سکتے تھے نہ پڑھنے کے نہ لکھنے کے۔ لکھتے تو پڑھا نہ جاتا۔ مالی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ منشی رکھتے۔ اُن کے صاحبزادے کو اپنے پیٹ کے دھندوں سے فرصت نہ تھی۔ بھائی شاہد کہتے:

"میاں پیرجی' (میری خاندانی نسبت سے وہ مجھے پیرجی کہتے تھے بلکہ سارا حلقہ پیرجی کہتا تھا) کچھ سیکھ لو۔ کچھ خدمت کرلو۔ پھر یہ لوگ کہاں"۔ چنانچہ ہم دونوں کاغذ، قلم دوات لے کر جاتے اور اُن سے قلعۂ معلّیٰ کا ذکر چھیڑ دیتے۔ بس پھر کیا تھا وہ شروع ہو جاتے اور ہم لکھتے جاتے۔ کبھی میں کبھی شاہد۔ اس طرح مضامین جمع ہوتے رہے اور کتاب بنتی رہی۔ اس واقعے کے ذکر سے مقصد یہ بتانا تھا کہ شاہد صاحب نے اُردو ادب کی خدمت کے لیے کیا کیا جتن کیے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور واقعہ یاد آگیا۔

عظیم بیگ چغتائی مرحوم نے بہت کچھ لکھا۔ مگر ایک وقت ایسا آیا کہ چغتائی پر ادبی جمود طاری ہو گیا اور وہ لکھنے سے دست بردار ہو کر بیٹھ گئے۔ اُن کے مخالفین نے لکھنا شروع کیا کہ عظیم بیگ ختم ہُوئے۔ شاہد کو کہ ان کے عزیز دوست تھے، بلکہ شاہد ہی اُنہیں سامنے لائے تھے، یہ ناگوار ہوا؛ چنانچہ وہ فوراً عظیم بیگ کے پاس جودھ پور پہنچے اور کہا:

"پنجاب والے شور مچا رہے ہیں کہ عظیم بیگ ختم ہوئے"۔ عظیم بیگ بولے:

"اچھا! یہ بات ہے تو پھر تم ساقی کا عظیم بیگ نمبر نکال ڈالو۔ کیا خیال ہے؟" شاہد راضی

ہو گئے۔ چنانچہ اُسی وقت شاہد کے ہاتھ میں قلم دوات، کاغذ دیا اور بولنا شروع کر دیا۔ دریا بہہ نکلا جیسے ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ لگا دیا گیا ہو۔ ایک مضمون، دو مضمون۔ ایک دن دو دن، کبھی خود لکھتے، کبھی شاہد، کبھی ان کے چھوٹے بھائی۔ غرض نہ خود سوئے نہ کسی کو سونے دیا اور آٹھ دن میں ایک ضخیم کتاب لکھ کر شاہد کو دے دی اور شاہد نے غالباً ہزار، آٹھ سو صفحات کا چغتائی نمبر نکال کر عظیم بیگ کو پھر سے اَدبی زندگی بخشی۔

شاہد کو ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی تلاش رہتی۔ ہزار ہا اچھے بُرے مضامین اشاعت کے لیے آتے۔ سب کو بغور پڑھتے اور جس میں تھوڑی بہت بھی صلاحیت نظر آتی، اُس کا مضمون دُرست کر کے شائع کرتے اور اُسے بہتر سے بہتر لکھنے کی ترغیب دیتے۔ وہ چلتوں کو چلانے کے قائل نہ تھے۔ وہ چھوٹوں کو بڑا اور گمناموں کو نامور بنا کر خوش ہوتے۔ یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اُنہوں نے کتنے ادیبوں کو صاحبِ قلم بنا دیا۔ میں اُن تمام حضرات سے بذاتِ خود واقف ہوں جو شاہد صاحب کی بدولت صحافی اور مصنّف بنے اور آج بڑے بڑے عُہدوں پر قابض ہیں، مگر اب اس انداز سے سامنے آتے ہیں گویا ماں کے پیٹ سے ادیب یا شاعر نکلے تھے یا شاہد کے ہمعصر اور دستِ راست تھے اور کچھ تو اب اُن کا نام لینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔

شاہد صاحب کو اُن کی وفات سے کچھ دن قبل میں نے "انجمن ترقّیٔ اُردو مظفر آباد" کے اجلاس کے سلسلے میں پیغام بھیجنے کے لیے لکھا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور اُن کے ہمعصر ادیبوں کو بھی پیغام بھیجنے کے لیے لکھا۔ شاہد صاحب نے فوراً اپنا پیغام بھیج دیا، مگر دوسروں نے جواب سے بھی گُریز کیا۔ میں نے شاہد کو لکھا۔ اس کے جواب میں شاہد اپنے خط میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہمارے بھائی پیغام دینے میں بھی بُخل کرتے ہیں، تو اُنہیں اُن کے حال

پر چھوڑ دو۔ ان کے بغیر بھی دُنیا کے کام چلتے رہیں گے۔ یہ اچھّا ہے کہ تمہیں بھی ان کی ذہنیت کا تجربہ ہو رہا ہے۔"

اُن کے آخری فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں بھی دوستوں کی ذہنیت کے تلخ تجربے ہُوئے ہیں۔ ساقی کی اشاعت میں کیا دلی کیا کراچی' قریب سے قریب دوستوں نے، سوائے اپنے مضامین دینے کہ اس میں بھی اپنی غرض شامل تھی، شاہد کی کوئی مدد نہیں کی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی شاہد صاحب کو کسی ضرورت سے باہر جانا پڑتا، ساقی کی اشاعت میں تعطّل پیدا ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان آنے کے بعد ساقی دلّی والی بات پیدا نہ کر سکا۔ اشاعت محدود ہی رہی۔ دلّی میں خود شاہد پُوری توجہ سے کام کرتے تھے اور پھر دو دو مُنشی تھے۔ کراچی کی سکُونت کے بعد پیٹ کے دھندوں نے اتنی مہلت نہ دی کہ شاہد ساقی پر پُوری توّجہ دے سکتے۔ اِن حالات میں منشی کہاں سے رکھتے۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اشتیاق حسین صاحب قریشی سابق وزیرِ نشر و اشاعت اُن کے برابر کے دوستوں میں سے تھے، مگر اُنہوں نے کبھی کسی قسم کی کسی سے کوئی امداد طلب نہیں کی۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میاں، اِن بندوں کے سامنے ممیانے کی بجائے مجھے جو کچھ مانگنا ہوتا ہے، اپنے اللہ سے مانگ لیتا ہُوں۔"

ایک اور خط میں مجھے تحریر کیا تھا:

"غنیمت ہے کہ تم پُرانی دوستی نبھا رہے ہو۔ دُوسرے تو اس کے بھی روادار نہیں۔"

شاہد بھائی کے اِن خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ آخیر میں وہ دوستوں سے بہت دُکھی رہے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں جب ساقی کا طوطی بول رہا تھا، تو اطراف و جوانب سے بڑے بڑے صحافی، ادیب و شاعر شاہد صاحب سے ملنے یہ تصوّر لیے ہُوئے آتے کہ ساقی کا دفتر کسی شاہراہ پر کسی عالیشان عمارت میں بہترین انگریزی فرنیچر اور ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ ہوگا۔ کوئی معمّر یا ادھیڑ عُمر کا مدبّر سا انسان کسی بڑی سی میز کے سامنے انگریزی لباس زیب تن کیے کُرسی پر براجمان ہوگا، مگر آنے والا جب گلی در گلی، کوچہ در کوچہ "تماشوں والی" تنگ و متعفن گلی کے متعدّد موڑ کاٹتا ڈیوڑھی در ڈیوڑھی، زینہ در زینہ طے کرتا ہانپتا کانپتا تیسری منزل پر ساقی کے دفتر میں پہنچتا، تو دفتر کی ہیئتِ کذائی دیکھ کر سٹ پٹا جاتا اور سمجھتا کہ شاید وہ بھُول کر غلط جگہ آ گیا ہے۔ مختصر سا کمرہ جس میں دری و چاندنی کا فرش، دو تین ملگجے گاؤ تکیے۔ کمرے میں ایک طرف دو کاتب بیٹھے کتابت کر رہے ہیں، تو دُوسری جانب رسالوں، کتابوں اور اخباروں کے انبار لگے ہیں۔ بیچ میں شاہد صاحب تہمد باندھے، بنیان پہنے خطوں کے جواب لِکھنے یا ساقی کے پروف پڑھنے میں مصروف ہیں۔ ایک طرف بیڑیوں کا بنڈل، ماچس اور دُوسری طرف دیسی ساخت کا قلمدان رکھا ہے۔ ایک دلچسپ واقعہ پھر ذہن کے افق پر اُبھرا ہے، لیجیے وہ بھی سُنتے چلیے:

ایک دن ایک صاحب بوٹیڈ سُوٹیڈ، ٹائی باندھے، ہیٹ لگائے۔ سانولے سلونے، بانکے، ترچھے، ڈاڑھی مونچھ صاف، ہانپتے کانپتے، کچھ گھبرائے سے ساقی کے دفتر پہنچے۔ میں اور شاہد ساقی پیک کر رہے تھے۔ میں ریپر چڑھا رہا تھا اور شاہد پتے لکھ رہے تھے۔ آنے والے نے حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ جھجکتے ہماری طرف بڑھے اور پھر بڑے بارُعب لہجے میں انگریزی میں یُوں گویا ہُوئے:

"میں ساقی کے ایڈیٹر شاہد سے مِلنا چاہتا ہوں۔" شاہد نے سُنی اَن سُنی کرتے

ہُوئے کہا:

"آپ کو غلطی ہُوئی یہ کسی انگریزی میگزین کا آفس نہیں ساقی کا دفتر ہے۔"
خفیف ہوتے ہُوئے اُردو میں بولے: "شاہد صاحب سے ملنا چاہتا ہوں" شاہد نے بیٹھے بیٹھے السلام علیکم کہہ کے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ اظہارِ ناراضگی کرتے ہُوئے تحقیر آمیز لہجے میں بولے: "میں شاہد صاحب سے ملنا چاہتا ہوں" شاہد بولے: "خاکسار ہی کو شاہد کہتے ہیں" کچھ شرمندہ ہوتے ہُوئے چوکھٹ پر کھڑے کھڑے اپنا تعارف کرایا "لطفی اجمیری" شاہد بے تکلّفی سے زور سے بولے: "اخّاہ! لطفی ہیں۔ آؤ بھئی آؤ۔ جُوتے اُتار کر آجاؤ" (لطفی اُس وقت ساقی کے اچھے افسانہ نگاروں میں سے تھے) جُوتے اُتارنے سے وہ ذرا گھبرائے، مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ جُوتے اُتار کر جب وہ اندر آئے، تو اُن کے پاؤں میں پھٹے مَیلے موزے دیکھ کر ہم سمجھے کہ وہ جُوتے اُتارتے ہُوئے کیوں کترا رہے تھے۔ وہ گاؤ تکیے کے پاس اپنے پاؤں چھُپاتے ہُوئے دوزانو بیٹھ گئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شاہد نے چائے کو پُوچھا، تو بولے چائے ضرور پیوں گا۔ آپ چائے بنوائیں میں ابھی دس منٹ میں حاضر ہُوا۔ جب وہ گئے تو گاؤ تکیے کے پاس پھٹے ہوئے موزے پڑے دیکھ کر ہم سمجھے کہ وہ کہاں گئے۔ پھر جو آئے تو پاؤں میں نئے موزے تھے، مگر شاہد کب چُوکنے والے تھے، بولے:

"اماں، موزے ہم منگوا دیتے۔" لطفی اِس بے تکلّفی پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

شاہد بھائی، صاحبِ طرز ادیب تھے۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھّا کوثر میں دُھلی ہُوئی دِلّی کے قلعۂ مُعلّیٰ کی ٹکسالی زبان میں لکھّا۔ شاہد صاحب اوّل اوّل لکھنے سے بہت گھبراتے تھے۔ کہتے مُجھے لِکھنے کو کُچھ سُوجھتا ہی نہیں نہ جانے لوگ کیسے لکھ لیتے

ہیں۔ اس لیے وہ اکثر انگریزی سے ترجمے کرتے، مگر وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ پھر انہوں نے لکھا اور ایسا لکھا کہ قلم توڑ دیا اور لکھنے والوں نے صاحبِ طرز ادیب کہہ کر ان کا لوہا مان لیا۔ شاہد صاحب کو انگریزی زبان پر بھی اُتنا ہی عبور تھا، جتنا اُردو اور فارسی پر مگر انگریزی بولنا وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ اکثر ادیب و صحافی اپنی شخصیت اُجاگر کرنے یا اپنا رُعب گانٹھنے کے لیے انگریزی میں بات چیت شروع کر دیتے، مگر شاہد ٹکسالی اُردو میں جواب دیتے یہاں تک کہ ہمکلام خفیف ہو کر اُردو بولنے لگتا۔ وہ فضول طویل گفتگو سے بہت گھبراتے۔ کام کے سلسلے میں ہمیشہ دو ٹوک بات کرتے اِسی لیے ہُما شُما سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ شاعروں سے وہ ہمیشہ کنّی کاٹتے۔ کہتے کہ اُن کے پاس کہنے کو صرف ایک ہی بات ہوتی ہے اور وہ یہ کہ "ساقی کا حِصّہ نظم ذرا کمزور ہے۔" اِس لیے کہ ساقی میں اُن کی نظم یا غزل شائع نہیں ہوتی۔ انہیں بہ نسبت نظم کے نثر پسند تھی۔ وہ چاہتے تھے ہر شخص نثر لکھے اور اتنا لکھے کہ دریا بہہ جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ساقی میں بہت کم شعرا کا کلام شائع کرتے۔ وہ بھی شرما حضوری اور اسی لیے شاعر ہمیشہ ان سے ناراض رہے۔ اُنہوں نے خود کبھی شعر نہیں کہا، مگر سخن فہم بلا کے تھے۔ جب کبھی کوئی شاعر بزعم خود اُن سے اُلجھ جاتا تو اس کی شاعری کا وہ تجزیہ کرتے کہ اُسے بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ وہ ادب کے سِلسلے میں خود کبھی کسی سے نہیں اُلجھے، لیکن اگر کوئی اُلجھ جاتا تو پھر ایسا پیچھے پڑتے کہ اُسے قبر تک پہنچا کر دم لیتے۔ اس سلسلے میں ثبوت کے لیے ساقی کا "جوش نمبر" موجود ہے۔ شمسُ العلما خواجہ حسن نظامی مرحوم کے بعد بے لاگ شخصیت نگاری شاہد سے بہتر کسی نے نہیں کی۔ اس سلسلے میں وہ خود بھی بیباک تھے اور ان کا قلم بھی ـــــ لحاظ مروّت میں کبھی کسی کی بے جا تعریف نہیں کی۔ جہاں خوبیاں بیان کرتے وہاں عیب یا نقائص بیان کرنے

میں بھی کمی نہ کرتے۔

شاہد صاحب کی ادب نوازی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ادب کی خاطر ایسے دوستوں سے بھی دوستی ترک نہیں کی جنہیں خود شاہد نے لکھنا سکھایا اور اُنہی نے شاہد کو ڈسنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے، شاہد اپنی بیمار اہلیہ کے علاج کے سلسلے میں حیدر آباد دکن گئے۔ اور عارضی طور پر ادارت کے فرائض مجھے سونپ گئے۔ میں اتّفاق سے سخت بیمار ہوگیا اور کئی دن ساقی کے دفتر نہ جاسکا۔ شاہد صاحب کا خط آیا کہ ساقی وقت پر شائع ہونا چاہیے۔ میں بحالتِ بیماری پہنچا۔ کاتب صاحبان سے جنہیں میں نے مضامین کتابت کرنے کو دیے تھے، حالات معلوم کیے۔ ایک کاتب نے جو ابھی حیات ہیں اور کراچی میں ہیں، مجھ سے کہا کہ فلاں صاحب (نام قصداً نہیں لکھتا یہ بھی قریبی دوست ہیں) کے مضمون کی وجہ سے کہ وہ روز دو تین صفحے دے جاتے ہیں، دیر ہو رہی ہے۔ میں نے دیکھنے کو مضمون مانگا، تو کاتب بولے:

"وہ آپ کو دکھانے کو منع کر گئے ہیں۔"

میں نے کہا پرچہ میں مُرتّب کر رہا ہوں یا وہ؟ تب اُنہوں نے مضمون دکھایا۔ مضمون پڑھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ مضمون نگار نے اپنے ایک دوست کا انتقام لینے کے لیے (یہ ایک الگ طویل نجی داستانِ عشق ہے) شاہد کے خلاف وہ زہر اُگلا تھا کہ خدا کی پناہ۔ اُن کی نجی زندگی کو بے نقاب کرتے ہُوئے اُن پر اس قدر تہمت تراشی کی تھی، اس قدر گندگی اُچھالی تھی کہ دُشمن بھی یہ نہ کرتا۔ میں نے مضمون اپنے قبضے میں کیا، کاپیاں کٹوائیں، اُس کی جگہ دُوسرا مضمون لکھنے کو دیا اور شاہد کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ تین ماہ بعد شاہد واپس آئے، مضمون دیکھا تو سر پیٹ لیا۔ کچھ عرصہ ناراضگی رہی مگر ایک دن وہ صاحب آئے اور معافی چاہی اور شاہد نے کُھلے دل سے معاف

کر کے گلے سے لگا لیا۔ وہ سچّے مسلمان تھے، دل میں کینہ رکھنا، لڑے رہنا گناہ سمجھتے تھے۔ ایسے موقعے پر وہ ہمیشہ خود پہل کرتے (حیدر آباد سے جو خطوط شاہد بھائی نے مجھے لکھے، وہ میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔)

شاہد اپنے کردار کا اعتراف خود اپنی زبان سے "نقوش" کے آپ بیتی نمبر میں اِس طرح کرتے ہیں: "بیمار بیوی کی خدمت کرنا تو میرا فرض تھا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی جو میں بیزار ہو جاتا تھا اور بُرے بُرے خیال دل میں لاتا تھا تو شاید مجھے اللہ میاں اس لیے معاف کر دیں کہ میں نے اپنی دائم المریض بیوی کو سوکن کا دُکھ نہیں پہنچایا، حالانکہ ایک دو نہیں بیسیوں لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کی خواہشمند تھیں۔ میں اُن سب کو بہلاتا ہی رہا اور اُن سے محبّت جتاتا رہا، مگر بیوی کے انتقال کے بعد بھی میں نے اُن میں سے کسی سے شادی نہیں کی اور نہ اپنی بھری جوانی میں کوئی بے راہروی اختیار کی۔ ویسے دس سال کی عُمر سے میں افلاطونی عشق کا مریض ہوں اور چاہنے سے زیادہ چاہا گیا ہوں۔" (اور یہ سب کچھ حقیقت ہے)، شاہد کے خود اپنے اس بیان سے اُن کے صاف شفّاف کردار، انسانیت اور ان کے خلوص و محبّت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اُن کے چاہے جانے کے بے شمار واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں، مگر یہاں اُن کے اظہار کی ضرورت ہے اور نہ موقع۔ شاہد کی شادی اُس وقت ہوئی جب وہ زن و شوہر کے تعلّقات سے بھی ناواقف تھے اور دونوں میاں بیوی گڑیاں کھیلتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنسی بھوک نے کبھی سَر نہیں اُٹھایا۔ صحیح معنوں میں حسن پرست تھے اور بس۔ محبّت میں پہل بھی ہمیشہ جنسِ مخالف کی طرف سے ہوئی۔

۱۹۳۳ء میں مَیں نے شاہد کی سَرپرستی میں ایک علمی و اَدبی رسالہ شاہجہان شائع کیا (اِس رسالے کی کچھ کاپیاں میرے پاس محفوظ ہیں)، جو بہت جلد اچھے رسالوں

میں شمار کیا جانے لگا۔ اشاعت بھی اچھی ہوگئی تھی، مگر میری بدقسمتی کہ مَیں بیمار ہُوا اور ایسا پڑا کہ ایک سال تک پلنگ سے نہ اُٹھ سکا۔ میری اِس طویل بیماری کا دسمبر ۱۹۵۵ء کے ایک خط میں یوں ذکر کرتے ہیں۔

پیرجی، سلام مسنون

۱۲ دسمبر کا خط مِلا۔ شکریہ!

تمہاری علالت کا سلسلہ خاصہ طول پکڑ گیا۔ ویسے تو تم جنم روگی ہو۔ یادش بخیر تمہارے پیٹ کا گولہ کیسے بُھلایا جا سکتا ہے؟ اس سے نجات مِلی تو طرح طرح کے بخاروں نے تمہیں گھیر لیا۔ یہاں تک کہ ہسپتالوں تک نوبت پہنچی۔ اب تمہیں انفلوئنزا ہُوا تو تم نے چھانٹ کر ایسے ڈاکٹر کا علاج کیا۔ جس نے تمہیں ختم ہی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ دیکھو میاں! ابھی اُوپر جانے کا قصد نہ کرو۔ پہلے نیچے کے کام کرلو۔

مجھے معلوم ہے کہ تمہاری "غیوّر فطرت" تمہیں اس کی اجازت نہیں دیتی کہ چاپلوسی اور خوشامد کی باتیں کرو۔ یا کسی سے "منافقت" سے پیش آؤ۔ مگر دُنیا میں رہ کر دُنیاداری تو برتنی ہی پڑتی ہے۔ اپنا کام نکالنے کے لیے اپنے اُوپر جبر کر کے زمانہ سازی کر لیا کرو۔ اس سے تمہیں ذہنی اذیّت تو ضرور ہوگی، مگر اگلے کی کمینی فطرت تو مطمئن ہو جائے گی۔

کل میں ہیڈ کوارٹرز گیا تھا رشید سے ملنے (ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) باہر نِکلا تو نسیم الظفر سے ملاقات ہُوئی۔ نظامی صاحب ایک مہینے کی چھٹّی گئے ہُوئے ہیں۔ غالباً لاہور میں چھُٹی گزاریں گے۔ تُم ان سے مل کر اپنے سالے محمد اسمٰعیل کے لیے سفارش کرا سکتے ہو۔

مظفر آباد چلے جاؤ گے تو اچھے رہو گے۔ وہاں بچّوں کے لیے اسکوُل تو ہونگے؟

راولپنڈی کے مقابلے میں سستا بھی ہوگا (حالانکہ ہے نہیں)، نرگس سلمہا (میری بڑی لڑکی) کا خط مَیں نے اُن کی بچی کو دے دیا ہے۔ خط لکھنے کی وہ بھی خاصی چور ہیں۔

فضلِ حق سے مہینوں ملاقات نہیں ہوتی۔ اُن کے دفتر جاؤں گا، تو تمہارا سلام پہنچادوں گا۔ رحمت سلمہا (میری بیگم)، اور بچّوں کو دُعا۔

خاکسار

شاہد احمد

شاہد صاحب "شاہجہاں" کے اداریے میں ایک طویل نوٹ لکھ کر کہ "ایڈیٹر شاہجہاں کی طویل علالت اور ان کی زندگی سے قطعی مایوسی کے بعد مجبوراً "شاہجہاں" کی ادارت مَیں سنبھال رہا ہوں" رسالہ اپنی ادارت میں شائع کرنا شروع کردیا، مگر دو رسالوں کا کام وہ نہ سنبھال سکے اور کچھ عرصے بعد "شاہجہاں" بند کردیا۔ پھر اسی رسالے کو وصی صاحب مالک "کتب خانہ" نے اپنی ادارت میں شائع کیا۔ (آخیر زمانے میں یہ کُتب خانہ ادارۂ ساقی کی مستقل بیٹھک تھا) دو سال بعد اُنھوں نے بھی بند کردیا۔ تیسری مرتبہ شاہجہان ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنّفین کی انجمن دہلی کے تحت نکلا۔ اسی نام سے بار بار نکالنے میں آسانی تھی کہ بجائے نیا ڈیکلریشن لینے کے، جو مشکل سے ملتا تھا، ایک درخواست پر دوبارہ نکالنے کی اجازت مِل جاتی تھی۔ اس کا پرنٹر پبلشر آخیر تک میں ہی رہا۔

۱۹۳۵ء میں مَیں نے نثر چھوڑ کر نظم لکھنی شروع کردی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں مَیں بحیثیت شاعر (خمار دہلوی)، ترقّی پسند مصنّفین کی انجمن کا باقاعدہ ممبر تھا اور اس کے اجلاسوں میں متعدّد نظمیں بھی پڑھیں جو شاہجہان میں شائع ہوئیں اور یہ پرچے اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ اس اظہار کی ضرورت یہاں یوں پیش آئی کہ ساقی کے جوبلی نمبر میں صادقُ الخیری صاحب (جو ۱۹۳۰ء میں نئے نئے کالج میں داخل ہوئے تھے ——— اور

ساقی کے دفتر کبھی کبھی محض شاہد صاحب کے عزیز کی حیثیت سے آتے تھے اور فضل حق قریشی نے حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہُوئے میرے متعلق یوں گل افشانی کی ہے کہ ایک صاحب "سیّد ولایت حُسین صاحب بھی تھے جنہیں ادب سے کوئی لگاؤ نہ تھا محض شاہد کے دوست تھے اور بعد میں ایک درگاہ کے سجّادہ نشین ہو کر چلے گئے تھے": ساقی، شاہجہاں، کامران، روشنی، شباب، شمع، فلم آرٹ، تصویر اور دیگر رسائل میں جو میرے مضامین اور ڈرامے شائع ہُوئے اگر ان کی نقلیں میرے پاس موجود ہوتیں، تو آج دو چار کتابوں کا مصنّف اور مالک میں بھی ہوتا۔ جن رسائل میں میرا کلام شائع ہوتا رہا، میرے پاس تو ان کی بھی کوئی کاپی نہیں ہے۔ شہرت پسندی نہ مجھے اُس وقت پسند تھی اور نہ اب ہے۔

اپنی صحّت کی بحالی کے بعد جس کی اُمّید کم تھی، میں نے شاہد ہی کی معیّت میں "کامران" نکالا۔ یہ رسالہ اس سے پہلے فضل حق قریشی صاحب، شاہد کی معیّت میں نکال کر اپنی دفتری مصروفیات کی بنا پر بند کر چکے تھے۔ اس کی اشاعت کا مقصد مذہب اسلام کو نام نہاد مُلّاؤں کے پنجے سے چھٹکارا دلانا تھا جنھوں نے اپنے حلوے مانڈے کی خاطر مذہب کو ہَوّا بنا رکھا تھا اور مسلمان اپنے دین سے بے زار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مولویوں نے اس کی زور و شور سے مخالفت کی۔ ہمارے خلاف جامع مسجد میں جلسے ہُوئے اور پریڈ گراؤنڈ میں منعقدہ سیرت النبیؐ کے ایک عظیم الشّان جلسے میں نوجوان دیوبندی طالب علموں کو ہمارے قتل کی ترغیب دی۔ وہ ہمارا تو کچھ نہ بگاڑ سکے، مگر ہمارے ایک مقالہ نگار تاریخ اسلام کے مشہور مؤرخ اسلم جیراجپوری کو چند غنڈوں نے قرولباغ میں سخت زدوکوب کیا۔ اُدھر جودھپور میں عظیم بیگ کی ٹانگ توڑ دی اور ہماری جانوں کے درپے ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد میری شادی ہو گئی اور دیگر مصروفیات کی بنا پر "کامران"

بند کرنا پڑا۔

جب تک میں ساقی میں کام کرتا رہا، میں نے شاہد صاحب سے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ ۱۹۳۷ء میں شادی کے بعد جب میرے آنے جانے میں کمی ہوئی اور کام میں تعطّل پیدا ہونے لگا، تو شاہد صاحب نے باقاعدہ ملشی رکھنے کا ارادہ کیا۔ اُس وقت فضلِ حق قریشی صاحب نے مُجھ سے کہا کہ میں شاہد سے کہوں کہ وہ مجُھے ملازم رکھ لیں، مگر میں نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ اُس وقت تک میرے اور شاہد کے برابری کے تعلقات رہے تھے۔ میں اُن کے ایک پیسے کا شرمندہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ میرا کھانا بھی میرے گھر سے آتا تھا۔ میری والدہ اپنے والد خان بہادر میر ناصر علی مُدیر "صلائے عام" کی خدمت کی غرض سے عام طور پر فراش خانے میں رہتی تھیں۔ فراش خانہ اور کھاری باؤلی گھر آنگن سمجھ لیجیے۔ تیسرے پہر شاہد محلّہ بناریاں سے کچھ آگے ایک لڑکی کو ہارمونیم سکھانے جاتے تھے۔ فراش خانہ راستے میں پڑتا تھا، اس لیے واپسی پر شام کی چائے روزانہ میرے ساتھ پیتے۔ اِس کے علاوہ بھی اکثر رات کو میرے یہاں موسیقی کی بے تکلف محفلیں جمتیں۔ ماہِ رمضان میں شاہد صاحب کے گھر کا ہر شخص روزہ رکھنے کا عادی تھا اور جو نہ رکھتا وہ بھوکا مرتا۔ وجہ یہ تھی کہ شاہد صاحب کا پُورا خاندان تمام بھائی بہن ایک ہی جگہ رہتے تھے اور سب کا کھانا اُن کی والدہ کی نگرانی میں ایک ہی جگہ پکتا تھا اور تمام رمضان دن میں چولھا جلنا ممکن نہ تھا؛ لہٰذا روزے خور مارے جاتے۔ شروع شروع تو ہم سب روزے رکھتے تھے، مگر بعد میں روزے کھانے شروع کر دیے۔ میں اپنی والدہ کا چہیتا تھا۔ میں روزہ نہ رکھتا تو والدہ میرے لیے کھانا پکا دیتیں۔ شاہد صاحب روزہ نہ رکھتے، تو میرے ہاں آجاتے اور پھر تو رفتہ رفتہ روزہ خوری اور میرے ہاں مہمانداری چائے ہو یا کھانا معمول بن گیا۔ گو میرے گھر بھی اللہ کا دیا سب کُچھ تھا اور مجھے کِسی ملازمت کی ضرورت

نہ تھی، مگر اپنی پسند کی شادی کے بعد میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ ماں باپ کے ٹکڑوں پر پڑا رہوں؛ چنانچہ میں نے لینگوج ٹیچر یعنی انگریزوں کو اُردو پڑھانے کا کام شروع کردیا اور لینڈھور لکھنو لینگوج اسکول کا باقاعدہ ممبر بن گیا۔ اس سلسلے میں مجھے موسمِ گرما میں چھ مہینے کے لیے لینڈھور لینگوج اسکول مسوری جانا پڑتا اور یہی وجہ پھر میری ساقی سے بالکل علیٰحدگی کی ہوئی، مگر شاہد سے دوستی بدستور ویسے ہی قائم رہی۔ تقسیم ہند کے بعد میرا اور شاہد کا ارادہ دلّی چھوڑنے کا نہ تھا۔ شاہد اب کھاری باؤلی چھوڑ کے اپنے حویلی اعظم خاں والے مکان میں رہ رہے تھے۔ میں ہنگاموں میں بھی دُوسرے تیسرے شاہد بھائی کے پاس پہنچتا رہا، مگر ایک دن جو میں پہنچا، تو معلوم ہُوا شاہد تو پاکستان چلے گئے۔ کچھ دن بعد لاہور سے شاہد صاحب کا خط پہنچا کہ دلّی اب رہنے کے لائق نہیں رہی، تم کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچو؛ چنانچہ شاہد صاحب کے بار بار کے تقاضوں پر میں نومبر ۱۹۴۷ء میں دِلّی سے بمبئی ہوتا ہُوا پانی کے جہاز سے کراچی پہنچا۔ شاہد بھائی کو اطلاع دی۔ اُنہوں نے مجھے لاہور آنے پر مجبُور کیا اور جب میں لاہور پہنچا، تو وہ چند ماہ بعد کراچی چلے گئے۔ پاکستان آنے کے بعد گو اب ہم میں ہزاروں میل کی دُوری کا فاصلہ تھا، مگر مرتے دَم تک میری اُن کی دوستی اور خط وکتابت جاری رہی۔ شاہد جب دُوسرے تیسرے سال راولپنڈی آتے، خط پہنچتا میں فلاں گاڑی سے آرہا ہوں، اسٹیشن پہنچو۔ اور پھر اِس وقت سے اُس وقت تک کہ وہ کراچی جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھتے، مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ اِس دوران گانے کی ایک محفل بھی میرے یہاں ضرور ہوتی جس میں مقامی فنکار اور خصوصاً شاہد گاتے۔ شاہد صاحب ہمہ گیر شہرت کے مالک تھے۔ اُنہوں نے اتنی اَدبی اور موسیقی کی انجمنوں کی صدارت کی اور سیکرٹری رہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ ضعیفی، خرابیٔ صحت اور گوشہ گیری کے باوجود لوگ انہیں نہیں چھوڑتے تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو

ادب و موسیقی کا ادنیٰ خادم کہتے اور سمجھتے تھے۔ شاہد صاحب کراچی علاقائی گلڈ اور انجمن ادبی رسائل پاکستان کے سیکرٹری تھے۔ ۱۹۵۸ء میں "سیٹو" کی طرف سے تھائی لینڈ اور فلپائن میں پاکستانی ادب و موسیقی پر لیکچر دینے کے لیے اُن کا انتخاب عمل میں آیا اور ۱۹۶۳ء میں "افتخارِ ادب" کے اعزاز سے نوازے گئے۔ شاہد صاحب نے فنِ موسیقی اور ادب پر متعدد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ کراچی میں اُن کا اپنا کتاب خانہ بھی ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ اُن کی اپنی اولاد میں کوئی ایسا نہیں جو ان کا کاروبار سنبھالے اَور ان کا نام روشن رکھے۔ اُن کے بڑے لڑکے مشہود احمد ریڈیو پاکستان کراچی میں اناؤنسر ہیں۔ اُنہیں پیٹ کے دھندے نہیں چھوڑتے کہ وہ اِس طرف توجّہ دیں۔ اِن سے چھوٹے مسعود احمد اور محمود احمد دونوں کینیڈا میں ہیں۔ "عاصمہ شاہد" شمس زبیری کے تعاون سے ساقی شائع کر رہی ہیں، مگر سُنا ہے کہ کچھ لوگ شمس زبیری کے دَرپے ہیں اور اپنے مفاد کی خاطر خود سامنے آنا چاہتے ہیں۔ غرض اندرونی طور پر کشمکش جاری ہے اور یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔

شاہد صاحب پر قلم اُٹھانے کے بعد میرے لیے قلم کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہزار ہا واقعات ہیں اور ہر واقعہ اپنی جگہ اہم، دلچسپ اور قابلِ تحریر ہے۔ سوچتا ہوں کِسے چھوڑوں کِسے لکھوں۔ جی چاہتا تھا کہ اُن چند نام نہاد ادیبوں کی نقاب کشائی کرتا چلوں جو ایک عرصے تک خود بیوقوف بننے کے بعد دُوسروں کو بیوقوف بنانے کی داستانیں گھڑ رہے ہیں اور کچھ جنہیں خود اُس وقت ناک پُونچھنے کی تمیز نہ تھی، دُوسروں کو بَدذوق لکھ کر اپنے آپ کو ادیبِ شہیر، شاہد کا ہمسر اَور دوست ثابت کرنے کی کوشش میں منہمک ہیں، مگر اس میں نہ کوئی میرا مفاد وابستہ ہے اور نہ میرا اخلاق اس کی اجازت دیتا ہے۔

گانا اور عورت شاہد کی کمزوری تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی عیش پرستی کی خاطر

شاہد نے اپنی مرحومہ بیگم کو سوکن کا دُکھ نہیں دیا اور نہ اپنے کردار پر حرف آنے دیا، مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی بیگم کو اُن کے معاشقوں کا علم نہ تھا۔ اُن کو تمام حالات کا بخوبی علم تھا اسی لیے اُن کی گھریلو زندگی پُرسکون نہ تھی اور وہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر دوستوں میں گزارتے۔ اُن کی بیگم کی بائیں چھاتی میں ناسُور ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے نہ صرف وہ اپنی کشش کھو بیٹھی تھیں، بلکہ اُن کی صحّت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اپنے اس مرض کی وجہ سے وہ حد درجہ چڑچڑی اور بدمزاج ہو گئی تھیں۔ شاہد صاحب نے اُن کی صحّت یابی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، مگر مرتے دم تک ان کو اس مرض سے چھٹکارا نہ ملا۔ ناسُور میں ربڑ کی نلکی پڑی رہتی اور اُس سے پیپ خارج ہوتی رہتی۔ شاہد صاحب خود روزانہ پٹّی کرتے۔ اگر کسی دن کسی وجہ سے پٹّی نہ کر پاتے تو اس قدر بدبُو ہو جاتی کہ اُن کے پاس بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔ اِن حالات میں شاہد کی توجّہ دُوسری خواتین کی طرف منعطف ہونا فطری امر تھا۔

کثرتِ ازدواج کا تو "مولوی" ہونے کی حیثیت سے اُن کے ہاں عام رواج تھا۔ خود ان کے ابّا جان مرحوم نے شرع کے مطابق چار شادیاں فرمائی تھیں۔ ہاں تو ذکر ڈپٹی بشیر احمد کا نہیں شاہد کا ہو رہا تھا۔ شاہد مرحوم اپنی "جسمانی کمزوریوں" اور ڈرپوک فطرت کی وجہ سے کُھل کے دادِ عیش تو نہ دے سکے مگر ع

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی۔

اور یہ شغل اس قدر بڑھا کہ جب دلّی میں پتّھر والے سینما کے برابر والے میدان میں (یہ میدان لال قلعہ کے دروازے کے سامنے تھا اب تو وہاں بہت بڑی مارکیٹ ہے) یا شاہ جی کے تلاؤ (تالاب) پر۔ (یہ میدان اجمیری دروازے کے باہر ترکمان دروازے سے ہوتا ہوا شاہی فصیل کے ساتھ ساتھ دلّی دروازے تک چلا گیا تھا۔ اب نہ فصیل ہے

نہ یہ میدان ۔ بھارتی حکومت نے شہر پناہ کی فصیل تڑوا کر وہاں عالیشان عمارتیں تعمیر کرادی ہیں) نمائش لگتی جو دو دو تین تین مہینے جاری رہتی۔ شاہد صاحب روزانہ دوستوں کے ساتھ شام سات بجے نمائش میں جاتے اور رات بارہ بجے تک نمائش میں گھومتے، جہاں کوئی شوخ، چنچل دوشیزہ اکیلی دوکیلی نظر آتی یہ دوستوں میں سے کسی کو بڑھا چڑھا کر کہ اس کام میں اِن کو خاص مہارت تھی، اُس کے پیچھے لگا دیتے اور اپنی تفریح یا ذہنی عیش پرستی کا سامان مُہیّا کر لیتے۔

ایک دفعہ جب کہ میں بہت بیمار تھا، شاہ جی کے تلاؤ پر نمائش لگی۔ یہ حسبِ عادت دیگر دوستوں کے ہمراہ نمائش میں پہنچنے شروع ہُوئے۔ اس دفعہ دلّی کے کسی بڑے کاغذی نے نمائش میں اسٹیشنری کی دُکان کھولی تھی۔ اس دُکان پر مرد سیلزمینوں کے علاوہ ایک کافر دوشیزہ بھی، جس کی اُٹھتی جوانی اور حُسن کی تمام نمائش میں دھوم تھی، سیلز گرل تھی۔ یہ مالک دُکان کی لڑکی تھی۔ اس پر جب شاہد پارٹی کی نظر پڑی تو مع شاہد سب مر مٹے۔ یہ سب کے سب روزانہ دُکان پر پہنچتے۔ مختلف چیزوں کے بھاؤ تاؤ کرتے، دُور ہی دُور سے آنکھیں سینکتے اور چلے آتے۔ دو چار دن تو دُکان والے کچھ سمجھے نہیں یا سمجھے تو جھگڑے کے خیال سے بولے نہیں، مگر تاڑ گئے۔ ایک دن جب یہ دُکان پر پہنچے اور آپس میں ایک دوسرے پر رکھ کر فقرے کسنے شروع کیے، تو دُکاندار نے تنگ آ کر انہیں دھتا بتائی مطلب یہ کہ میاں جی جاؤ اپنا کام کرو، ہم بھی سمجھتے ہیں تمہیں۔ فضلِ حق قریشی کہ انتہائی جذباتی اور غصّیلی طبیعت کے مالک ہیں، اس توہین کو برداشت نہ کر سکے اور کارکنانِ دُکان سے اُلجھ پڑے۔ خوب تُو تُو مَیں مَیں ہُوئی۔ جب جھگڑا زیادہ بڑھ گیا اور ہندو مُسلم فساد تک نوبت پہنچی تو کارکنانِ نمائش نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ یہ تمام داستان دُوسرے دن شاہد صاحب نے صرف مجھے سنائی، بلکہ شام کو مجھے بھی لے کر نمائش

میں پہنچے اور اُس تقوے شکن بُتِ کافر کے درشن بھی کرائے۔ پارٹی کی نیّت آج بھی اچھّی نہ تھی، یعنی یہ کہ میری معیّت میں (میں شاہد پارٹی میں انتہائی دلیر، نڈر اور جانباز مشہور تھا) جھگڑا کرنا چاہتے تھے، مگر میری علالت کے پیشِ نظر خاموشی اختیار کی گئی۔

شدّو بھائی گانے کی کسی محفل میں اُسی وقت جانے کی ہامی بھرتے جب اُنہیں یہ یقین ہو جائے کہ سُننے والے صرف مَرد ہی نہیں، پَردے کے پیچھے کچھ حسین کان بھی ہیں اور جب محفل میں پَردے کے پیچھے سے حسین کان اور شربتی آنکھیں جھانکتی نظر آجاتیں، تو پھر ایسے لہک لہک کے گاتے کہ ساری محفل پھڑک اُٹھتی اور یہ محفل پر چھا جاتے۔ نہ جانے اپنے سُریلے انداز کی وجہ سے کتنے دھڑکتے نوجوان دلوں کے "ہیرو" بن جاتے۔ اب یہ بات الگ تھی کہ ان دھڑکتے دل والیوں سے کبھی کبھی "فائدہ" شاہد نہیں دُوسرے دوست اُٹھاتے تھے یا کبھی کبھی شاہد صاحب اپنے گانے کے ایک ساتھی کو "جو ماشاءاللہ اچھے خاصے بدصورت اور چھ سات بچّوں کے باپ تھے"، زبردستی کسی کا "منظورِ نظر" بنا دیتے۔ یہ بے چارے آئندہ ان کے ہاں گانے کی محفل میں نیا سُوٹ پہن کر، عطر کی پُوری شیشی اُوپر اُلٹ کے جاتے کہ آواز کے ساتھ ساتھ نادیدہ محبوب تک اُن کے بے ڈول اور بھدّے جسم کی لپٹیں بھی پہنچتی رہیں۔ ان بے چاروں کے سامنے کے دو دانت بڑے اور باہر نکلے ہُوئے تھے اور دونوں دانتوں کے درمیان جھری تھی۔ جب یہ تصوّرِ محبوب میں لہک لہک کر گاتے تو شدّو بھائی مجھے اشارہ کرتے اور میں بیڑی سُلگا کر اُن کے دانتوں کے درمیان جھری میں پھنسا دیتا تاکہ یہ بیڑی بھی پیتے رہیں اور گاتے بھی رہیں اور اہلِ محفل ان کے گانے کے ساتھ ساتھ اُن کی اس ہیئت کذائی سے بھی محفوظ ہوتے رہیں۔ غرض یہ کہ شدّو بھائی عجیب شغُوفہ قسم کے انسان تھے۔ دُوسروں پر پھبتیاں کسنا، بیوقوف بنانا، دو دوستوں کی "چونچیں" کرانا، مطلب یہ

کہ لڑا کر تماشا دیکھنا اُن کے پسندیدہ اور دلچسپ مشغلے تھے، مگر شاہد میں ایک کمزوری تھی بھی۔ جہاں دُوسروں پر چوٹ کر کے خوش ہوتے، وہاں وہ اپنے پر چوٹ برداشت نہ کر پاتے۔ کھسیانے ہو جاتے۔ وہ ہمیشہ ایسے لوگوں سے خائف رہتے، بلکہ اُن سے کتراتے جو بے دھڑک اُن پر چوٹ کر جاتے۔ قریبی دوستوں میں سب اُن کا احترام کرتے اور آپس میں پھبتیاں کستے وقت اُن کو ہمیشہ نظر انداز کر جاتے۔

گانے میں محفل میں بیٹھے ہُوئے یہاں تک کہ گاتے ہُوئے بھی اُن کی نظریں ہمیشہ نیچی رہتیں، مگر گھر واپس پہنچ کر جب وہ محفل اور خاص طور پر پردے کی آڑ سے جھانکنے والیوں کی نقشہ کشی کرتے تو میں حیران رہ جاتا کہ وہ کب اور کیسے یہ سب کُچھ دیکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم سب سے زیادہ مدبّر، شریف اور شرمیلے نظر آتے ہُوئے بھی ہم سب سے زیادہ نظر باز اور دل پھینک تھے۔ ہماری کُھلی آنکھیں ہماری نظروں کی چوری پکڑوا دیتیں، مگر عینک کے رنگین تالوں کے پیچھے چھُپی اُن کی دُزدیدہ نظروں کا راز ہمیشہ راز ہی رہتا۔ گانے کے علاوہ بھی شاہد اپنی ہمہ گیر شخصیت، شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور شرمیلی فطرت کی وجہ سے اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیتے۔ ہر شخص اُن کا مدّاح نظر آتا۔

موسیقی کی محفلوں میں مَیں نے بسا اوقات دیکھا ہے کہ اچھّے خاصے معقول پیشہ ور اور عطائی گانے والے ذرا ذرا سی بات پر سازندوں سے اُلجھ کر اہلِ محفل پر اپنا رعب گانٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ طبلچی سے تو خاص طور پر گانے والوں کی ضرور نوک جھونک چلتی ہے، مگر نّنّدو بھائی کو میں نے پُوری زندگی کسی سازندے سے اُلجھتے نہیں دیکھا۔ وہ دُوسرے کی غلطی کو بھی خوش طبعی سے یہ کہتے ہُوئے "خانصاحب میں ہی بے تالا ہو گیا تھا" بات ختم کر دیتے، حالانکہ یہ "سُر" اور "لے" کے بہت

پکّے تھے اَور ان کی اس خوبی کو بڑے بڑے گوّیے بھی سراہتے۔ یہ نہ محفل میں تقدیم اور تاخیر پر بُرا مانتے اور نہ گانے کی فرمائش پر نخرے کرتے۔ غریب سے غریب یہاں تک کہ دھوبی، سقّوں کے ہاں بھی جانے میں اُنہیں عار نہ تھا۔ اگر کسی کے گھر ساز نہ ہوتے، جیسا کہ عام طور سے نہیں ہوتے تھے، تو خود اپنے ساز ساتھ لے جاتے۔ اُن کے پاس تانپورہ، ہارمونیم، ستار، طبلہ سبھی ضروری ساز تھے۔ جیسا خوبصورت ہارمونیم بجاتے، اسی طرح طبلہ بھی بہت اچھا بجاتے تھے۔ عام طور سے طبلہ بجانے والوں کا سَر اور کندھے ضرور اُچکتے ہیں، مگر شاہد جب طبلہ بجاتے تو نہ اُن کا سر ملتا اور نہ کندھے اُچکتے۔ اُن کی اس خوبی کے سبھی قائل تھے۔ اصغر، جنہیں ہم سب "داتا" کہتے تھے، اِن کے ساتھ طبلے پر سنگت کرتے۔ یہ ان ہی کے شاگرد تھے۔ اُن کی تعلیمی مصروفیات کے پیشِ نظر مَیں نے اور انصار ناصری نے شدّو سے طبلہ سیکھا۔ شدّو بھائی کو گھر پر ریاض کرنے اور گھر ہی پر محفلیں جمانے کے لیے طبلے پر سنگتی کی ضرورت ہوتی۔ اِس ضرورت کو اُنہوں نے ہمیں طبلہ سکھا کر پُورا کر لیا۔ یہاں مجھے ایک دل چسپ اور پُر لطف قِصّہ یاد آیا۔

یہ واقعہ ۱۹۳۰ء کا ہے۔ ساقی کو جاری ہُوئے ابھی دو چار ماہ ہُوئے تھے۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ساقی کا دفتر کھاری باؤلی۔ گلی تباشاں کوچہ نواب مرزا میں تھا۔ اس مُحلّے میں ساقی کے دفتر کے برابر ایک صاحب بڑے خوش مزاج اور "ظریف الطبع" رہتے تھے۔ ساقی کے دفتر اور ان کے گھر کے درمیان بیچ کی منزل میں ایک کھڑکی بھی تھی۔ ان صاحب کے گھر لڑکیوں کی کھان تھی اور ماشاءاللہ شکل وصورت کے سِوا سب ذہین، خوش طبع اور صاحبِ ذوق تھیں۔ خاص طور پر سب سے بڑی۔ اِن کا نام الف۔ بے دال۔ جیم کچھ بھی سمجھ لیجیے۔ چلیے "جیم" سہی۔ داتا جن کا ذکر میں ابھی اُوپر کر چکا ہوں، ان

کے کچھ عزیز تھے اور روزانہ ان کے گھر بے روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ آگ اور پھونس کا ازل سے بیر چلا آتا ہے۔ ہوا یہ کہ داتا "جیم" کی آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ یہ روزانہ اسکول سے فارغ ہو کر ساقی کے دفتر میں آ بیٹھتے اور رات گئے واپس جاتے، مگر ہم لوگوں نے اکثر محسوس کیا کہ تین چار بجے کے لگ بھگ یہ اچانک غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد جب واپس آتے ہیں تو بڑے گھبرائے سٹپٹائے سے۔ پوچھا جاتا: "کہاں چلے گئے تھے؟" جواب ملتا: "رفع حاجت کو"، مگر یہ اچانک "حاجت" اپنی کچھ سمجھ میں نہیں آئی اور پھر اکثر جانے سے پہلے کبھی کھڑے ہو جاتے، کبھی ٹہلتے، کبھی کمرے سے باہر چھت پر دھوپ میں نکل جاتے، حالانکہ بہت سخت گرمی تھی۔ کبھی چھت پر سے دوسری طرف گھر میں جھانکتے معلوم ہوتے۔ پھر آ بیٹھتے، پھر آنکھ بچا کر غائب ہو جاتے۔ میں اُن کی اِس بے چینی کا راز پاتے ہوئے کھٹک گیا اور آخر ایک دن جیسے ہی وہ غائب ہوئے، میں دوسری منزل میں اُس کھڑکی پر پہنچا جو ساقی کے دفتر اور "جیم" کے گھر کو ملاتی تھی۔ کواڑ کی درز سے دوسری طرف جھانکا تو حُسن کو عشق کی آغوش میں گم پایا۔ میں اُلٹے پاؤں واپس آ کر شدّو کو لے گیا۔ شدّو "جیم" کو "داتا کی آغوش میں دیکھ کر آتشِ رقابت سے جل مرے۔ بدگمان تو کچھ پہلے ہی سے تھے، مگر عدم ثبوت کی بنا پر کچھ کہہ نہ پاتے تھے۔ اُس وقت تک میری اور شدّو کی دوستی میں ایک احترام، ایک حجاب تھا، حالانکہ ہم دونوں ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ ہماری کُھسر پُھسر سے ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے غائب ہو گئے۔ خیال تھا کہ داتا کچھ دیر بعد حسبِ معمول واپس آ جائیں گے، مگر وہ نہیں آئے۔ آخر رات کو شدّو خود جا کر اُنہیں وہاں سے واپس لائے۔ بیچارے داتا کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بلّی کے مُنہ میں کبوتر۔ اِس سے پہلے کہ ہم اُن سے پُوچھیں، انہوں نے گھگھیا کے خود ہی ساری داستان سنا دی۔ دُوسرے دن اُن سے

وہ خط وصول کیے گئے جو "جیم" نے اُنہیں لکھے تھے۔ آپ کہیں گے کہ شاہد کو اس سے کیوں دلچسپی تھی؟ بات یہ تھی کہ داتا سے پہلے "جیم" شاہد میں دلچسپی لیتی رہیں۔ معاملہ محلّے کا تھا، شاہد گھائل تو تھے، مگر بخوف رسوائی محبت کا جواب محبت سے نہ دے سکے۔ جوانی دیوانی مشہور ہے اور جب یہ جذبہ بیدار ہو جائے تو اس پر قابو پانا ممکن نہیں ہوتا۔ غرض یہ کہ "جیم" "شدّو" سے مایوس ہو کر داتا میں دلچسپی لینے لگیں کہ گندم میسّر نہ آئے، تو بھُس غنیمت ہے اور ادھر شاہد سب کچھ سمجھتے رہے اور جلتے رہے۔ شاہد بھائی نے اپنی داستانِ عشق مجھے اِس انکشاف کے بعد سنائی۔ اِس واقعے کے بعد میری اُن کی دوستی میں جو حجاب حائل تھا وہ حجاب اُٹھ گیا اور ہم یک جان و دو قالب ہو کر رہ گئے۔

شدّو بھائی آگے بڑھنا بھی چاہتے تھے اور ڈر بھی رہے تھے کہ زخمی ناگن پلٹ کر ڈس نہ لے، اور ایک دم ہوا بھی یہی۔ شاہد کے اس خط کے جواب میں کہ "اُن کے وہ خطوط جو اُنہوں نے "داتا" کو لکھے اب ہمارے قبضے میں ہیں اور وہ بھی ہمیں داتا کے تمام خط واپس کر دیں" اُنہوں نے پلٹ کر پھن مارا۔ صاحبزادی ہم سے زیادہ تجربہ کار اور دلیر نکلیں۔ ویسے وہ ادیب بھی اچھی تھیں۔ داتا کو تو دُوسرے دن اُنہوں نے یہ کہہ کر دھتا بتائی کہ "میں تُم جیسے نادان، ڈرپوک بچّے سے محبت نہیں کر سکتی" اور شاہد کو ایک طویل اخلاقی خط لکھا کہ "آپ کو، کہ آپ شادی شُدہ اور تین چار بچّوں کے باپ ہیں ایک دوشیزہ کو اس قسم کا خط لِکھنے کا حق نہیں پہنچتا، نیز یہ کہ ایک ادبی و اخلاقی جریدے کے مُدیر ہُوتے ہُوئے ایک معصوم دوشیزہ پر تہمت تراشی کرتے ہُوئے شرم نہیں آتی؟ ہے شرط کہ آپ کا یہ خط آپ کی بیگم صاحبہ کو بھیج دوں؟ مجھے معلوم ہے کہ یہ سب کچھ آپ نہیں آپ کی آڑ میں کوئی اور کر رہا ہے، مگر آپ ایسے دروغ گو لوگوں کو کیوں اپنے پاس گھُسائے رکھتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ (جیم" مجھ سے بے حد خائف تھیں کیوں ؟ — یہ

بیں یہاں بتانے سے مجبور ہوں) خط پڑھ کر شاہد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، مگر ہیں نے ہمّت بندھا کر اس خط کے جواب میں ایک اور خط لکھوایا جس میں مذہب، اخلاق اور خاندانی اقدار کی آڑ میں اُن کی معصومیت اور دوشیزگی پر سخت تنقید کی تھی، مگر عورت پھر عورت ہے۔ جب "جیم" نے دیکھا کہ یہ دبنے والے نہیں، تو شاہد کو یہ خط لکھ کر ہتھیار ڈال دیے کہ "آپ نے چونکہ میری محبت کو ٹھکرا دیا تھا اس لیے میں دانا کو فرضی محبّت کے خط لکھ کر آپ سے انتقام لے رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دانا آپ کے دوست ہیں وہ ضرور اپنی اس محبت کا آپ سے ذکر کریں گے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ میں تو آپ کو اپنا سمجھ چکی ہوں۔" یہ "جیم وہ تھیں جن کے کردار کی دُور دُور دھاک تھی اور خاندان کے لڑکے ان سے کنی کاٹتے تھے۔ اُنہوں نے تقریباً درجن تو معاشقے لڑائے ہوں گے۔ ویسے شدّو کا یہ چوتھا معاشقہ تھا اور چاروں ایک ساتھ چل رہے تھے۔

سیّد انصار علی ناصری کے والد سیّد انتصار علی مرحوم میرے حقیقی ماموں نمک کے محکمے میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور آگرے میں تعینات ——— انصار ناصری نے شاہد کو خاندان سمیت آگرے کی سیر کی دعوت دی۔ آگرے سے واپسی پر دلّی ریلوے اسٹیشن سے گھر آنے کے لیے تانگے کیے گئے کہ اُس وقت یہی ایک سواری میسّر آتی تھی۔ ایک تانگے میں سب مرد اور ایک میں خواتین بیٹھ گئیں۔ قُلی نے ہارمونیم اور طبلے وغیرہ عورتوں کے تانگے میں رکھ دیے۔ جب تانگے کٹڑہ بڑیاں پہنچے، تو تانگے والے نے خواتین سے کہا: "بائی جی، کون سے کوٹھے پر اُتاروں؟" یہ سُن کر عورتیں شرمندہ ہو گئیں، مگر تانگہ بان بے قصور تھا، کیونکہ کٹڑہ بڑیاں میں کوٹھوں پر "خانگیاں" رہتی تھیں۔ ان کے ساتھ ساز دیکھ کر اُسے مغالطہ ہو گیا۔

اپنے گھر سے دوسروں کے گھر ساز اُٹھا کر لے جانے میں شاہد کے ساتھ اکثر اس قسم کے واقعات پیش آتے، مگر شاہد ان سے خائف ہوتے نہ دوسروں کو ساز دینے میں بُخل سے کام لیتے۔ وہ دُوسروں کے کہنے سُننے کی کبھی پروا نہیں کرتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ دُنیا تو ہمیشہ سے بکتی چلی آئی ہے اور بکتی چلی جائے گی۔ اِسے بکنے دو اور اپنے کام سے کام رکھو۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے "ساقی" کا دفتر کسی بڑی شاہراہ پر کرّوفر سے قائم نہیں کیا۔ وہ کہتے جسے اَدب سے لگاؤ ہو گا، جس کے دل میں میری اہمیّت و عزّت ہو گی، وہ یہاں آکر مجھ سے ملنے میں سُبکی محسوس کرے گا اور نہ بے کیفی۔ شاہد نمود و نمائش سے حد درجہ نفرت کرتے تھے۔ وہ خود سادہ لباس، سادہ مزاج آدمی تھے اور ایسے ہی انسانوں سے مل کر خوش ہوتے۔ بڑے لوگوں اور نئے آدمیوں سے ملتے ہُوئے گھبراتے۔

ایک دن مَیں اور شنّو فراش خانے سے ٹرام میں بیٹھ کر جامع مسجد پہنچے۔ ہمیں اُردو بازار میں "کُتب خانہ" جانا تھا کہ یہاں روزانہ شام کو ادارہ ساقی کا پھڑ جمتا تھا۔ ٹرام سے اُترے ہی تھے کہ کسی نے شاہد کو بتایا، بے انتہا پان کھانے والا مجنوں صفت باؤلا سا ایک شخص جس نے اپنے گلے میں ازار بند لٹکا رکھا ہے اور بار بار اس میں اپنے ہاتھ پھنساتا ہے، کُتب خانے پر آپ کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ شاہد یہ سُن کر گھبرا گئے اور بجائے کُتب خانے کے حافظ کے ہوٹل میں جا بیٹھے۔ یہ ہوٹل اچھی چاء کے لیے بہت مشہور تھا۔ دُوسرے یہ کہ یہاں اُستاد جلال الدین حیدر دہلوی اپنے تلامذہ کو لے کر بیٹھا کرتے تھے۔ "ساقی" کے پہلے دَور میں استاد حیدر دہلوی کا کلام "بادۂ الست" کے عنوان سے بڑے کرّوفر سے شائع ہوتا تھا۔ کسی زمانے میں مَیں بھی اُن کا شاگرد تھا اور یہ شاگردی بھی شاہد بھائی کے ایما پر ہُوئی تھی۔ کچھ عرصے بعد میں قاآنیٔ ہند حضرت حکیم آزاد

انصاری سہارنپوری کے تلامذہ میں شامل ہو گیا۔ آزاد صاحب حضرت جوش ملیح آبادی کے خاص دوستوں میں تھے اور اُس زمانے میں اُن کے ساتھ ہی قرولباغ، دلی میں رہائش پذیر تھے۔ محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی بھی آزاد مرحوم ہی سے اصلاح لیتی تھیں۔ ہاں، تو ہم دونوں وہاں بیٹھے استاد حیدر دہلوی کا کلام سن رہے تھے کہ اچانک "اخاہ! خمار دہلوی ہیں" کہہ کر کوئی صاحب مجھ سے لپٹ گئے۔ یہ بہزاد لکھنوی تھے اور یہی کُتب خانے پر شاہد کے منتظر۔ شاہد ان ہی سے چھپے یہاں بیٹھے تھے۔ میں بہزاد صاحب سے "مسوری" اور علیگڑھ کے مشاعروں میں مِل چکا تھا۔ میں نے شاہد سے بہزاد کا تعارف کرایا۔ قہرِ درویش بجانِ درویش شاہد، بہزاد سے ملے اور اپنے ساتھ کُتب خانہ لے گئے۔ اور پھر یہ شاہد ہی تھے جنھوں نے بہزاد صاحب کے کئی مجموعے شائع کیے۔ اِن واقعات سے شاہد صاحب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

جہاں شاہد بھائی میں سینکڑوں خوبیاں تھیں، وہاں بحیثیت انسان کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ وہ پرلے درجے کے احسان فراموش بھی تھے۔ وہ کسی سے کام لینا اپنا حق سمجھتے تھے۔ دُوسرے کا احسان بہت جلد بھول جاتے۔ اپنے سِوا دوسروں کو ہمیشہ احمق سمجھتے تھے۔ مُنہ پر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت تو نہ تھی، ہاں پیٹھ پیچھے اُس کے عیوب بیان کرتے۔ آج اِس کی بُرائی کر رہے ہیں، تو کل اُس کی اِس سے اور یُوں ایک دُوسرے کو آپس میں بدظن کر کے خود "اچھے" رہتے۔ ہر شخص اپنی جگہ شاہد کو اپنا بہترین دوست اور رازدار سمجھتا، اور یہ میں جانتا ہوں کہ وہ اِس طرح دُوسروں کو محض بیوقوف بنانے کے لیے دوست بنائے رکھتے تھے، ورنہ وہ کسی سے مطمئن نہ تھے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دُوسروں کے سامنے میری بُرائی نہیں کرتے ہوں گے، مگر یہ بات میرے عِلم میں نہیں اور نہ میں نے اُن کی دوستی کے آگے کبھی اس بات کو اہمیت دی۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے اُن سے

کچھ شکایات کے باوجود بے پناہ محبت تھی اور ہے۔ ویسے مرتے دَم تک اُن کے خطوط ہمیشہ اُن کے خلوص کے شاہد رہے۔

شاہد مرحوم نے وقتاً فوقتاً جس بیباک قلم سے اپنے جانب کاروں کے خاکے کھینچے ہیں "نقوش" کے آپ بیتی نمبر میں وہ اس بیباک قلم سے اپنا خاکہ نہ کھینچ سکے۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنا خاکہ بھی اُسی قلم سے کھینچیں گے۔ انسان کی یہی وہ اخلاقی کمزوری ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنے اسلاف کی مستند تاریخ میسّر نہیں آتی۔ ہر مؤرّخ دوسرے مؤرّخ سے اختلاف رکھتا ہے۔ خوشامد پسندی اور غلط بیانی ہماری فطرتِ ثانیہ بن کر رہ گئی ہے۔ یہ انسان کی پستی اور اخلاقی مفلسی ہی تو ہے کہ وہ اپنے آپ بھی اپنے چہرے سے نقاب نہ اٹھا سکے۔ شاہد کی اپنی طرزِ تحریر کا تقاضا تو یہ تھا کہ جس طرح آپ بیتی نمبر میں اُنہوں نے اپنے دادا مولوی نذیر احمد کو بے نقاب کیا تھا، اُسی طرح اپنے نجی حالات بھی بے کم وکاست بیان کر دیتے۔ اپنی کمزوریاں بھی اُسی قلم سے ضبطِ تحریر میں لے آتے جس قلم سے دُوسرے ادیبوں کے حالاتِ زندگانی لائے ہیں، مگر انسانی خود پسندی نے اُنہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ جُرم کرنا اِتنا مشکل نہیں جتنا اقبالِ جرم اور یہی وہ انسان کی فطری کمزوری ہے جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں جرائم کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ بیشتر مُجرم کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور بہت کم کیفرِ کردار کو پہنچتے ہیں۔ جب زیورِ تعلیم سے آراستہ باشعور انسان بھی حقائق سے مُنہ موڑ کر گزر جائیں، تو پھر نچلے طبقے کے جہلاء سے حقائق پسندی کی اُمّید حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ جب شاہد جیسا بیباک قلم اپنے چہرے سے نقاب نہیں اُٹھا سکا، تو پھر صادق الخیری، فضلِ حق قریشی، ممتاز حسن، حبیب اشعر وغیرہُم سے یہ توقّع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ کُھل کر سامنے آ جائیں گے۔

شاہد صاحب نے سرمایۂ ادب میں جس قدر اضافہ کیا، اُس سے کون مردُود انکار کرسکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی پسندی کے زیرِ اثر اُنھوں نے عُریاں نگاری کی سرپرستی فرماکر سستے اَدب کی جو تشہیر کی اور اسلامی و اخلاقی اقدار کو جو نقصانِ عظیم پہنچایا اُسے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اِس تحریک کو اُبھارنے میں اُن کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ خاص طور پر خواتین میں لاشعوری طور پر یہ جذبہ پیدا کرنے اور عُریاں نگار خواتین کو آگے بڑھانے میں شاہد صاحب پیش پیش تھے۔ آج ایسی کئی خواتین صاحبِ قلم و کتاب موجود ہیں جو شاہد کی پروردہ ہیں۔

قسمت کا رونا انسان ازل سے روتا چلا آیا ہے۔ شاہد ایک جگہ نقوش کے آپ بیتی نمبر میں لکھتے ہیں: "مجھے کیا معلوم تھا کہ گانا بجانا جو محض باعثِ تفریح تھا، آخر عمر میں میری روزی بن جائے گا۔" مگر یہ سب کچھ اچانک نہیں ہُوا۔ انسان اپنی تقدیر خود بناتا بگاڑتا ہے۔ اُس کی بُنیاد تو اُس وقت پڑی جب شاہد صاحب نے اسلامی اقدار اور خاندانی روایات سے مُنہ موڑ کر موسیقی کے حصُول میں اپنے آپ کو غرق کر دیا اور اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل ہو گئے۔ ہر چیز، ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"، مگر کبھی کبھی یہی دوا زہر ہلاہل بھی بن جاتی ہے۔ وہ فنِ موسیقی حاصل کرنے میں اپنی شخصیت کو بھی فراموش کر بیٹھے تھے اور اس قدر خود فراموشی ہمیشہ تباہی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اُنھوں نے اس فن کے حصُول کی خاطر اپنا طبقہ بھی چھوڑ دیا۔ اخوّت و مساوات کا مطلب یہ نہیں کہ آپ آسمان سے زمین پر آن گریں۔ ہر فرقے، ہر خاندان اور ہر فرد کا اپنا ایک طبقہ اپنا ایک مقام ہوتا ہے اور اُسے اُسی میں رہ کر زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں شاہد نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔ اگر وہ اپنے مقام پر فائز رہتے ہُوئے اِس فن کو حاصل کرتے، تو نتیجہ یقیناً اس سے

مختلف ہوتا، یعنی یہ کہ وہ بھی اپنے احباب کی طرح کسی اچھے عہدے پر فائز ہوتے اور بافراغت، باعزّت زندگی بسر کرتے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ اس طرح وہ ادب کی خدمت نہ کر پاتے یا "ساقی" بند کرنا پڑتا۔ جب وہ دن کا بیشتر وقت موسیقی کے ریاض، موسیقی کی محفلوں میں شرکت اور ریڈیو کی ملازمت میں مصروف رہتے ہوئے ساقی نکال سکتے تھے۔ ادب کی خدمت کر سکتے تھے، تو پھر دیگر ملازمت یا کاروبار میں مصروف رہتے ہوئے وہ ایسا کیوں نہ کر پاتے؟ اُن کی اِن مصروفیات کا "ساقی" کی اشاعت پر دلّی میں بھی اثر پڑا تھا۔ مگر وہاں اِن کے اپنے کُتب خانے کی حالت بہت اچھی تھی۔ اس کے علاوہ جائیداد کا کرایہ کافی تھا۔ اس لیے وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتے تھے، مگر ساقی کے پُرانے پڑھنے والے ساقی کے نئے معیار سے مطمئن نہ تھے۔ برِّصغیر کی تقسیم کے بعد اگر شاہد اپنی دیگر مصروفیات ختم کر کے صرف "ساقی" کے ہو رہتے، تو ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے حالات پر قابو نہ پا لیں، مگر گانے بجانے کے چسکے نے آخیر عمر میں اُنہیں خراب کیا۔ اولاد کی نالائقی اور دیگر نجی ناخوشگوار حادثات نے، جن کا یہاں ذکر کرنا نہیں چاہتا، اُنہیں قبل از وقت موت کے مُنہ میں پہنچا دیا۔ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ شاہد کے ایسے دوستوں نے، جو شاہد کی بدولت ادیبِ شہیر بنے پھرتے ہیں اور شاہد کی بدولت آج اچھے عہدوں پر فائز ہیں، آخیر عمر میں نہ صرف شاہد کا ساتھ چھوڑ دیا، بلکہ انہیں نقصان پہنچانے سے بھی گُریز نہ کیا۔ اِن تمام حالات و واقعات کے شاہد وہ خطوط ہیں جو شاہد مجھے آخری ایام میں تحریر کرتے رہے۔

شاہد صاحب کی اولاد میں کوئی بھی اِس قابل نہیں کہ اُن کے نام کو زندہ رکھ سکے، مگر اولاد کی اس نااہلی کی تمام تر ذمہ داری خود شاہد پر عاید ہوتی ہے اولاد کی اس نااہلی کو سمجھنے کے لیے شاہد کے معمولات پر نظر ڈالنی ضروری ہے

دیر سے سونا، دیر سے اُٹھنا شاہد صاحب کا معمول تھا۔ گرمی میں سات آٹھ بجے اور جاڑے میں نو بجے تک اُٹھتے۔ ضروریات اور ناشتے سے فارغ ہو کر باہر آ بیٹھتے۔ دو بجے گھر کھانا کھانے گئے اور پندرہ منٹ بعد واپس آ گئے۔ سہ پہر چائے پینے گئے، ورنہ چائے مردانے میں آ گئی۔ رات آٹھ بجے کھانا کھانے گئے اور فوراً واپس آ گئے۔ رات ایک دو بجے جی چاہا تو گھر سونے چلے گئے، ورنہ مردانے ہی میں سو گئے۔ نہ کبھی اُنہوں نے کسی بچّے کو گود میں اٹھایا، نہ کبھی پیار کیا۔ کیسے پیدا ہوئے، کیسے پرورش ہو رہی ہے، اُنہیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مجھے تو یقین ہے کہ اُنہوں نے کبھی غور سے اپنے کسی بچّے کی صُورت بھی نہیں دیکھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے اگر کوئی اچانک پُوچھ بیٹھتا کہ آپ کے کتنے بچّے ہیں، کس عمر کے ہیں، کیا نام ہیں، تو وہ گھبرا جاتے اور کچھ تامّل کے بعد جواب دے پاتے۔ یہاں مجھے اُن کے لڑکے کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

میں ۱۹۴۹ء میں بسلسلۂ ملازمت کوہ مری میں تھا۔ مشہود اُن کا بڑا لڑکا کہ میری ہی گود میں کھیل کر بڑا ہُوا تھا اور باپ سے زیادہ مجھ سے مانوس تھا اور ہے، میرے پاس تھا۔ اُس کی منجھلی پھوپھی بغرض سیر کوہ مری آئیں۔ میری بیگم ثریّا جبیں دہلوی نے انہیں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن ہم سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ میری بیگم نے مشہود سے کہا: "مشہود، تمہاری پھوپھی بالکل تمہارے ابّا کی ہم شکل ہیں۔" مشہود نے جواب دیا: "میں نے کبھی اپنے ابّا کی شکل ہی غور سے نہیں دیکھی۔" اُس کا یہ جواب کسی مبالغے پر مبنی نہ تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ مہینوں باپ بیٹے کا آمنا سامنا بھی نہیں ہوتا تھا۔ جس باپ نے کبھی اپنی اولاد کو نظر بھر کے نہ دیکھا ہو، اس کی اولاد باپ کو کیا دیکھتی؟ اولاد باپ کی شفقت و محبّت سے تو باپ کے جیتے جی محروم تھی ہی کہ کمسنی میں ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ سوتیلی ماں تو کسی خوش قسمت ہی کو اچھّی ملی ہوگی۔ ایک طرف

شاہد جیسا بے نیاز باپ، دُوسری طرف سوتیلی ماں جس کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کا پُورا کُنبہ تھا جس کی پرورش اُسے کرنی تھی۔ اِن حالات میں اولاد کا کسی قابل ہونا معلوم۔ بچّوں نے ہوش سنبھالا، تو گھر میں سوتیلی ماں اور اُس کا کُنبہ اور باہر ابّا جان کو میراثیوں میں گُم پایا۔ بچّے پڑھتے کیا خاک۔ ابّا جان نے تو کبھی بھُول کر بھی یہ نہ پُوچھا کہ میاں اسکول میں داخل بھی ہو یا نہیں۔ ہو تو کون سے اسکول میں، کس جماعت میں؟ اُنہیں میراثیوں سے فرصت ملتی، تو پُوچھتے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے کُچھ ہی عرصے بعد وہ کھاری باؤلی کی رہائش ترک کر کے اپنے سُسرال حویلی اعظم خاں چلے گئے تھے۔ اور کیوں نہ جاتے؟ بڑی آرزوؤں، تمنّاؤں اور انتظار کے بعد تو ان سے شادی ہوئی تھی۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شاہد کی اولاد میں کوئی اس قابل نہیں کہ شاہد کا نام زندہ اور روشن رکھ سکے۔ مشہود احمد بڑے لڑکے نے ابھی دسویں پاس کی تھی کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے اور یہ سب لاہور آ بسے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہد مرحوم تھے بے حد سادہ لوح اور بھولے۔ مکان الاٹ کرایا تو ایسا کہ اس میں ایک تنکا نہ تھا۔ دروازے میں ایک گائے کھڑی تھی جو کوئی محلّے والا کھول کر لے گیا۔ سرکاری طور پر الاٹمنٹ افسر کے مددگار ہوتے ہُوئے اپنے لاکھوں کے کُتب خانے کے عوض لوہاری گیٹ میں "تیرتھ رام" جاسوسی ناول نگار کا چھوٹا سا کتب خانہ جس میں سوائے چند جاسوسی ناولوں اور مسوّدوں کے کُچھ نہ تھا، الاٹ کرا لیا۔ یہ تمام کام خود میرے ہاتھوں ہُوا جب کہ صابر دہلوی مرحوم نے جن کی دلّی میں نئی سڑک پر قینچی چھریوں پر سانگ رکھنے کی دُکان تھی، لوہاری گیٹ کے باہر ڈبل در کا کتب خانہ الاٹ کرایا اور وہیں زاہر القاسمی صاحب نے جو ریڈیو پاکستان کے قاری تھے، ایک بہت بڑا کُتب خانہ اور پریس الاٹ کرایا۔ میکلوڈ روڈ پر عاصی نظامی دہلوی نے، جن کی دلّی میں مہندی کی تجارت ہوتی تھی، ایک بہت بڑی

بلڈنگ بحیثیت ایک صحافی الاٹ کرائی۔ وغیرہ وغیرہ۔

میراثیوں نے شاہد کو یہاں بھی نہ چھوڑا۔ سب اُن کے آس پاس ہی آ بسے اور وہی بے ڈھنگی چال یہاں بھی شروع ہو گئی۔ اِس ناداری و مفلسی کے عالم میں ۲۵ آدمیوں کے کنبے کا خرچ اور پانچ سات روپے روز میراثیوں کی چائے پانی۔ آمدنی صفر، دیوالیہ تو نکلنا ہی تھا۔ چند ماہ میں چودہ ہزار روپیہ، جو انہوں نے اپنے بڑے بھائی "منجو" سے حیدر آباد سے منگایا تھا، صاف ہو گیا اور شاہد لاہور کا کتب خانہ بڑے لڑکے کے سپرد کر کے کراچی چلے گئے۔ چند میراثی جو اُن کی جان کو اٹکے ہوئے تھے، اُن کے لڑکے مشہود کی جان کو اٹک گئے۔ میں جیسا کہ اُوپر عرض کر چکا ہوں ۱۰ اپریل ۴۸ء کو بسلسلۂ ملازمت لاہور سے کوہ مری چلا آیا تھا۔ جنوری ۴۹ء میں شاہد کراچی سے مجھ سے ملنے مری آئے اور لاہور میں مشہود کی آوارگی اور اپنی لاچاری و مجبوری کی داستان سنائی۔ میں نے کہا کہ وہ تنہا میراثیوں میں رہے گا، تو سنبھلنا مشکل ہے۔ تم جا کر اُسے میرے پاس بھیج دو؛ چنانچہ مشہود جنوری ۴۹ء ہی میں میرے پاس آ گیا۔ اور پھر ۵۴ء تک میرے ساتھ راولپنڈی میں رہا۔ میں نے اسے ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں بحیثیت اناؤنسر ملازم رکھوا دیا۔ ۱۹۵۵ء میں شاہد نے اُسے اپنے پاس بُلا کر اس کی شادی کر دی اور پھر وہیں رکھ لیا؛ چنانچہ اب بھی وہ ریڈیو پاکستان کراچی میں ملازم ہے اور چھ سات بچوں کا باپ۔ یہ اُن کا انتہائی سعادت مند بچّہ ہے، مگر شاہد اس سے ہمیشہ نالاں رہے اس لیے کہ وہ بڑا آدمی نہ بن سکا اور نہ ان کے کام میں ہاتھ بٹا سکا، مگر جس ماحول میں اُس نے پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی اور جو روّیہ شاہد صاحب کا اپنی اولاد کے ساتھ رہا، اِس کے پیشِ نظر اُس سے کسی قسم کی شکایت بیجا ہے۔

میں جنوری ۶۸ء میں کراچی گیا تھا۔ وہاں مشہود سے بھی مِلا۔ اس نے شاہد کے

انتقال کے بعد کے جو واقعات سُنائے، وہ ایک دُکھ بھری کہانی ہے جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ "ساقی" کا کام وہ خود سنبھال لے، مگر بیگم شاہد نے کہ ساقی کی پرنٹر پبلشر وہ خود ہیں، اسے گوارا نہیں کیا۔ گو بحیثیت مدیر ساقی پر نام عاصمہ بیگم کا ہے، مگر "ساقی" شمس زبیری صاحب مُرتّب کر رہے ہیں۔ میری دلی دُعا ہے کہ خدا اُن کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ شاہد کی پُرخلوص دوستی کا خیال کرتے ہُوئے اُن کی نشانی "ساقی" کی ہمیشہ پُرخلوص خدمت کرتے رہیں اور اُن کے لڑکے مشہود احمد کو بھی اس خدمت میں شامل کرلیں۔

"مرحوم" شاہد

حفیظ جالندھری

"مرحوم" یعنی جس پر اللہ کی طرف سے رحم کیا گیا۔ کیا اچھا اور مبارک لفظ ہے، لیکن نہ جانے کب سے اور کیوں یہ لفظ بطور اصطلاح محض اُس وجودِ محض، اُس فرد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے جس کے تن بدن کو رُوح سے فارغ پا کر ہم مٹّی میں دفن کر دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ (کم از کم) اس زمینی زندگی میں ہم اُس کے محسوس وجود سے محروم ہو گئے ہیں۔ احباب سے جُدائی کا قلق لازمۂ انسانیت ہے، بلکہ اللہ کی وہ مخلوق جو بشر نہیں کہلاتی، اُس میں بھی ایسے انواع ہیں جن کو مر جانے والے ساتھی کے غم و اندوہ میں پایا گیا ہے۔

پُوری طرح تو معلوم نہیں کہ یہ انسان نہ کہلانے والی مخلوق اپنے سے جُدا ہو جانے والے تک اپنے غم و رنج کا فائدہ یا تاثر پہنچانے کے لیے کیا طرز و روش اختیار کرتی ہے، البتہ ہم احسن المخلوق کہلانے والے لوگوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ جب ہم

سپردِ خاک کر آتے ہیں، اُس کی رُوح کسی برزخ میں جانے سے پیشتر ہمارے اِرد گرد منڈلا رہی ہے۔ ذہنی اور مادی اَغذِیہ جن کی وہ لذت چشیدہ رہ چکی تھی، اب بھی اُن اشیا کی طالب ہے، لہٰذا خاص طور پر ہم مسلمان مختلف طریق سے اس کی رُوح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ختم شریف قرآن خوانی اور دوسرے مقدس کلمہ و کلام کے وِرد سے بھی اور طرح طرح کے طعام ہائے لذیذ سے بھی اور جن میں زیادہ ہمت ہے وہ اچھے اچھے لباسوں کے ذریعے بھی اُس رُوح کو مطمئن کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ چالیس دن تک اگر ہر روز نہیں تو ہر جمعرات کو ختم شریف اور اَغذِیہ کی دعوتیں اپنے عزیزوں اور مساجد کے مولویوں، اماموں اور اُن کے طلبہ یا چند مساکین کو دیتے ہیں۔ خود بھی کھاتے پیتے ہیں، برادری کو بھی کھلاتے پلاتے ہیں۔ اس طرح اُس مرحوم کی رُوح کو ثواب پہنچ جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے جُداگانہ طریق رکھتے ہیں، اس کا تذکرہ یہاں لاحاصل ہے، البتہ ایک بات مختصر طور پر عرض کر دینے کے لیے اس وقت میری ضبطیٔ طبع مجھے مجبور کر رہی ہے، وہ ایک بات یہ ہے کہ ہم اہلِ قلم لوگ کسی مشہور انسان کی رحلت کی خبر پڑھتے ہی یا سُنتے ہی اخباروں میں "مرحوم" کا تعزیتی تذکرہ نظم یا نثر میں چھپوا دینے کے لیے ایسی عجلت دکھاتے ہیں جیسے ہم اس فرد کی موت کے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ گویا ایک لکھا لکھایا بیان جیب ہی میں تھا یا گھڑی گھڑائی نظم سنوری سنورائی ملفوف موجود تھی تاکہ دیر نہ لگے اور اخبارات کے کالموں پر اللہ کو پیارے ہو جانے والے کے اوّلیں ماتمی ہمیں نظر آئیں۔ للعجب۔ یہی نہیں، مَیں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ گھریلو جو اُقارِب کہلواتے تھے، مگر ہمیشہ عقارب بنے رہتے تھے، اب وہ اپنے شور و شیون اور تشریف لے جانے والے فرد کی مادّی اشیا پر روحانی ہاتھ "پاک صاف" کرنے

کے لیے جھڑیوں اشک افشانی دکھاتے نظر آتے ہیں۔ ایسے چند مشاہدوں نے مجھ سے بھی یہ سادہ سا مطلع کہلوا دیا تھا ؎

جیسے محوِ خوابِ عدم دیکھتے ہیں
اُسے کس تسلّی سے ہم دیکھتے ہیں

آہ ——— مَیں کس راہ پر چل نکلا۔ حواس باختہ ہوں نا ——— مجھے تو شاہد احمد صاحب کے بارے میں کچھ لکھنا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے جب وہ ہم میں رُوح وتن کی جامعیت کے ساتھ موجود تھے، اللہ رحیم کے دامنِ رحمت سے کبھی باہر نہ تھے اور نہ باہر ہم ہیں، تاہم شاہد صاحب کو اپنے بزرگوں کی تقلید میں "مرحوم" ہی کہنا اور لکھنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم کسی ایسے بیمار کو بھی جو آخری سانس لے رہا ہو، اُس کے منہ پر "مرحوم" کہہ دیں تو اُس کا دل توڑ کر مار ڈالنے کے جُرم میں اِردگِرد کے لوگ ہماری ہڈّیاں توڑ پھوڑ ڈالیں۔ شاعروں کے "محروم" تخلّص تو سُنے ہیں، اُن سے مُلاقاتیں بھی ہوئی ہیں، "مرحوم" تخلّص کسی نے یا تو اب تک کیا ہی نہیں یا میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں خود ——— کہ شاعر کہلاتا ہوں، سرے سے تخلّص ہی نہیں رکھتا۔ وہی حفیظ کا حفیظ میرا نام ہے جو ولادت کے بعد بزرگوں نے تجویز فرما دیا تھا، لیکن عنقریب "مرحوم" ہونے والا ہوں، کیوں کہ ؎

پیام آرہے ہیں مِرے دوستوں کے
مِری راہ اہلِ عدم دیکھتے ہیں

شاہد صاحب سے میرے ذاتی مراسم یک رُخہ طرز کے تھے۔ یک رُخے پن کی یہ کہانی طولانی نہیں ہے، البتّہ اس مختصر کہانی کی تمہید مختصر نہیں۔ اس تمہید کے دَوران میرا

تصوّر جو تصویر آپ کے حضور پیش کرے، اُس میں خود میرے اُڑے ہوئے رنگ کی ابتدائی جھلک آپ کو نظر آئے گی۔

لڑکپن میں میری والدہ نے چند ایسی کتابیں پڑھنے اور پھر عمر کے بڑھنے یا ترقی کرتے چلے جانے کے ساتھ ساتھ اُن کو سمجھنے اور اگر اللہ توفیق دے تو جہاں تک ہو سکے اُن سے اثر لینے اور اُن پر عمل کرنے کا شوق عطا فرمایا تھا۔ اُن میں دوسری نظمیہ پنجابی کُتب کے علاوہ اُردو کی مسدّس حالی کے بعد مرٔۃ العروس، تَوبۃُ النّصوح اور بناتُ النّعش بھی اور علّامہ راشد الخیری کی کُتب کی غم آلود داستان ہائے حیاتِ مستورات بھی تھیں اور مجھ پر حالی کے بعد سب سے بڑا اثر ڈپٹی نذیر احمد (مغفور) کی مذکورہ بالا کتابوں کا جن دنوں زیادہ پڑا تھا، اُسی زمانے میں میرے سَر شعر و شاعری کا بھُوت بھی سوار تھا۔ مسجد میں ناظرہ قرآن کریم اور کریما مقیماں تو رٹ چکا تھا، اب اسکول میں دادِ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اسکولی درسی کُتب میں میرے ذوقِ شاعرانہ کے جنُون کا علاج نہیں تھا۔ پہلے اسکول سے بھاگ کر گلی کوچوں اور پھر اپنے شہر سے بھاگ کر کپورتھلہ، امرتسر اور لاہور کی سیر و سیاحت فرمائی جاتی رہی، لیکن "آبِ حیات" کے جزعوں نے دِل میں دِلّی کی سَیر کا دریا موجزن کر رکھا تھا۔ اُردو زبان سے اتنی والہانہ شیفتگی نہ جانے کیوں تھی کہ اب کتابوں سے اُردو کے مرکز اور اس مرکز کے بسنے والے میرے دل میں رس بس گئے تھے۔ داغؔ کی زبان اور شعری انو مٹیں میرے گوشہ ہائے قلب میں کروٹیں لے رہی تھیں۔ آخر اپنے پالنے والے رانا خدا بخش خاں کے خُفیہ خزانے سے کچھ اُڑایا۔ اپنے ہم سن اور ہم قدم دو رفیقوں کو ساتھ لیا۔ معمولی سے کپڑوں کا ایک چھوٹا سا بکس اور ایک ایک کمبل دو دو چادریں اور تکیے باندھ کر مَیں نے تھرڈ کلاس کے تین ٹکٹ خریدے اور دوسرے ہی دن ہم تینوں دہلی پہنچ گئے ـــــــ رانا کرم بخش خاں

میرے والد کے ماموں لکھ پتی تھے۔ یہ بھی اور ان کی بڑی بھاوجہ (جو میرے گھر سے بھاگنے سے پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں) لاولد تھے اور ان دونوں نے مجھے اس دُنیا میں وارد ہوتے ہی میرے دادا رانا حاجی مہرالدین خان سے خیرات کے طور پر اپنی جھولی میں ڈال کر متبنّٰے بنا لیا تھا، لہٰذا چھڑرپن، کھلنڈرا پن، بیباکی، نڈری اور اسراف کے لیے ضد میرا پیدائشی حق تسلیم شدہ تھا —— روک ٹوک والد کی طرف سے اور سرزنش والدہ کی طرف سے ہوتی، لیکن متبنّٰے بنانے والا بزرگ رانا کرم بخش ان سب پر حاوی تھا۔ یہ معترضہ جملے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ۱۱ برس کی عمر میں دہلی پہنچنے اور وہاں طفلانہ کوچہ گردی کا سبب غائب نہ رہے۔ مَیں حاضر ہوں۔ ابھی غائب نہیں ہو سکا۔

میرے ساتھیوں میں ایک اپنے باپ کے ساتھ دہلی جا چکا تھا، لہٰذا اُس نے فتح پور مسجد کے قریب بہت بڑے ہوٹل میں جس کا نام کارونیشن ہوٹل تھا، ٹھہروایا اور مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دہلی بڑا شہر ہے۔ لاہور سے بڑا اور زیادہ بارونق، کیونکہ شفیع کی سرائے میں نہیں، اب ہم ایسے عالی نظر سیّاحوں کو ہوٹلوں میں قیام فرمانا لازم آیا ہے۔ فسانۂ آزاد مَیں پڑھ چکا تھا، لیکن اس میں لکھنؤ کی بھٹیاریوں اور کارواں سراؤں کا ذکر تھا۔ انہیں مجھے بعد میں شرف بخشنا تھا۔ اب تو ہم دہلی میں تھے۔ میرے ساتھی شعر و شاعری یا ادب سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ وہ تھیٹر یا جامع مسجد کے اِردگرد مداریوں اور دوا فروشوں کے تماشائی اور تمنائی تھے اور مَیں دلّی کی اُردو کا وہ لہجہ سیکھنے کا سودائی تھا جس کے محاورات مرأۃ العروس اور توبۃ النصوح کے ہر صفحے کی سطر سطر پہ بکھرے ہوئے تھے۔ آخر پوچھتے پاچھتے تن تنہا مَیں ایک دن مسجد نہوؔر خاں کے قریب کوچہ بتاشاں میں جا نکلا۔ یہ عجب لذیذ کوچہ تھا۔ کہا، چٹخارے دار

خوشبوئیں یعنی چھوٹی دُکانوں میں رنگ رنگ کے اچار، مربّے، پاپڑ اور سکٹھوں کی دُکانوں پر بڑیاں۔ یہ سب کچھ میرے لیے مُنہ میں بار بار رال بھر آنے کا سامان تھا کہ ایک ہی جگہ جمع تھا۔ مَیں نے یہاں پہلی مرتبہ جَل جِیرا (زیرے کا آب زلال) پیا۔ میرے سامنے ایک بہت بڑی حویلی کا پھاٹک تھا اور یہی وہ حویلی تھی جس کی تلاش مجھے کُوچہ بتاشاں میں لائی تھی۔ دُکانوں پر بتاشے تو بہت تھے، لیکن بہت سی دُکانوں سے عجیب و غریب ہم آوازوں کی دھمک میرے لیے دہلی کی پہلی راگنی تھی جو اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہت مدّت کے بعد جب مجھے معلوم ہُوا کہ شاہد احمد صاحب ڈپٹی شمسُ العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کے پوتے موسیقی کے دِلدادہ ہیں، تو اس انکشاف پر میرے کانوں کو اُسی دھمک یا تھپک کی لَے یاد آگئی۔ یہ کیا تھا؟ یہ دُکانوں میں سونے اور چاندی کے ورق کُوٹ کر بنائے جا رہے تھے۔

بہرحال مَیں اُس حویلی کے کُھلے پھاٹک سے ڈیوڑھی میں داخل ہُوا اور پُکارنا شروع کیا۔ "ڈپٹی صاحب! شمسُ العلماء صاحب۔ مولوی نذیر احمد صاحب" کی یہ صدائیں ایسے پنجابیانہ گنوارپن کی چلّاہٹ کے ساتھ بلند کیں کہ ڈیوڑھی سے آگے جو در بند تھا اُس کے کُھلنے سے پیشتر کُوچہ بتاشاں کے لالہ لوگ اور بھائی لوگ ہی نہیں، اور بہت سے لونڈے لاڑیے بھی جمع ہو کر میری وضع قطع اور اس چلّاہٹ پر ٹھٹھا اُڑانے لگے۔ میرے سر پر بے پُھندنے کی تُرکی لال ٹوپی، دھڑ پر لکیر دار قمیص اور قمیص پر کوٹ، لیکن کمر سے نیچے نیلے رنگ کا پنجابی چادرہ سا جسے بڑی عُمر کے لوگ اَن پڑھ ہوں تو تہمت پڑھے ہوئے تہمد اور ہم چھٹی کلاس کے نوخیز اُسے تہمدی کہتے تھے۔ لُنگی اور لاچہ وغیرہ بھی اس کے پنجابی نام ہیں۔ اس لباس کے ساتھ میرے پیروں میں کالا چمک دار پمپ تھا جس کو مَیں نے دہلی ہی سے خرید کر پہن لینے کی

عزّت بخش دی تھی۔ مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ میری یہ عمر اور یہ وضع قطع اور یہ چلاّہٹ اور ایسے لاثانی بزرگ کا نامِ نامی اسمِ گرامی پُکار پُکار کر محلّے بھر کو سر پہ اُٹھا لینا دہلی والوں کے لیے پھبتی کَسنے کی خاطر کس قدر مضحکہ انگیز حرکات تھیں۔ میرے گرد ایک بھیڑ لگ گئی۔ یہ لوگ ڈاڑھیل بھی اور بے ڈاڑھی کے مسلمان بھی تھے۔ دھوتی پوش لالہ جی لوگ بھی، لیکن سب سے زیادہ ٹھٹھول وہ لڑکے تھے جو شاید میری ہی عُمر کے ہوں۔ اُن کے لباس مَیلے چکٹ تھے۔ اُن کی بولی داغ اور ڈپٹی نذیر احمد کی بولی نہ تھی۔ مدّتوں بعد معلوم ہؤا کہ یہ دلّی کے کرخنداروں کی زبان تھی۔ بہر آئینہ میں اُن کے لیے ایک بولتا ہؤا کارٹون تھا۔ اُن کی ٹھٹھّے بازی نہ تھی چھرّے تھے جو مونہوں سے نکل کر میرے دلّی کے دِلدادہ دل پر تابڑ توڑ برس رہے تھے۔ اتنے میں ڈیوڑھی کے سامنے کا دَر بند کُھلا۔ پہلے ایک بُوڑھی نوکرانی اور اُس کے پیچھے قدرے سانولے رنگ کے ایک شریف آدمی جن کے چہرے پر ڈاڑھی تھی، نکلے اور مجھ سے پُوچھا: "برخوردار کیا چاہتے ہو۔ کون ہو؟ کس کو پُکارتے ہو؟" میری وضع قطع، اُس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسے ثقہ کے لبوں پر بھی مُسکراہٹ لے آئے گی —— مَیں نے اِرد گِرد کے شور و غوغا کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا: "مَیں ڈپٹی صاحب سے تَوْبَۃُ النَّصُوح بننے آیا ہُوں۔ یہ "بننے آیا ہوں" نہ جانے کیوں میرے مُنہ سے نکلا کہ وہ ہنس دیے اور نرم لہجے میں جو کچھ فرمایا وہ میری سمجھ میں صرف اتنا ہی آیا کہ "ڈپٹی صاحب تو ——" باقی میرے اردگرد کے جھرمٹ میں غائب غلّہ ہو گیا۔ وہ بزرگ دیکھتے ہی رہ گئے اور لڑکوں نے مجھے دَھول دھپّے سے نوازنا شروع کر دیا۔ مَیں بھی اُن کی طرف لپکا۔ مجھے دیوانہ سڑی سودائی گردانا گیا۔ اب مَیں آگے آگے اور لونڈے لاڑیے میرے پیچھے پیچھے تھے۔ مَیں دُھتکارا ہؤا تھا، دھکیا یا ہؤا

تھا۔ بڑیاں والے کٹڑے میں سے ہوتا ہوئا ئیں جان بچا کر آخر کار کاروینشن ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھا ——— لڑکے نہ جانے کب تتر بتر ہوئے ئیں تو اپنے جھلنگے پر دراز تھا۔ اُس کمرے میں جہاں ہم تینوں لڑکے ٹھہرائے گئے تھے۔ کمرے کی دو طرف کی دیواریں سفیدی کردہ چٹائیوں کی تھیں۔ آگے بالکنی تھی۔ بازار کی جانب اور کمرے میں داخل ہونے کا دروازہ دوسری منزل کے صحن میں سے ہمیں اس کمرے میں لاتا تھا۔ اُس وقت میرے ساتھی غائب تھے۔ یہ ہے شاہد احمد کے دادا کی حویلی کے پھاٹک اور ڈیوڑھی کے اندر تک میری حاضری کی اوّلین داستان۔

یہاں سے اس کے بعد میں بار بار گزرا ——— لیکن اور لباس اور وضع قطع سے۔ ہائے۔ کیا عمدہ شعر شوقؔ قدوائی مرحوم کا یاد آگیا ہے ؎

گلیوں گلیوں ہم نے لاکھوں کنکر پتھر کھاتے ہیں
لڑکوں نے دیوانہ پاکر ناک چنے چبوائے ہیں

میری یہ پہلی ملاقات شاہد احمد سے نہیں، بلکہ اُن کے دادا جان کی بنوائی ہوئی حویلی سے تھی اور ایک جھلک اُن کے والد ماجد کی بھی ئیں نے اُسی عالم میں دیکھی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ چاندنی چوک میں، اگرچہ اب خشک تھی لیکن شاہجہانی دَور کی نہر اور اُس کے ہر دو جانب درخت موجود تھے۔ بجلی بھی بازاروں میں کھمبوں پر رات کو طرح طرح کے رنگ بدلتی تھی۔ ٹراموے بھی تھی، لیکن ہم یکّے ہی کو ترجیح دیتے تھے اور اسی میں قطب کی لاٹھ پر ہو آئے تھے۔

اب اور زیادہ لکھنا نہیں ہے۔ دِلّی نے بقول خواجہ حسن نظامی میرا دِل لے

لیا یا اپنے پنجے میں جکڑ لیا تھا۔ میں بار بار دہلی گیا۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ جن کی تلاش میں کوچہ بتاشاں میں مجھے دیوانہ گرد انا گیا تھا، وہ مدّت ہوئی انتقال فرما چکے ہیں، تاہم اُن کی کتابیں موجود تھیں، البتّہ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ شاہد احمد بھی کوئی صاحب ہیں۔ ہاں، ایک دو مرتبہ اُس بڑی حویلی کے پھاٹک پر ایک چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا دیکھا تھا جس پر "ساقی بُک ڈپو" لکھا ہوا تھا اور بس۔

اب میں شاعر بھی ہو چکا تھا ایڈیٹر بھی۔ دہلی کے مشاعروں ہی میں نہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے ہاں قوالی بھی سُنتا اور کوچہ چیلاں میں مولانا محمد علی جوہر سے آصف علی بیرسٹر کے درِ دولت پر نیاز بھی حاصل کرتا تھا۔ محترم مُلّا واحدی کے بالا خانے پر محفل بھی جمتی تھی۔ اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے تو مجھے مریض الملک ہی بنا رکھا تھا، لیکن سب سے بڑی دولت حضرت علامہ راشدُ الخیری کا دیدار تھا جن کی تحریریں ہمارے گھریلو معاشرے کی مُنہ بولتی غم انگیز تصویریں ہیں۔ اگر ہم میں ذرّہ بھر غیرت بھی ہے تو اپنے اللہ سے اور اُس کے حبیبؐ سے از سرِ نو رشتہ جوڑ کر اپنی اور اپنی آئندہ نسلوں کی تقدیریں بدلنے کے لیے نہ صرف پڑھنی چاہییں، بلکہ اُن کی تبلیغ بھی کرنی چاہیئے ؎

آؤ نقشِ لَا اُحِبُّ الآفلین تازہ کریں
چشمِ ابراہیمؑ سے ذوقِ یقیں تازہ کریں
سرکشی نے کر دیے دُھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں

شاہد احمد سے میری پہلی ملاقات اُن دنوں ہوئی جب میں دوسری جنگ عالم گیر میں سونگ پبلسٹی کا ڈائریکٹر تھا۔ "ساقی" تو میری نظر سے میری ادارتِ مخزن کے زمانے ہی میں شاید گزر چکا تھا، لیکن مجھے مشاعروں سے، اسلامی جلسوں میں چندہ جمع کرانے، خلافت کانگرس کے تحاریکی جلسوں میں دِلوں کو گرمانے کے بعد شُدھی اور سنگھٹن کے مقابل ڈاکٹر سیف الدّین کچلو کی صُلح پسندانہ تحریک میں تگ و دو سے فرصت کہاں تھی۔ مخزن سے ساقی کا تبادلہ بھی نہ تھا، البتہ کبھی کبھار اپنے محترم دوست ایم اسلم صاحب سے ساقی مِل جاتا تھا اور مَیں نے جان لیا تھا کہ شاہد احمد دہلوی مدیر و مالکِ ساقی اور ساقی بُک ڈپو ہماری قوم و ملّت میں اُس فردِ وحید کے پوتے ہیں جن کی کتابوں سے مَیں نے اتنا کچھ سیکھا ہے کہ مجھ ایسے کسی اور پنجابی اہلِ قلم نے کبھی نہ سیکھا ہو۔ شاہد صاحب سے ملاقات کی صورت اَدبی نہیں تھی۔ مجھے دعوت مِلی۔ ایک دوسرے دوست جو ریڈیو میں ملازم تھے، مجھے اُسی گلی بتاشاں والی میں لے گئے اور مَیں اُسی پھاٹک کے اندر کی ڈیوڑھی سے سیڑھیاں چڑھ کر ایک ایسی محفل میں در آیا تھا جس کے میزبان شاہد احمد تھے۔ یہ جلسہ موسیقی کے ایک بہت بڑے اُستاد کا فن سماعت کرنے کے لیے سجایا گیا تھا۔ اس لیے مَیں —— ابوالاثر حفیظ جالندھری —— گیت اور نغمہ وغیرہ سے نازیوں کے خلاف سارے ہندوستان میں پبلسٹی کرنے والا ڈائریکٹر بھی اس محفل میں سج گیا۔ مجھے شاہد احمد سے مِل کر ایسی مسرّت ہوئی جو ایک عقیدت مند مُرید کو اپنے پیر کے پوتے سے مِل کر ہو سکتی ہے۔ رات کے دو بجے تک یہ محفل جمی رہی۔ وہ اُستادِ موسیقی جن کا نامِ نامی بھُول گیا ہوں، واقعی بہت بڑے اور کامل تھے۔ مجھے اُس رات یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شاہد احمد بھی اس فن میں اُستادی کا درجہ حاصل کر رہے ہیں، لیکن میری بدنصیبی کہ مجھے

اُن سے کوئی راگ راگنی سُننے کا کبھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ بات یہ تھی کہ مجھے اُن کے دادا کی کتابوں اور اُن کے والد کی جھلک نے اپنا ایسا نیاز مند بنا رکھا تھا کہ شاہد احمد کو دیکھ کر ڈپٹی صاحب اور اُن کے والد کی تصویریں سامنے آجاتی تھیں وہ تھے جیّد عالم و ادیب، لہٰذا یہ ممکن ہی نہ تھا کہ مَیں کبھی اُن کے وارث سے راگ سُننے کی فرمائش کردں۔ میرے نزدیک یہ گستاخی تھی۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے، لیکن بزرگ زادے تھے۔

جب شاہد احمد پاکستان میں آگئے تو مَیں اُن دنوں پہلے محاربۂ کشمیر میں اور پھر افواجِ پاکستان میں تبلیغِ شجاعت کی خدمت میں مصروف تھا۔ شاید اسی دَوران ایک دوست نے مجھے ساقی کا شمارہ بھیجا جس میں ڈاکٹر تاثیر کے ایک نئے مُلاقاتی نے اُس "مرحوم" کی کسی ادا پر خفا ہو کر اُن کو ساقی کے صفحات پر بے نقط سُنائی تھیں۔ ایسی بے نقط کہ میں "الحفیظ" کا وِرد کرنے لگا اور تاثیر کو ان باتوں کا کسی طرز سے بھی جواب دینے سے منع کیا —— تاثیر اُن دنوں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ مجھے ایسے بزرگ زادے کے رسالے میں گالی گلوچ پسند نہ آئی تھی۔ اگرچہ یہ شاہد احمد کی طرف سے نہ تھی، لیکن وہ اس مجلّہ کے مدیر تو تھے۔ میرا اپنا ہی شعر اس وقت میرے ذہن سے کہہ رہا ہے کہ جو کچھ تُو نے اے حفیظ، تاثیر سے کہا تھا یہاں بھی کہہ ڈال۔ وہ شعر یہ ہے ؎

نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مُسکرائے جا

شاہد احمد ایک دن مجھے کراچی کے ایک دفتر میں ملے۔ اغلباً اُس وقت میرے ساتھ میرے زندہ دل دوست اے ڈی اظہر تھے۔ میرے نیاز مندانہ سلام کا جواب خندہ پیشانی سے ملا تو میں نے پوچھا: "شاہد بھائی، اس دفتر میں کیسے آنا ہوا؟" وہ مسکرائے اور جواب دیا: "ریڈیو پاکستان میں نوکری کے لیے آیا ہوں۔" "نعوذ باللہ" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ میں نے اظہر بھائی سے کہا: "دیکھتے ہو، شاہد احمد دہلوی شمس العلماء ڈپٹی حافظ نذیر احمد مدظلہ العالی کا پوتا، شریف زادہ ہی نہیں دہلی کا رئیس زادہ، خود ایک بہت بڑے کُتب خانے کا مالک اور بہت بڑی جائداد کا وارث آج یہاں نوکری کے لیے دفتروں کے چکّر لگا رہا ہے۔" یعنی اختیارِ خود بدستِ خود فروختن کے لیے مجبور ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور رخساروں پر ٹپک پڑے جنہیں میں نے مُنہ پھیر کر اپنے رومال سے پونچھا۔ شاہد بغلگیر ہوئے اور چل دیے، ع

بڑی مصیبت شریف کو ہے امیر ہو کر غریب ہونا

پاکستان کا رائٹرز گلڈ بنا۔ جناب قدرت اللہ شہاب سے زیادہ شاید اور کوئی نہیں جانتا کہ آغاز میں اس کا محرّک میں تھا اور اُن کے سرکاری دفتر میں پہنچ کر اُن کو اُکسایا کرتا تھا اور پھر جب میں "ایفرو ایشین" کانفرنس تاشقند اور رُوس کی سیاحت سے پلٹا تھا تو میں نے ہی شہاب صاحب سے وہاں کے اہلِ قلم کے اتحاد کی داستانیں سُنائی تھیں۔ آخرکار یہ طے ہوا کہ اہلِ قلم کی عزّت و حُرمت کے لیے کچھ کیا جائے۔ بہت سے نام پیش ہوئے۔ ایک مضمون عالی صاحب کے کہنے پر افتتاحیہ کے طور پر میں نے لکھا۔ ایک چھوٹی سی مجلسِ مشاورت میں میرے پیش کیے

ہوئے ناموں میں سے پاکستان رائٹرز گلڈ منظور ہو گیا۔ ضروری نہیں اور میں خواہش مند بھی نہیں کہ اس کا اعتراف کیا جائے۔ لکھا اس لیے ہے کہ اگرچہ میں اہلِ قلم کی عزت طلبی کرنے والوں کے اوّلین شرکاء میں سے ایک تھا، لیکن الحمد للہ کہ میں نے نہ کسی عہدے کی خواہش کی اور نہ انشاء اللہ آخری سانس تک یہ تمنّا کروں گا، البتہ اہلِ قلم کی خدمت میرا فریضہ ہے جس کا ثبوت میں سوئنگ پبلسٹی کے زمانے میں بھی دے چکا ہوں — جہاں تک گلڈ کا تعلق ہے، میری خدمات کے سلسلے میں شاہد احمد میرے شاہدِ عادل ہیں۔ اُن کی ایک تحریر مشہور و معروف مجلّہ افکار کے حفیظ نامے یا حفیظ نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں چند باتیں ایسی بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ میرے اصل حالات سے قطعاً ناواقف رہے، تاہم میرے خلوص، میری نیازمندی اور اُن کے ارشادات کی جو تعمیل راقم الحروف نے جس طرح کی اس کا صدقِ دل سے شاہد احمد نے اعتراف فرمایا ہے اور میں تو بہر حال تھا ہی اُن بزرگ زادہ صاحب کا نیازمند۔ اب بھی ہوں اور آخری سانس تک رہوں گا۔ عقیدتیں، محبتیں کسی کے جسمانی طور پر جُدا ہو جانے سے ختم نہیں ہو جاتیں۔ ہاں، میں جانتا ہوں کہ زمانہ بدل گیا ہے اور میں نے موجودہ صورتِ حال کو ایک شعر میں بیان بھی کر دیا ہے ؎

جان سے پیارے یار ہمارے قیدِ وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اِک تارِ نفس کی بات نہیں

ساقی کا ایک شمارہ راولپنڈی میں نظر سے گزرا۔ اُس پر شاہد احمد دہلوی کے بجائے عاصمہ (خاتون کا نام) بطور ایڈیٹر تھا اور محترمہ کی طرف سے یہ اندیشہ ناک خبر تھی کہ شاہد صاحب پر دل کی تکلیف کا دَورہ پڑا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر خود میرا دل میرے حلق میں

اٹک گیا۔ مجھے اُن سے بہت زیادہ محبت تھی۔ مَیں نہیں جانتا تھا کہ یہ سطور اُن کی بیگم صاحبہ نے لکھی ہیں۔ مَیں نے ایک خط محترمہ کی خدمت میں لکھا اور اپنی انتہائی تشویش کی حالت میں لکھا۔ چند روز بعد خود شاہد احمد کے اپنے قلم سے تحریر شدہ خط مجھے ملا جو افسوس اس وقت میرے ساتھ لاہور میرے بستے میں نہیں۔ راولپنڈی میں چند ایسے خطوط کے ساتھ رکھا ہے جن کو مَیں تعویذ خیال کرتا ہوں اور مقبول جہانگیر کا اصرارِ شدید ہے کہ مَیں اس وقت جس عالم میں بھی ہوں، جو کچھ لکھ سکوں لکھ کر ان کی خدمت میں پہنچا دُوں، اس لیے وہ خط تو یہاں پیش نہیں کر سکتا۔ بس یہ جان لیجیے کہ یہ خط شاہد بھائی کا پہلا اور آخری خط میرے لیے ہے اور مَیں اِسے اپنی جان سے زیادہ عزیز جانتا ہوں ع

نامہ اش نامۂ حیاتِ من ست

چند دنوں کے بعد میرے پیارے ابنِ انشاء نے مجھے بتایا کہ شاہد احمد دہلوی کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحہ سے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ مَیں نے نہ جانے کیا کہا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے مُنہ سے نکلا "آج میرے لیے دہلی مر گئی" ——— پھر آنکھیں تھیں کہ آنسو نہ رُکے ——— اور مَیں سَر جُھکا کر کچھ دیر بیٹھا رہا ———
آخر مجھے اپنا ہی شعر یاد آیا ؎

میرے دوستوں کی صدا آ رہی ہے
تری راہ اہلِ عدم دیکھتے ہیں

اِس وقت رات کے تین بج چکے ہیں۔ تحریر کی بے ربطی میری اپنی دماغ باختگی کی مظہر ہے۔ آج دوپہر جناب مقبول جہانگیر نے شدید اصرار کیا تھا کہ جو بھی اور جیسا بھی لکھا جا سکے لکھ بھیجوں۔ اب اور ہمت نہیں۔ دوبارہ اپنا ہی لکھا ہوا پڑھا نہیں جا رہا۔

کھوتی ہر سطر میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ اپنے آغازِ شاعری کا مطلع لکھ کر مقطع بننے پر مجبور ہوں۔ ؎

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں
مسافر ہے تلاشِ کارواں میں

وضع داری کا نمونہ

راذق الخیری

قصرِ اُردو کا ایک اور ستون گر گیا اور مولوی نذیر احمد کے پوتے مولوی شاہد احمد کے پیکرِ خاکی کو اُن کے عزیزوں اور اُردو کے خادموں نے سینکڑوں من مٹّی کے نیچے خُدا کے سپرد کر دیا۔

شاہد احمد اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور اُن کا رسالہ ساقی ایک تحریک ایک ادارہ۔ ۶۷ سال پہلے شیخ عبدالقادر مرحوم نے لاہور سے مخزن جاری کیا تو اُردو کو عظیم المرتبت بے مثل اور بے نظیر کئی مصنّفین دیے تیس سال بعد شاہد احمد نے دِلّی سے ساقی جاری کر کے اہلِ قلم کی اتنی بڑی جماعت پیدا کر دی کہ اُردو کا کوئی دُوسرا رسالہ پیدا نہ کر سکا۔

شاہد احمد اُردو کے مایۂ ناز ادیب اور پاکستان بھر میں علمِ موسیقی کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اُن کے اِرد گِرد دِلّی اور کراچی میں لکھنے والوں یا موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں کا جمگھٹا رات گئے تک رہتا تھا۔ متعدّد مصنّفین کی شہرت میں شاہد احمد

دہلوی کا ہاتھ تھا۔ ساقی بک ڈپو نے بڑی اچھی اچھی درجنوں کتابیں شائع کی تھیں، مگر ہجرت نے سب کس بل نکال دیے اور حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ساقی بک ڈپو کراچی آکر بالکل ختم ہو گیا اور ساقی کی اشاعت ایک چوتھائی بھی نہ رہی۔ پچھلے بیس سال سے ساقی مسلسل مالی نقصان اُٹھا رہا تھا، لیکن شاہد احمد کے دل میں اُردو کا جو درد اور ادب کی جو لگن تھی وہ ایسی نہ تھی کہ حالات سے پٹخنیاں کھانے کے بعد حوصلہ پست ہو جاتا۔

دِلّی میں وہ خوش حال تھے۔ جائداد کا کرایہ تھا، بک ڈپو کی آمدنی تھی۔ کراچی آکر دونوں جاتی رہیں۔ ادبی رسالوں پر پیغمبری وقت آ گیا۔ اُن کی ادبی خدمات کی قدر نہ کی گئی۔ اگر وہ گانے بجانے کے فن میں ماہر نہ ہوتے اور ریڈیو اُن کے علم موسیقی کی قدر نہ کرتا تو خود کہا کرتے تھے فاقوں کی نوبت آ جاتی۔

وہ ادارۂ مصنّفین اُردو، کُل پاکستان انجمن ادبی رسائل، پاک میوزک اکیڈمی وغیرہ کے بانیوں میں سے تھے۔ ادبی محفلوں میں، جو اب بغیر اُن کے سُونی ہیں، اُن کی شرکت سے جان پڑ جاتی تھی۔ اُنھوں نے پاکستان سے باہر جا کر بھی اپنے مُلک کا نام روشن کرنے میں حصّہ لیا تھا۔ خُدا نے انہیں محبت بھرا دل دیا تھا۔ مشرقی تہذیب، اسلامی شرافت اور دِلّی کی وضع داری کا نمونہ تھے۔ تحریر کی طرح اُن کی طبیعت میں بھی تصنّع نہ تھا۔ انتہائی سادگی پسند تھے اور خلوص کی سچے دل سے قدر کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے مضامین میں ادبی شخصیتوں کے جو خاکے لکھے اور دِلّی کی معاشرت، تمدّن اور تہذیب کے جو نقشے کھینچے ہیں اُردو ادب میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

اُن کا طرزِ بیان دِلآویز تھا۔ وہ دِلّی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے۔ اُن کی پہلی

شادی ۱۶-۱۷سال کی عمر میں ہوئی تھی اُن کی پہلی بیوی طویل علالت کے بعد گزر گئیں تو بیوی کی موت کھنی کی چوٹ نہ نکلی بلکہ اس صدمے نے اُن کی جان پر بنا دی تھی - اس لحاظ سے وہ بڑے خوش نصیب تھے کہ ان کی دُوسری بیوی نہایت شریف اور نیک نکلیں - شوہر کے بچوّں کو اپنے پیٹ کی اولاد سمجھا اور ایک طرف شفیق ماں ثابت ہوئیں تو دوسری طرف خدمت گزار اور غمگسار صحیح معنوں میں رفیقۂ حیات - پھر ساری سسرال میں اُن کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر کہنا پڑتا تھا کہ لا ہیئے سجنوں کی بیٹیاں جو رکھیں پنچوں کی لاج — گھریلو سُکون کی بدولت ہی شاہد احمد ادب کی خدمت میں آخر وقت تک منہمک رہے - اُن کی صحت ڈیڑھ سال سے خراب تھی - ایک ٹانگ کی کسی رگ میں خُون رُک جاتا تھا - پہلے ایک فٹ لمبے اور کئی انچ گہرے آپریشن کی سخت تکلیف اُٹھائی - پھر ۳-۴ بچوّں کی ماں جوان بیٹی داغِ مفارقت دے گئی -

چند ماہ گزرے تھے کہ دل میں درد ہوا - کئی ہفتے ہسپتال میں رہے اور تین ماہ بعد پھر درد اُٹھا تو جان لے کر گیا ع

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

افسوس، آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند -

مولوی شاہد احمد دہلوی

میاں ایم۔ اسلم

۱۹۳۰ء کے لگ بھگ کا زمانہ تھا جب مولوی شاہد احمد صاحب دہلوی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ میری اُن کی شناسائی ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ مَیں افسانے لکھتا تھا اور وہ اُردو زبان کے مشہور ادبی ماہنامہ "ساقی" کے ایڈیٹر تھے۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ گو مجھے ایک عرصہ تک تو ان کی زیارت نصیب نہ ہو سکی، لیکن مَیں دیکھ رہا تھا کہ اُن کا سلوک مجھ سے مربیانہ تھا۔ اگر میں یہ نہ کہوں کہ ایم اسلم کو ہندوستان کی ادب نواز دُنیا سے متعارف کرانے کا سہرا صرف مولوی شاہد احمد صاحب کے سر تھا تو شاید یہ حق ناشناسی ہو گی۔ گو عمر میں مَیں اُن سے کافی بڑا ہوں، لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے فخر اور خوشی محسوس ہوتی ہے کہ آج سے چھتیس سال پیشتر انہوں نے میرے متعلق جو مربیانہ روش اختیار کی تھی، اس میں کبھی فرق نہیں آیا۔

مولوی شاہد احمد صاحب دہلی کے ایک عظیم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ عظیم میں نے اس لیے کہا کہ اِس خاندان کے مورثِ اعلیٰ جناب شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مولوی

شاہد احمد کے دادا تھے۔ ان کا شمار ملّت کے معماروں میں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ قدرت کو جب کسی خاندان کو شہرتِ دوام دینی ہوتی ہے تو اس خاندان میں کوئی عظیم انسان پیدا کر دیتا ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے شاہد صاحب اپنے دادا کے بعد اس قابل ہیں کہ ہم انہیں ایک عظیم انسان سمجھیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ ایک بہت بڑے اہلِ قلم تھے یا ایک قابلِ قدر مترجم تھے یا انہیں زبان پر بے پناہ عبور تھا یا ایک نامور موسیقار تھے بلکہ اس لیے کہ اُن کی ذاتِ گرامی میں ان کے معزز اور نامور خاندان کی سب خصوصیات کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

انہوں نے بڑی خوبی سے اپنی خاندانی روایات، نام اور وقار کو زمانے کے زشت و خوب حالات میں برقرار رکھا۔ جناب شاہد احمد میں علاوہ اور خوبیوں اور اوصاف کے ایک ایسا وصف بھی تھا جس کا اس زمانے میں چلن کچھ کم ہی نظر آتا ہے۔ یہ اُن کا رکھ رکھاؤ تھا۔ جن لوگوں سے اُن کی یاد اللہ تھی وہ انہیں یاد کرتے یا نہ کرتے لیکن شاہد صاحب کو جب موقع ملتا ان کی خیر و عافیت ضرور معلوم کیا کرتے۔

میں نے انہیں اُس زمانے میں بھی دیکھا تھا جب دولت اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ اور اُس وقت بھی دیکھا ہے جب مُلک کی تقسیم کے بعد وہ بڑی پریشانی کے عالم میں وطن سے بے وطن ہو کر صرف اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان اور آبرو بچا کر لاہور تشریف لائے تھے اور میرے غریب خانہ پر قیام فرما کر میری عزت افزائی فرمائی تھی، لیکن اس بے سر و سامانی، تفکّرات اور پریشانی کے باوجود اُن کے چہرے پر ایک بشاشت سی نظر آتی تھی اور اُن کی وضعداری اور بلند حوصلگی کی یہ حد ہے کہ سخت پریشانی ہونے کے باوجود انہوں نے کسی کو اپنی ذہنی کوفت کا احساس تک نہیں ہونے دیا اور ملنے والوں پر اپنے قول و فعل سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی ایک عظیم متوکّل اور راضی بر رضا رہنے

والے پکّے مسلمان ہیں۔ ہاں کچھ عرصہ بعد جب انہیں اطمینان کا سانس لینا نصیب ہُوا تو انہوں نے "دِلّی کی بِپتا" لکھ کر، جو ہر دردمند کو خون کے آنسو رلائے گی، دل کی کچھ بھڑاس نکال لی۔ جہاں تک مروّت، شرافت، ملنساری، رواداری، مہمان نوازی، دوست نوازی، سیر چشمی، اخلاق، کردار اور ایثار کا تعلق ہے۔ بظاہر تو یہ اوصاف ایک واحد شخص کی ذات میں نظر آنے کچھ مشکل ہی ہیں، لیکن مَیں نے گزشتہ چھتّیس سال کے عرصہ میں اگر یہ اوصاف کسی میں دیکھے ہیں تو وہ جناب شاہد احمد صاحب تھے جنہیں آج مرحوم کہتے ہوئے دل پر چرکا لگتا ہے۔

مولوی شاہد احمد صاحب نے اپنی زندگی اُردو اور موسیقی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ جہاں تک اُردو کا تعلّق ہے کیا ترجمہ اور کیا طبع زاد اُن کے قلم کا لوہا سبھی مانتے تھے۔ وہ محاورہ کے استعمال میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے نوآموزوں کو لکھنا سکھایا اور بیسیوں ادیب بنائے۔ گیسوئے اُردو کو سنوارنے میں انہوں نے ایک خاص لگن اور عرق ریزی اور محنت سے کام لیا تھا۔

گو یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ایک مشہور خانوادہ علم وادب سے وابستہ ہونے اور اپنی خاندانی روایات کے خلاف وہ موسیقی سے نہ صرف لگاؤ رکھتے تھے بلکہ اس فن میں بھی انہوں نے اپنے لیے ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ وہ لوگ جو موسیقی یا گائیکی کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ فن ان کے ہی سینوں میں مستور رہے۔ اس کے عروج کا زمانہ ختم ہو چکا ہے لیکن جب کوئی علم وادب کا رسیا اس فن کو اپنانے کا تہیّہ کرے تو اس سے اُمید ہو سکتی ہے کہ شاید کبھی وہ وقت بھی آجائے کہ یہ فن عام فہم کتاب کی شکل میں محفوظ ہو جائے۔ مولوی شاہد احمد نے یہ فن حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت، بڑی مشقت اُٹھائی تھی۔ انہوں نے اس کی تکمیل کے لیے جاڑے اور جوانی کی

راتوں کی نیند اپنے پر حرام کر رکھی تھی۔ شاہد صاحب کا موسیقی سے لگاؤ اِس لیے نہیں تھا کہ اُن کا شمار اس فن کے استادوں میں ہو بلکہ اُن کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اسے اپنے زورِ قلم سے اِس طرح محفوظ کر دیں جس سے آنیوالی نسلوں کو بھی فائدہ پہنچے اور وہ اس کے رازو رموز سے آگاہ ہو سکیں۔

یہ اُن کی شرافت اور وضعداری کی حد تھی کہ انہوں نے میری موجودگی میں باوجود دوسروں کے اصرار سے طنبورہ کو کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔

اُن کی سیر چشمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار شوکت تھانوی نے کوئی کتاب لکھ دینے کے لیے کتاب کا معاوضہ اُن سے پیشگی وصول کر لیا تھا لیکن کتاب لکھ کر دینے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ ادھر شاہد صاحب کی غیرت کو یہ کبھی گوارا نہ ہوا کہ رقم کی واپسی کا مطالبہ کریں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم سے بھی جناب شاہد صاحب کے بہت گہرے مراسم تھے۔ مرزا صاحب جو کتاب بھی لکھتے شاہد صاحب اس کے جملہ حقوق نقد رقم ادا کر کے خرید لیتے۔ مرزا صاحب جودھ پور میں تھے اور بہت بیمار تھے۔ شاہد صاحب دِلّی سے چل کر اُن کی عیادت کو جودھ پور گئے۔ مرزا صاحب کی مالی حالت کچھ ایسی اطمینان بخش نہ تھی اپنے دوست کی پریشانی سے متاثر ہو کر شاہد صاحب نے جو فیاضانہ سلوک اُن سے کیا اِس کی مثال ملنی آسان نہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے انتقال کے بعد بے مہر زمانے نے اُن کی بیگم صاحبہ کو بھی بہت پریشان کیا۔ اس موقع پر شاہد صاحب نے نہ صرف اُن کی مالی امداد ہی کی بلکہ اُن کے شوہر مرزا صاحب کی وہ تمام کتابیں جن کے دائمی حقوق وہ ان سے خرید چکے تھے اور نقد رقم ادا کر چکے تھے، وہ سب انہیں واپس کر دیں۔ شاہد صاحب دوستوں کو دینا تو جانتے تھے اور وقت پر دست گیری بھی کرتے، لیکن روپیہ واپس لینے یا احسان جتانا انہیں

کبھی گوارا نہ ہوتا۔ شاہد صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ سب کی کڑوی کسیلی سنتے اور خاموش رہتے لیکن اگر کوئی سفلہ پرور اُن کی ذاتی یا خاندانی وجاہت پر حرف گیری کرتا تو اُن کا قلم بھی حرکت میں آجاتا اور وہ اپنے مخصوص ادیبانہ رنگ میں زبان درازی کچھ ایسی کندی کرتے کہ شاید مخالف کا کسی وقت ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہو تو غلط نہ ہوگا۔

مدت کی بات ہے لاہور کے کسی کالج کے ایک پروفیسر لالہ کنہیا لال کپور ایم اے کو جو اچھے مزاح نگار مانے جاتے ہیں، نجانے کیا سوجھی کہ انہوں نے جناب ڈپٹی نذیر احمد خاں کی شان میں کچھ خلافِ تہذیب لکھ دیا۔ شاہد صاحب نے اپنے دادا جان کی شان میں یہ گستاخی دیکھ کر بہت بُرا مانا اور اکثر اہلِ قلم نے بھی بڑی بیزاری کا اظہار کیا۔ مولوی شاہد احمد صاحب نے جواب میں قلم اُٹھایا اور کپور صاحب کے وہ لتے لیے کہ انہیں کانوں کو ہاتھ لگانا پڑا۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ شاہد صاحب نے انتہائی غصہ کی حالت میں بھی شرافت اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا، لیکن کپور صاحب کو "اچھور" بنا دیا۔

لالہ ہری چند اختر ایم اے آنجہانی ایک اچھے شاعر اور ہنس مکھ سے آدمی تھے، لیکن ان کے ظاہر اور باطن میں بڑا فرق تھا۔ اُن کے ہاں دوستی کے پردے میں چوٹ کرنے کا رواج تھا۔ مسلمان دوستوں سے زیادہ میل ملاپ تھا۔ ہری چند اختر صاحب نے بقول "آ بیل مجھے مار" بیٹھے بٹھائے یو۔پی اور پنجاب کا جھگڑا کھڑا کر دیا، لیکن در اصل مولوی شاہد احمد سے ادبی ٹکر لینا تھا۔ اختر صاحب کی ٹولی میں کچھ ایسے گندم نما جَو فروش مسلمان ادیب اور شاعر بھی شامل تھے جو بظاہر شاہد صاحب کا بڑا احترام کرتے لیکن پس چلمن خبثِ باطن کی نمائش بھی کرتے رہتے۔ دونوں جانب سے شمشیر قلم کے وار بڑے زور سے ہوتے تھے، لیکن اس چنڈال چوکڑی کے مقابلہ میں شاہد صاحب نے اپنے حلقہ میں سے کسی اور کو اس قلمی جنگ میں شریک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چومکھیا لڑتے تھے۔ اُن کی شمشیر قلم

کی کاٹ اکثر جگر تک اُتر جایا کرتی تھی۔ کچھ روز بعد مخالف گروہ کی طرف سے اس قلمی لڑائی کا رنگ سوقیانہ ہوگیا اور فریقِ مخالف ذاتیات پر اُتر آیا اب تہذیب اور بدتہذیبی کی جنگ تھی۔ جہاں تک ذاتیات کا تعلق تھا "اختر اینڈ کو" میں سے اکثر کا دامن داغدار تھا اور شاہد صاحب کے پاس ثبوت تھا، لیکن وہ ایک شریف بلند کردار کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے قلم کو سوقیانہ پن سے ہمیشہ بچا کر رکھا۔ آخر ایک دو دوستوں کی کوشش سے اختر صاحب نے یہ قلمی جنگ بند کردی۔ دوسرے الفاظ میں ہار مان لی۔

مولوی شاہد احمد بات کے دھنی اور عزم کے پکّے تھے جو کام شروع کرتے کبھی ادھورا نہ چھوڑتے۔ ترجمہ کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ مولوی عنایت اللہ صاحب کے بعد ترجمہ کرنے کے فن میں شاہد صاحب نے جو شہرت حاصل کی ہے وہ کسے معلوم نہیں۔ اُن کی مستقل مزاجی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے گزشتہ چالیس سال سے ساقی جاری کر رکھا تھا۔ اس طویل مدت میں کئی رسالے زمانے کی ناقدری کی نذر ہوگئے۔ ساقی روزِ اوّل سے جس شان سے میدانِ ادب میں اُترا تھا آج بھی اس کی وہی شان ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد مہاجرین پر جو تباہی آئی وہ بڑی عبرت ناک ہے۔ پاکستان آکر کئی خاک سے اُٹھ کر آسمان پر جا پہنچے اور کئی اپنے ہتھکنڈوں سے خاک سے سونا بن گئے، لیکن مولوی شاہد احمد کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ گو وہ دِلّی میں لاکھوں کی جائداد چھوڑ کر آئے، لیکن پاکستان آکر کچھ حاصل کرنے کے لیے کبھی کسی کے آگے ہاتھ پسارنا گوارا نہ کیا۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے ؎

بقا بعد مُردن اگر ہے تو یہ ہے
زمانے میں رہنا تو مشہور رہنا

مجموعۂ کمالات

صہبا لکھنوی

۶ر جون ۱۹۶۷ء کو پاکستان رائٹرز گلڈ کراچی ریجن کے زیر اہتمام تھیوسوفیکل ہال میں شاہد احمد دہلوی کی یاد میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ صدارت کے فرائض کرنل مجید ملک نے انجام دیے تھے۔ صہبا لکھنوی مدیر افکار نے ذیل کی تقریر اسی جلسے میں کی تھی۔

صدر محترم، ساتھیو اور بزرگو!

شاہد احمد دہلوی کی یاد میں یہ پہلا تعزیتی جلسہ ہے۔ اُن کے عزیز دوست عقیدت مند، ساتھی آج اور ہمیشہ شاہد بھائی کی ناوقت موت پر اپنے دِلی رنج و غم کا اظہار کرتے رہیں گے۔ اس دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ مرنے والا مر جاتا ہے اور اپنی یاد میں سوگواروں کا ہجوم چھوڑ جاتا ہے۔

شاہد بھائی، جیسا کہ سب جانتے ہیں، بڑی پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔

اُنہوں نے خاندانی وقار، وضع داری اور مشکل حالات میں صبر و استقامت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ ہمیشہ ایک ہی روش اور ایک ہی اصولِ حیات کے پابند رہے۔ جس سے دوستی کی، زندگی بھر نباہی۔ جس کی مخالفت کی، کھُل کر کی، لیکن اس کے باوجود وہ نہ کینہ پرور تھے، نہ حاسد۔ اُنہوں نے کبھی دوُرخی اختیار نہیں کی اور اُن کی زندگی کا یہ رُخ کسی سے ڈھکا چُھپا نہیں۔ اس دَور میں کتنے ادیب اور فن کار ہیں جو زندگی کی سچّائی کو، زِندگی کی صداقت کو اور زندگی کی ہمہ جہت ذمہ داریوں کو عزم و حوصلے کے ساتھ نباہنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں!

شاہد احمد دِلّی کے مشہور خانوادہ سے تعلّق رکھتے تھے علم و فضل اُنہیں ورثے میں ملا تھا۔ دِلّی کی ٹکسالی زبان میں اُنہیں جو یدِطولیٰ حاصل تھا، اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس تعزیتی تقریب میں ظاہر ہے اُن کے ادبی کارناموں، فنّی محاسن اور منفرد خصوصیات کا احاطہ ممکن نہیں۔ پھر بھی اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُن کی ذات مجموعۂ کمالات تھی۔ ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی اُنہیں گہری وابستگی تھی اور اس فن پر اُنہیں جو عملی اور علمی دسترس حاصل تھی اُس سے اہلِ نظر خوب واقف ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شاہد بھائی کے نہ ہونے سے اب علم و فن کی محفلیں اُجڑ کر رہ گئی ہیں۔

شاہد بھائی سے میری مُلاقات ۱۹۵۲ء کے آخر میں کراچی میں ہوئی تھی۔ مولانا رازق الخیری نے انجمن ادبی رسائل پاکستان کی بنیاد ڈالی تو شاہد بھائی اس کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور مَیں آفس سیکرٹری —— سات سال تک شاہد بھائی کا اور میرا ساتھ رہا اور مجھے اُن کو قریب سے دیکھنے اور اُن کی زندگی اور شخصیت کا مطالعہ کرنے کا کافی موقع ملا۔ میں پُورے وثوق سے یہ

بات کہہ سکتا ہوں کہ شاہد بھائی نے ادبی رسائل کو ابتر حالات اور چند در چند مشکلات سے نجات دلانے کے لیے مقدور بھر کوشش کی اور مَیں ہر قدم پر اُن کی رہنمائی میں اُن کے دوش بدوش جدّوجہد کرتا رہا، لیکن افسوس کہ ہماری پُرخلوص سعی وجہد کے باوجود آج تک ادبی رسائل کی بہتری کے امکانات پیدا نہ ہو سکے اور شاہد بھائی "ساقی" کو بے یار و مددگار چھوڑ کر ہم سے جُدا ہو گئے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ شاہد بھائی کی طرح میرا اور دوسرے ادبی رسائل کے مدیروں کا بھی یہی حشر ہونا ہے۔ جس معاشرے میں ادیب کی قدر نہ ہو، ادب سے برائے نام دِلچسپی ہو، ادبی رسائل کی ضرورت و اہمیت کا احساس نہ ہو، مدیران رسائل کی عظمت کا اعتراف اُن کے مرنے کے بعد ممکن ہو اور جہاں ادب و فن کے تحفظ کا کوئی انتظام نہ ہو، اُس معاشرے سے آپ توقع بھی کیا کر سکتے ہیں!

شاہد بھائی کے چاہنے والوں کا بہت بڑا حلقہ ہے۔ مَیں بھی اُن کا ایک ادنیٰ عقیدت مند ہوں اور اس موقع پر صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ دوستو! تعزیتی جلسے، قرار دادیں، عظمت کا اعتراف —— یقیناً ہماری دیرینہ روایت ہے۔ اسے ضرور برقرار رکھو، لیکن خدارا کچھ ایسا انتظام بھی کرو کہ "ساقی" کی طرح عصمت، نیرنگِ خیال، ادبی دُنیا، افکار اور دوسرے ادبی رسائل اُن کے مدیروں کے ساتھ ہی دَم نہ توڑ دیں۔ یہ ادبی رسالے اگر آپ کی دانست میں زبان و ادب کے واقعی خدمت گزار ہیں تو اُنہیں زندہ رکھنے کے اسباب بھی فراہم کر دیجیے تاکہ ادب کی شمعیں فروزاں رہیں۔ جو حضرات اپنا خون جلا کر، رات دن مصیبتیں جھیل کر آپ کے ذوقِ مطالعہ کے لیے ادبی رسالے نکالتے ہیں، ذرا اُن کے حالات و مسائل کا بھی جائزہ لینے کی زحمت گوارا کیجیے اور اُن کو زندہ رکھنے کی اگر کوئی سبیل نکل سکے

تو اُس سے دریغ نہ کیجیے !

آخر میں میری یہ تجویز ہے کہ شاہد بھائی کی زندہ یادگار "ساقی" کو ہر قیمت پر جاری رکھا جائے اور اس کے لیے پاکستان رائٹرز گلڈ کی نگرانی میں شاہد میموریل کمیٹی قائم کی جائے جو "ساقی" کے لیے اور اُن کے متعلقین کی کفالت کے لیے سرمایہ فراہم کرے اور جلد سے جلد "ساقی" کا "شاہد احمد دہلوی نمبر" شائع کرے۔ اس سلسلے میں میری خدمات رضاکارانہ طور پر حاضر ہیں۔ یہ صرف ایک تجویز ہے اور بس۔ ہم گزشتہ ۲۰ سال سے تجویزیں پیش کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لیے اربابِ فکر و نظر اس تجویز پر بھی غور فرما لیں تو مناسب ہوگا۔

مخلص دوست

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

شاہد احمد دہلوی سرسید کے گروہ کے ایک نہایت نامور فاضل کے پوتے اور ایک نہایت ہی نیک نفس بزرگ کے فرزند تھے۔ تصنیف و تالیف کی لیاقت اور نیکی و شرافت اُن کو دادا اور باپ سے ورثے میں ملی تھی، لیکن موسیقی کا ذوق اُن کی اپنی ذاتی کوشش کا رہینِ منّت تھا جس میں اُنھوں نے پُوری دلچسپی کے ساتھ پُورا حصّہ لیا۔ وہ نمونہ تھے دہلی کی وضع داری اور قدیم مشرقی روایات کا —— نہایت بااخلاق، نہایت متواضع، نہایت منکسر المزاج اور بہت محبّت سے ملنے والے —— مروّت اور اخلاق کے پُتلے، مگر نفاق اور دکھاوے سے نفور۔ اُن کا ظاہر اور باطن یکساں اور اُن کا قول اور عمل ایک جیسا تھا۔ دوستوں کے نہایت ہمدرد اور دُشمنوں کے کھُلے دُشمن تھے۔ لگی لپٹی رکھے بغیر حق بات کہنے میں دلیر اور خوشامد اور چاپلوسی سے کوسوں دُور تھے۔ لالچ اور طمع اُن کو چھُو بھی نہیں گئی تھی۔ قناعت اور استغنا گویا اُن کی گھُٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ تکلیف کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے اور کبھی حرفِ

شکایت زبان پر نہ لاتے۔ عالی حوصلگی اور سیر چشمی اُن کی مخصوص صفات تھیں۔ احباب نے ہمیشہ اُنہیں اپنا مخلص دوست سمجھا۔ دشمنوں نے ہمیشہ اُن کی حق گوئی کی تعریف کی۔ ضرورت مند کی حاجت روائی اور مشکل میں پھنسے ہوئے کی مشکل کشائی ہمیشہ انہوں نے بڑی فراخ حوصلگی سے کی۔ نہ کبھی احسان کر کے جتایا نہ کبھی کسی کا احسان لینا گوارا کیا۔ ہر تنگی و ترشی، نرم و سخت، خوشی و غمی، عسرت و عشرت کی حالت کو کمال صبر و ضبط اور امن و سکون کے ساتھ گزارا۔ نہ کبھی آسمان کا گلہ کیا نہ کبھی قسمت کا شکوہ کیا۔ جس بات کو سچ سمجھا علی الاعلان اُسے ظاہر کیا۔ جسے جھوٹ جانا اُسے برملا کہا۔ جو کچھ دل میں تھا وہی زبان سے کہا اور جو کچھ زبان سے کہا وہی دل میں سمجھا۔ بڑوں کی آن کو ہمیشہ قائم رکھا اور عزتِ نفس کا ہمیشہ لحاظ کیا۔ یہ تھے شاہد احمد دہلوی جن کی یاد مجھے ہمیشہ رہے گی۔ اُن کے انتقال کو اگرچہ کافی عرصہ گزر چکا ہے، مگر اب بھی یہ حالت ہے کہ تیسرے چوتھے جب بھی محبی و مشفقی حاجی سیّد اشرف صبوحی کے ہاں جاتا ہوں تو ہمیشہ ہی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے یہ خیال آتا ہے کہ اب شاہد صاحب سے ملاقات ہوگی (شاہد صاحب جب کبھی کراچی سے لاہور آیا کرتے تھے تو حاجی صاحب ہی کے ہاں ٹھہرا کرتے تھے) مگر فوراً ہی یہ خیال آ کر دل مغموم ہو جاتا ہے کہ شاہد صاحب کہاں؟ وہ تو منوں مٹّی کے نیچے پڑے آرام کر رہے ہیں اور اب تو حشر ہی میں اُٹھیں گے۔ افسوس ؏

مِٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

شاہد صاحب مر گئے اور ہم میں سے ہر شخص کو مرنا ہے، مگر مرحوم اپنی بے پایاں محبّت اور اپنے فراواں اخلاص کے جو گہرے نقوش اپنے ملنے والوں کے دلوں پر چھوڑ گئے ہیں وہ کبھی محو نہیں ہوں گے، بلکہ جُوں جُوں زمانہ گزرتا جائے گا وہ

نقوش نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ نقش اور منقوش دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ابتدا میں خدا تھا اور انتہا میں بھی خدا ہی رہے گا۔ باقی سب کچھ ایک نہ ایک دن فنا کی لپیٹ میں آکر رہے گا۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَام۔ غم صرف آگے پیچھے کا ہوتا ہے۔ باقی سب کو جانا ایک ہی راہ سے ہے اور موت کے زبردست چُنگل سے بچ کوئی بھی نہیں سکتا۔ صرف انسان کی نیکیاں باقی رہتی ہیں جو اُس کے نام کو زندہ رکھتی ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ جن کا نام عزت کے ساتھ دُنیا میں زندہ رہے۔ اکبر نے کتنا سچ کہا ہے

دُعا ہے کہ مر کر بھی رہ جاؤں کچھ
وگرنہ یُوں ہی مر کے رہ جاؤں گا

کھرا آدمی

خواجہ محمد شفیع دہلوی

۷۸۶

محترم ومکرم۔ سلام مسنون۔

کرم نامہ مورخہ ۶/۳/۶۸ شرف بخش ہوا۔ نہ دماغ حاضر نہ دل قابو میں۔ بہرنوع جناب کا حکم اور شاہد مرحوم کے سلسلے میں۔ کس طرح تعمیل نہ کرتا۔ چند سطور حاضرِ خدمت ہیں بہ نذرانہ۔ ع

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

احقر۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

جو آیا ہے اُسے جانا ہے۔

دُنیا سرائے فانی ہے اور آنی جانی ہے۔ آج شاہد میاں ہم میں نہیں۔ کل راقم الحروف آپ میں نہ ہوگا تاہم ؂

ہیں زندہ ہم کہ بنے رُوشناس خلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

بعض افراد کی زندگی اُن کی ملّت کے لیے وجۂ ننگ بن جاتی ہے اور بعض کی وجۂ افتخار۔ شاہد مرحوم کی حیات ہمارے لیے وجۂ فخر تھی اور رہے گی۔ ہم ایک ہی شہر میں پیدا ہوئے۔ پلے اور بڑھے۔ جوانی میں شاہد جوانِ صالح تھے۔ بڑھاپے میں باوقار اور خوددار۔

تقسیمِ ہند کی آگ نے بہت سوں کے کردار واضح کر دیے۔ یہ آگ تھی جس نے کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا۔ کُندن نے اپنا رنگ دکھا دیا۔ تانبے نے اپنی حقیقت ظاہر کر دی۔ شاہد اُن چند افراد میں سے تھا جن کو حالات کا دستِ گراں بار توڑ سکا، موڑ نہ سکا ع

خُدا بخشے بہت سی خُوبیاں تھیں مرنے والے میں